FICTION HOUSE

کچھ شامیں

فکرِ اقبال

کے ساتھ

سیّد نصیر شاہ

اشاعت دوم
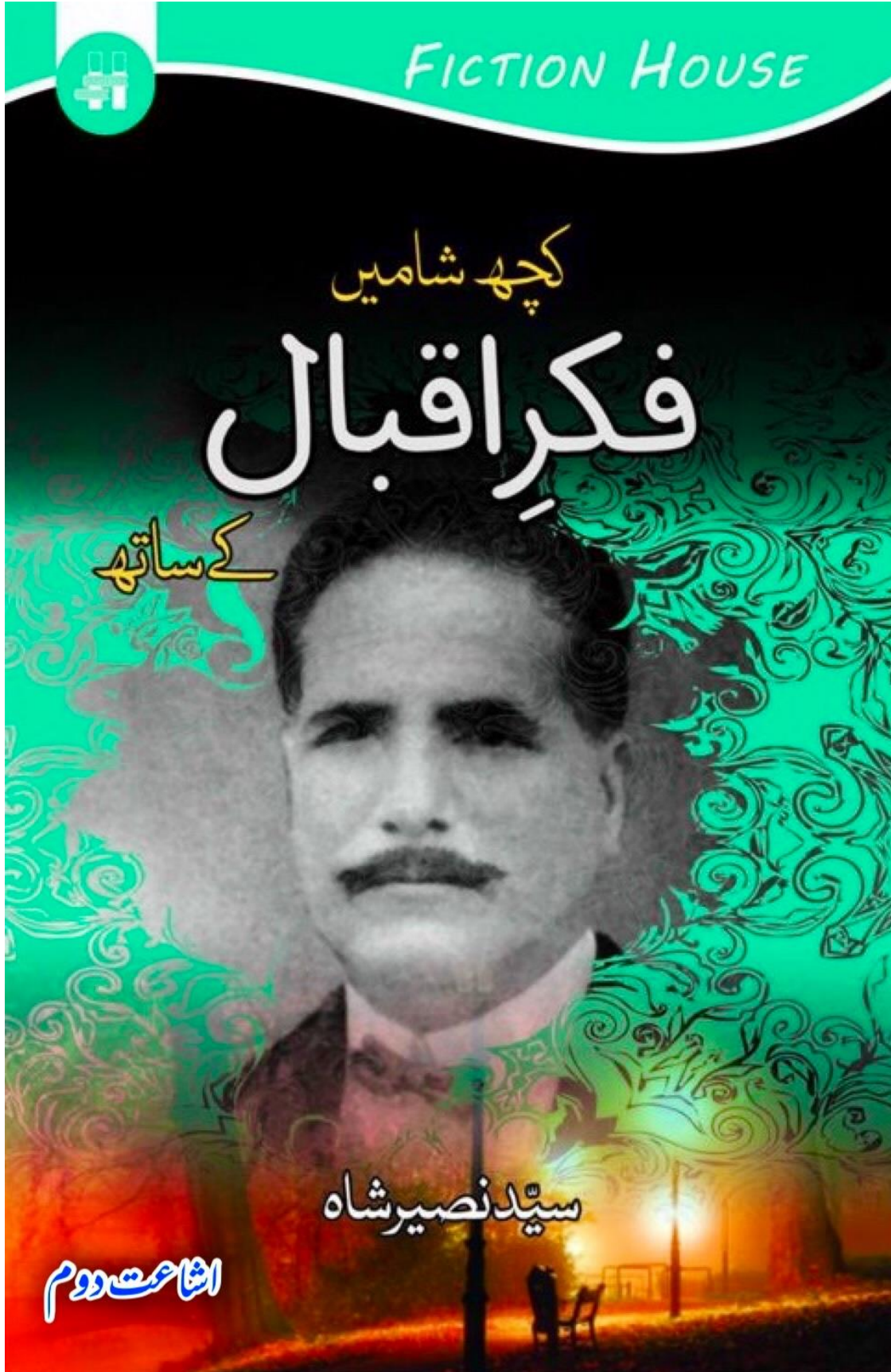
کچھ شامیں فکرِ اقبال کے ساتھ

سید نصیر شاہ

اشاعت اوّل

کچھ شامیں فکرِ اقبال کے ساتھ

سید نصیر شاہ

نیا زمانہ پبلیکیشنز

کچھ شامیں فکرِ اقبال کے ساتھ

سید نصیر شاہ

2011

محمد شعیب عادل نے

نوید حفیظ پرنٹرز سے چھپوا کر

نیازمانہ پبلیکیشنز،

14 بی، ٹیمپل روڈ، لاہور سے شائع کی

ماہنامہ نیازمانہ، 14 بی ٹمپل روڈ، لاہور، فون 042 35065015

Email:niazamana@yahoo.com, www.niazamana.com

قیمت —— 350 روپے

فہرست

انتساب

ظفر محمود چانڈیو

ڈپٹی ڈائریکٹر نیشنل ہائی وے (مقیم رحیم یار خان)

کے نام

پیش رس

سید نصیر شاہ ایک بے مثال محقق ہیں انہیں انگریزی' عربی' فارسی جیسی غیر ملکی زبانوں پر ماہرانہ دسترس حاصل ہے تاریخ' فلسفہ' تاریخ' عمرانیات' سیاسیات' فلسفہ' مذہبیات اور ادب ان کے خاص موضوعات ہیں وہ ایک مایہ ناز سکالر ہیں اور شعر و ادب کی دنیا میں بھی ان کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ وہ میانوالی کے ہیں اور میرا تعلق رحیم یار خان' سے ہے یوں میرے اور ان کے درمیان فاصلوں کا ایک طویل صحرا حائل ہے۔ میں اور میرے احباب ماہنامہ ''نیاز مانہ'' لاہور کے مرہون احسان ہیں کہ اس کے توسط سے یہ بعد مکانی ختم ہوا اور ہم ان سے متعارف ہوئے ''نیاز مانہ'' جیسے لبرل اور روشن خیال ماہنامہ میں ان کے تحقیقی مقالات دیکھ کر ہمیں تحریک ہوئی کہ ان کے مقالات کتابی صورت میں منظر عام پر لائے جائیں زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

''کچھ شامیں اقبال کے ساتھ'' شاہ صاحب کے وہ تحقیقی مقالات ہیں جو انہوں نے علامہ اقبال کی حیات اور افکار کے باب میں تحریر کئے اگر ''حیات اور افکار'' دونوں قسم کے مقالات اکٹھے شائع کئے جاتے تو یہ ضخیم کتاب بن جاتی میں نے مناسب سمجھا کہ دونوں کو یکجا کرنے کی بجائے الگ الگ کر کے دو جلدیں کر دی جائیں۔ زیر نظر کتاب پہلی جلد ہے جس میں حیات اقبال کے مختلف گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔ یہ وہ مقالات ہیں جو ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال کی تصنیف ''زندہ رود'' کے منظر عام پر آنے کے بعد لکھے گئے ہیں ان سے آپ اندازہ کر لیں گے کہ مصنف مطالعہ اقبال کے سلسلہ میں منفرد سوچ رکھتے ہیں۔ ان کا یہی انداز ''افکار اقبال'' کے سلسلہ کے مقالات میں بھی موجود رہا ہے حالانکہ یہ مقالات بیشتر وہ ہیں جو انہوں نے نوعمری میں لکھے تھے اور بعد میں ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے

رہے ہیں۔اگلی کتاب میں اقبال کی فکری جہات پر گفتگو سامنے لائی جائے گی۔

شاہ صاحب اس سوچ کے حامل ہیں کہ کسی عظیم شخصیت کی اصل عظمت اسی میں ہے کہ اُسے اس کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھا جائے خواہ مخواہ کے مبالغہ سے پرہیز کیا جائے۔اصل میں عجمی ذہن عجوبہ پرست ہے اور خداوند تراشِ کر پرستش کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔میانوالی ہی کے ایک شاعر محمد اقبال شاہ ایڈووکیٹ نے بڑی خوبصورتی سے اس ذہنیت کی ترجمانی کی ہے۔

سیاست ،حسن اور مذہب کے تجریدی تقاضوں میں
صنم کتنے تراشوں گا خدا کتنے بناؤں گا

سید نصیر شاہ اس طرز فکر کے خلاف ہیں وہ ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو حقیقت پسندی کا درس دیتے ہیں وہ اس میں کتنے کامیاب رہے ہیں یہ کتاب پڑھ کر آپ صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔

پروفیسر ملک احمد بخش
گورنمنٹ خواجہ فرید کالج
رحیم یار خان

مطالعہ اقبال اور میں

علامہ اقبال نے شعروادب کی دنیا میں قدم رکھا تو فضاؤں پر چھاتا چلا گیا تب سے اب تک اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ہر آنے والا دن اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتا گیا میرے زمانہ طالب علمی کا آغاز تھا کہ اقبال فوت ہوگیا تاہم محسوس ہوتا تھا کہ ابھی فضاؤں میں اس کی سانسوں کی مہک اور اس کی دھڑکنوں کے زیرو بم کا آہنگ موجود ہے۔ میں نے فارسی، عربی اپنے والد صاحب سے گھر ہی میں پڑھ لی تھی والد صاحب کا طریق تعلیم اُس وقت کے عام علماء سے مختلف تھا وہ زبان سکھا اور سمجھا کر کتابیں تھما دیتے اور طالب علموں سے مطالبہ کرتے کہ کتاب کا خود مطالعہ کرو اور خود ہی اس کا اردو میں ترجمہ لکھ کر دکھاؤ۔ وہ لغت یا فرہنگ سے زیادہ مدد نہیں لینے دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیاق وسباق سے خود ہی کسی مشکل اور اجنبی لفظ کا مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے مصنف اپنا مفہوم قاری تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے کیونکہ اس کا بنیادی کام ابلاغ ہوتا ہے وہ قاری کو خواہ مخواہ الجھن میں ڈال کر اس سے ذہنی ورزش نہیں کراتا وہ اپنے جملوں کے معانی خود ہی واضح کرتا جاتا ہے ان کے اس طریق تدریس سے ایک تو صلاحیتیں بیدار ہوتیں دوسرے ترجمہ کی استعداد پیدا ہوتی جاتی۔

فارسی زبان سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ بہت آسان اور شیریں زبان ہے، اس کی گرامر ایک ذہین طالب علم ایک گھنٹہ میں سیکھ سکتا ہے ابا جان کلید مصادر ''رٹوا'' کر گرامر سکھا دیتے پھر ''نصاب ضروری'' نام کی کتاب ''رٹوا'' دیتے یہ بڑی اچھی کتاب تھی۔ اس میں بہت سے اسماء سرائیکی ترجمہ کے ساتھ آتے مثلاً ''گاؤ'' (گاں) ''زاغ'' (کاں) '' اشیاء کے نام بڑی مہارت سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ کتاب زبانی یاد کرائی جاتی اور بس فارسی قواعد ختم ہوجاتے کیونکہ زبان یہی اسم فعل اور حرف کا ملاپ ہی تو ہوتی ہے اس کے بعد سعدی کی گلستاں کے ساتھ ہمیں ''اسرار خودی'' تھمادی گئی۔ اور ہم طالب علم اپنے عہد کے شاعر اقبال تک پہنچ گئے۔ گلستاں

خوبصورت نثر و نظم کا دلچسپ مجموعہ ہے اور اسرار خودی کے اشعار کا ترجمہ ہم کر لیتے مطالب ہماری فہم کے مطابق ہمیں سمجھا دیئے گئے۔ مجھے یاد ہے ہمارے پاس اسرار خودی کا پہلا نسخہ تھا اس میں اقبالؔ کا تحریر کردہ مختصر دیباچہ بھی تھا اور حافظ شیرازی کے خلاف اشعار بھی

ہوشیار از حافظ بادہ گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

بعد میں اسی دیباچہ اور حافظ شیرازی کے خلاف اشعار پر بہت اعتراضات ہوئے اور بعد کے نسخوں میں اقبال کو یہ دونوں چیزیں حذف کرنا پڑیں۔ بہر حال یہ مطالعہ اقبالؔ کی ابتداء تھی پھر عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ اقبال میں وسعت آتی گئی۔ والد صاحب کے بعد میرے دوسرے مشفق استاد میرے خالہ زاد بھائی حضرت علامہ میاں اصغر علی شاہ تھے انہوں نے اقبالؔ کی زندگی میں ہی اُسے پڑھنا شروع کیا تھا اور اُسے مسلسل پڑھتے آئے تھے۔ وہ بھی اقبالؔ کے مطالعہ کے سلسلہ میں میرے معاون و مددگار رہے۔ میاں صاحب مرحوم نے ہی میانوالی میں ''بزم رمز شناسان اقبالؔ'' کی بنیاد رکھی اسے ''بزم قلندران اقبالؔ'' بھی کہا جانے لگا تھا اس کے مستقل ارکان تھے میاں اصغر علی شاہ، کندیاں کے مولانا عبدالحکیم سرمد مظاہری، مولانا علی محمد مظاہری، حافظ سلطان محمود، ماسٹر محمد یوسف، کامریڈ عبدالکریم قریشی، محمد امیر قریشی یہ سینیئر لوگ تھے اور جونیئر لوگوں میں رفیع اللہ شہاب اور ہم دونوں بھائی سید محمد مسعود شاہ اور سید نصیر شاہ، اس کے ہفتہ وار اجتماعات ہر جمعہ کو ہوتے ان اجتماعات میں افکار اقبالؔ پر بحث ہوتی۔ میاں صاحب بالعموم ''پیام مشرق'' کی کوئی نظم یا ''جاوید نامہ'' سے کچھ پڑھ کے اس کی تشریح و تبیین کرتے میں اقبالؔ کے سلسلہ میں کسی موضوع پر مقالہ پڑھتا، اس بزم کی عمر تھوڑی تھی جلد ہی ہم لوگ بکھر گئے بعد میں میں وسعت مطالعہ کے ساتھ ان مقالات میں ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کرتا رہا ان میں سے کچھ بعض رسالوں میں اشاعت پذیر بھی ہوئے۔ ان میں بھی کچھ ترمیم کے بعد اب ان مقالات کو کتابی صورت دے رہا ہوں۔

اقبالؔ بلاشبہ ایک وسیع و عمیق سمندر ہے وہ وہی کچھ نہیں جو اردو، فارسی شاعری میں آ گیا ہے اس کے آگے بھی بہت کچھ ہے اس نے اردو اور انگریزی نثر میں بھی بہت کچھ کہا ہے اس کے خطوط بھی اس کی فکر کی تفہیم میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں پھر یہ بھی کہ وہ جامع حیثیات شخص ہے اس نے ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں بسر کی ہیں وہ ایک اچھا شاعر، اچھا نثر نگار بھی ہے انگریزی، فارسی، اردو اور کسی

حد تک عربی ادب پر بھی اس کی گہری نظر ہے اس لئے ادب کے اسرار و غوامض پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتا ہے وہ فلسفی تو نہیں فلسفہ کا بڑا دیدہ ور طالب علم ضرور ہے، وہ متکلم اسلام ہے، اس نے اپنے زمانہ کی عالمی سیاسی، معاشرتی اور فکری تحریروں کا مطالعہ بھی بیدار دماغی سے کیا ہے اس نے اپنے ملک کی عملی سیاست میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے اُسے سمجھنے کے لئے اس کی ان تمام حیثیات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے اور پھر ان سب سے الگ اس کی ذاتی زندگی ہے۔

جس میں اس کے ماں باپ ہیں' بھائی بہن ہیں' بیویاں ہیں اور بچے ہیں، خاندان ہے، خاندانی مسائل ہیں دوست ہیں' مخالف ہیں' استاد ہیں' شاگرد ہیں' ملازم ہیں' غم ہائے روزگار ہیں' حصول رزق کی فکر ہے لواحقین کے ساتھ خود اپنے جسمانی عوارض ہیں غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو ایک آدمی کی زندگی میں ہوتا ہے اس پر وہ تمام حالات و واقعات گزرے ہیں جو انسان کو توڑتے اور بکھیرتے رہتے ہیں اگر اقبال کو پڑھتے اس پر سوچتے اور اس کو سمجھتے ہوئے ان ساری باتوں کو زیر نظر رکھا جائے تو آدمی اس کے متعلق معتدل اور متوازن رائے قائم کرسکتا ہے نہیں تو اقبال پر سوچنے والا افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ لوگ بالعموم ان باتوں کا خیال نہیں رکھ سکے یوں وہ یک طرفہ رائے قائم کر لیتے ہیں اور پھر اسی پر ردے چڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

اکابر کی عظمت اسی میں ہے کہ انہیں ان کے حقیقی حالات و افکار کے تناظر میں دیکھا جائے لوگ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی ہر ادا انہیں محبوب نظر آنے لگتی ہے محبوب کی آنکھوں میں بھینگا پن ہو تو بھی اسے عشوہ و غمزہ پر محمول کر لیتے ہیں وہ لنگڑا کر چلتا ہے تو کہنے لگتے ہیں ''موج خرام ناز بھی کیا ''گل کتر گئی''، غرضیکہ اس کے نقائص کو بھی تاویلات سے صفات میں بدل کر دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے اُسے بشری کمزوریوں سے مبرا کر کے فرشتہ بلکہ ہم پایہ یزداں بنا دیا جاتا ہے اور جس سے نفرت ہوا اس کے حقیقی اوصاف سے بھی یا تو آنکھیں اندھی کر لی جاتی ہیں اور یا پھر کوشش کی جاتی ہے کہ ہر وصف کو نقص قرار دے سکنے کے دلائل تراش لئے جائیں۔

میں ایک ایسا طالب علم ہوں جس کا انداز مطالعہ کچھ مختلف سا ہے میرا ایک شعر ہے

گھر سے نکلے تو یہی رخت سفر تھا اپنا
منفرد ذہن تھا انداز نظر تھا اپنا

بچپن کا ایک واقعہ میری سوچ پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ ساری عمر میرے ساتھ رہا۔ واقعہ کچھ

یوں تھا کہ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ اپنی کتابیں خریدنے بازار گیا میانوالی کے بازار میں کتابوں کی ایک دکان تھی جس کے مالک کا نام جسیہ رام تھا جنوبی تنگ گلی سے نکل کر جوں ہی بازار میں داخل ہوتے تو بائیں ہاتھ کی پہلی دکان اسی کی تھی ہم بازار میں داخل ہوئے تو جسیہ رام اور دوسرے دکاندار دکانوں سے نکل کر کھڑے مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے ہم نے بھی ادھر دیکھا ایک بہت اونچا بجلی کے کھمبوں سے بھی اونچا بعض دکانوں کے چوباروں تک پہنچتے قد والا آدمی آہستہ آہستہ چلتا مغرب کی طرف آرہا تھا میں نے چھوٹتے ہی کہا ''یہ آدمی اونٹ پر کھڑا ہے'' مگر مجھے پھر اپنی بات غلط لگی کیونکہ وہ آدمی اس سے بھی اونچا تھا والد صاحب نے کہا ''بیٹا اس کے سر کو نہیں اس کے پاؤں کو دیکھو'' میں نے نیچے دیکھا تو اس آدمی نے پاؤں کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ رکھے تھے اور انہیں بڑی مہارت سے زمین پر ٹیکتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آپ نے بھی سرکس میں اکثر ایسے آدمی دیکھے ہونگے مگر جب میں نے دیکھا تو یہ واقعہ میری زندگی کا حصہ بن گیا۔ اس کے بعد میں نے رفعتوں اور عظمتوں کے حامل جس شخص کو دیکھا تو اس کے پاؤں کی طرف ضرور دیکھ لیا اور یقین کیجئے کہ ان بالا قامت شخصیتوں میں سے کسی نے تو اپنے پاؤں کے ساتھ تشہیر کے لمبے لمبے بانس باندھ رکھے ہوتے تھے یا دوسروں کے کندھوں پر پاؤں جما رکھے ہوتے تھے صحیح معنوں میں بلند و بالا لوگ بہت کم ہوتے، خود کو بلند قامت دکھانے کے کئی جتن کئے جاتے ہیں کچھ اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے ہیں کچھ ایڑیاں اٹھا کر کھڑے ہونے کی اذیت برداشت کرتے ہیں اور کچھ سروں پر طرہ ہائے پر پیچ وخم کھڑے کر لیتے ہیں جسے غالبؔ جیسے نکتہ شناس بھانپ لیتے ہیں۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرہ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

اس حقیقت کا ادراک مطالعہ میں میرے بہت کام آیا۔ مجھ پر منکشف ہوا کہ ہر مصنف اصل میں ایک شکاری ہوتا ہے اور وہ قاری کے ذہن پر براہ راست حملہ کر کے اُسے شکار کرنا چاہتا ہے ہر ایک کی صیادی کا طریقہ واردات الگ الگ ہے کوئی خوبصورت اور پرشوکت الفاظ کا تام جھام کھڑا کرتا ہے اور قاری کو جمال وحسن بیان سے مسحور کر کے چپکے سے لوٹ لیتا ہے کوئی بات کو اِدھر اُدھر کی مثالوں میں الجھا کر بیان کو طویل کر کے اس کا ذہن تھکا دیتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ تھکا ہوا پرندہ بالآخر شکاری کے

قدموں میں آ گرتا ہے کوئی دوسری زبان میں لکھنے والوں کے اقتباسات سے قاری پر اپنی وسعت مطالعہ کی دھاک بٹھا کر اُسے مرعوب کر لیتا ہے۔ ہمارے اردو میں لکھنے والے بالعموم انگریز مصنفین کے اقتباسات لاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم مشرقی ابھی تک انگریز کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکے اس لئے جہاں کسی انگریز کا نام آتا ہے ہمارے ذہن ہتھیار ڈال دیتے ہیں، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ لکھنے والا کس پایہ کا مصنف ہے، ہوسکتا ہے وہ ہم سے بھی زیادہ توہم پرست اور اوہام گزیدہ ہو مگر یہ نہ جانتے ہوئے بھی ہم خود کو صرف اس کا نام دیکھ کر مغلوب کر لیتے ہیں۔ اس لئے قاری کا فرض ہے کہ جب بھی کوئی کتاب پڑھنا شروع کرے اپنے ذہن کو پوری طرح بیدار کر لے اور اپنی دانش کو مستعد تنقید رکھ کر کتاب کا مطالعہ کرے۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ ہر کتاب کا مطالعہ اسی انداز سے کیا جائے میں نے ''تنقید'' کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس کا مطلب ہے پرکھنا یعنی خوبیاں اور خامیاں دونوں نوٹ کرتے جانا صرف خوبیاں دیکھی جائیں تو وہ ''تقریظ'' ہوتی ہے اور صرف خامیاں نوٹ کی جائیں اور ان کی نشاندہی کر دی جائے تو وہ ''تنقیص'' ہو جاتی ہے۔ میں نے اقبال کا مطالعہ تنقیدی نقطہ نظر سے کیا ہے اور آپ سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ میرے حاصل مطالعہ کو تنقیدی نقطہ نظر سے پڑھیں گے۔ میں اقبالؔ کا اندھا پرستار ہوں نہ اس کا معاند و مخالف، میں ایک تحقیق پسند طالب علم ہوں اور بس ''بزم رمز شناسان اقبالؔ'' کا ہر رکن بھی اقبالؔ کے متعلق معتدل سوچ رکھتا تھا۔ اس لئے میری کاوش کو اس بزم میں پذیرائی حاصل رہی، میانوالی جیسے دور افتادہ شہر میں بیٹھ کر ہم لوگ اس زمانہ میں اقبال کو کس طرح پڑھتے اور کس طرح سوچتے تھے اس کا اندازہ بھی ان مقالات سے ہوسکتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں صرف اقبال کے حالات کا مطالعہ کیا گیا ہے اس کی فکر جہات پر بحث اگلی کتاب میں آئے گی اس کتاب کے مقالات نئے ہیں۔

سید نصیر شاہ (میانوالی)

☑

اقبال اور خوش عقیدگی

جن لوگوں نے ہم اہل مشرق کے ذہن کی گہرائیوں میں جھانکا ہے اور ہماری نفسیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم عجوبہ پرستی کے فدائی ہوتے ہیں اور جب تک کسی شخصیت کے گرد کرشماتی ہالے نہ تان دیئے گئے ہوں ہمیں اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی ہم کہیں ذراسی طلسم کاری بھی دیکھتے ہیں تو جبین عقیدت پرستش نثار کرنے لگتی ہے اور سر نیاز جھک جاتا ہے ماتحت الاسباب کتنا بڑا کارنامہ سرانجام پا جائے ہم کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتے مگر اسباب ہماری نگاہوں سے مخفی ہوں اور کوئی کچھ دکھا دے تو یہ اچنبھا ہمیں عقیدت کیش اور نیازمند بنا دیتا ہے۔ ایک سرجن ہماری آنکھوں کے سامنے بہت بڑا آپریشن کرتا ہے سینہ چاک کرتا ہے دل باہر نکال کر رکھ دیتا ہے انتہائی باریک شریانوں کے نقائص دور کرتا ہے پھر سب کچھ اندر رکھ کر چاک سی دیتا ہے اور ہم چند روز بعد دیکھتے ہیں کہ مریض صحت یاب ہو کر پہلے کی طرح زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہو رہا ہے ہم اس سرجن کی قابلیت کی تعریف ضرور کرتے ہیں مگر ہمارے دلوں میں اس کے لئے عقیدت کے وہ جذبات پیدا نہیں ہوتے جو ایک ایسے شخص کے لئے پیدا ہوتے ہیں جو دم کر کے کسی کی داڑھ کا درد یا دردِ سر دور کر دیتا ہے۔ اول الذکر کو ہم ماہر سرجن کہتے ہیں لیکن ثانی الذکر کو ہم ''ولی اللہی'' کے مرتبہ پر فائز کرنے کی سوچنے لگتے ہیں ہماری اس عجوبہ پرستی کا اثر ہے کہ ہم میں سے جس کے اسلاف کی تاریخ پوچھئے وہ اپنے اجداد میں کسی صاحب کو ضرور حامل کشف و کرامات بتائے گا اور اس سے مختلف خرق عادت کرشمہ سازیاں منسوب کرے گا۔ اکثر اوقات ایک ہی کہانی بہت سے لوگ اپنے اپنے جدامجد سے منسوب کر کے سناتے ہیں حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ایک آدمی دیگر کئی فضائل کا حامل ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب

تک اس کے ساتھ کوئی کرامت اور کوئی کرشمہ سازی منسوب نہ کردی جائے اس کی عظمت کو نامکمل سمجھا جاتا ہے اقبال کی شخصیت بھی اس رسم عام سے مستثنیٰ نہیں۔

اقبال پر لکھی جانے والی کتابوں میں ''زندہ رود'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ کتاب اقبال کے لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فرزند ریٹائرڈ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے انتہائی محنت اور عرق ریزی سے لکھی ہے یہ تین جلدوں میں ہے پہلی جلد 1979ء دوسری 1982ء اور تیسری 1984ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی جلد اول 1908ء تک کے حالات پر مشتمل ہے جلد دوم 1925ء تک کے حالات کو محیط ہے اور جلد سوم جو 438 صفحات تک پھیلی ہوئی ہے 1926 سے وفات یعنی اپریل 1938ء تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے بعد میں یہ جلدیں یکجا کر کے ایک ہی کتاب کی صورت میں شائع کردی گئیں اقبال اکیڈمی پاکستان کی جانب سے اس کتاب کا خوبصورت فارسی ترجمہ بھی طبع کرادیا گیا ہے۔ اکثر اقبال شناسوں نے ''زندہ رود'' کو اقبال کی مستند ترین سوانح عمری قرار دیا ہے بلکہ اسے اس موضوع پر حرف آخر تک تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک بیٹے کی طرف سے باپ پر لکھی جانے والی کتاب کا یہ انداز بہت سراہا گیا ہے کہ مصنف نے حیات اقبال کے اکثر گوشے غیر جانبداری سے بے کم وکاست بیان کردیئے ہیں ہم نے بھی بنیادی طور پر اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے فاضل آدمی نے اپنے والد محترم کی شخصیت پر اپنی طرف سے بھی خوش عقیدگی کا غلاف ڈالنے سے دریغ نہیں کیا۔

کتاب کے پیش لفظ میں فرزند اقبال بتاتے ہیں کہ وہ کتاب شروع کررہے تھے تو اقبال کے شجرہ نسب پر تحقیق کرتے ہوئے انہوں نے ایک روز اپنی بیوی سے از راہ مذاق کہا کہ ''برصغیر کی آزادی کی تحریک میں پنڈتوں نے سرگرمی سے حصہ لیا پاکستان کا تصور بھی پنڈتوں کی اولاد نے دیا اس لئے یہ سب کچھ تو پنڈتوں کا آپس کا جھگڑا معلوم ہوتا ہے''۔ (ڈاکٹر جاوید اقبال کا اشارہ اس طرف تھا کہ نہرو خاندان بھی پنڈتوں کا خاندان تھا اور اقبال بھی کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھے) آگے بتاتے ہیں کہ اس رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ اقبال آئے اور انہوں نے خفگی سے کہا یہ تم کیا لکھتے رہتے ہو میں نے بتایا کہ آپ کے افکار کی تشریح وتبیین کی کوشش کررہا ہوں انہوں نے کہا میں کل تمہیں اپنے

تاثرات سے آگاہ کروں گا پھر خواب کا منظر بدل جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو ایک درخت پر پاتا ہوں شاخوں پر کاغذات اٹکے ہوئے ہیں میں انہیں اکٹھا کر رہا ہوں کوئی اور آدمی بھی میرے ساتھ ہے مگر اس کی شناخت واضح نہیں ہوتی میں اُسے کہتا ہوں میں تو اتنی محنت سے ان کے افکار کی تشہیر کرتا ہوں مگر وہ پھر بھی مجھ سے ناراض ہیں پھر میں جاگ جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ خواب لکھ لوں کاغذ پنسل تلاش کرنے لگتا ہوں تو بیوی بھی جاگ اٹھتی ہیں انہیں خواب سناتا ہوں تو وہ کہتی ہیں درخت سے کاغذ سمیٹنے کی بات تو یہ ہے کہ آج کل آپ ان کے شجرہ نسب پر تحقیق کر رہے ہیں باقی وہ جس بات پر ناراض ہیں وہ ضرور اس کی وضاحت کر دیں گے کوئی اشارہ آج مل جائیگا۔ اگلا سارا دن انتظار میں کٹ جاتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا پھر بیوی تھک کر سونے چلی جاتی ہے اور مجھے کہتی ہے ابھی رات کے بارہ نہیں بجے آپ انتظار کریں انتظار سے اکتا کر اٹھتا ہوں کہ کوئی کتاب دیکھتا ہوں الماری کھولتا ہوں ''روز گار فقیر'' کی دوسری جلد ہاتھ آ جاتی ہے اسے کھولتا ہوں تو سامنے اقبال کا یہ قطعہ ہوتا ہے۔

بت پرستی مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبالؔ
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

یہ قطعہ رقم کرنے کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں۔

''انہوں نے اپنے تاثرات مجھ تک پہنچا دیئے تھے میں نے بیوی کو جگا کر یہ قطعہ سنایا وہ کہنے لگیں آپ نے کہا تھا کہ یہ تو پنڈتوں کا آپس کا جھگڑا معلوم ہوتا ہے جو ان کی ناراضگی کا سبب بنا میں نے جواب دیا کہ میں نے تو ازراہ مذاق بات کی تھی وہ بولیں کہ آپ کے منہ سے انہیں یہ بات ازراہ مذاق بھی ناگوار گزری ہے اور کیوں نہ ہو جو بات ان کے لئے شرم وندامت کا باعث ہے آپ کو زیب نہیں دیتا کہ اُس کا تذکرہ ازراہ مذاق بھی کریں۔ آپ ان کے سوانح حیات کے سلسلہ میں تحقیق کا کام جاری رکھئے میرا خیال ہے کہ جب بھی آپ سے انہیں کسی غلطی کے سرزد ہونے کا احتمال ہوا وہ خواب میں آ کر آپ کی رہنمائی کریں گے'' ذرا آگے چل کر فرزند اقبال بتاتے ہیں کہ بعد میں اقبال کو انہوں نے خواب

میں نہیں دیکھا اس لئے ان کا خیال ہے کہ بعد میں اقبال کو رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی گویا بعد میں لکھی جانے والی تحریریں درست تھیں۔

جناب جاوید اقبال اور ان کی بیگم ناصرہ جاوید ماشاءاللہ دونوں جسٹس کے منصب پر فائز رہے ہیں اس طرح انہیں قوم کے دماغ کی حیثیت حاصل ہے فرزند اقبال نے یہ سارا واقعہ اپنی کتاب کی جلد اول کے پیش لفظ میں تحریر کر دیا ہے۔اس طرح انہوں نے ایک تو اپنے والد گرامی پر اپنی خوش عقیدگی کی عقیدت مندانہ چادر ڈال دی ہے کہ مرحوم اپنی وفات کے بعد بھی حالات کو دیکھ رہے ہیں اور اپنے فرزند کی رہنمائی کر رہے ہیں موت ان کا کچھ بگاڑنے کی بجائے ان کی قوتوں میں بے پناہ اضافہ کر گئی دوسری طرف مصنف نے بالواسطہ اپنی کتاب پر مہر تصدیق بھی ثبت کرالی۔

علامہ اقبال کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو مسلمانوں کے خلاف زیادہ تعصب آمیز رویہ نہیں رکھتا تھا اور جس نے عربی اور فارسی زبانوں کو زبان سمجھ کر سیکھنا ضروری سمجھا تھا اور انہیں ملیچھوں کی زبانیں کہہ کر نفرت سے ٹھکرا نہیں دیا تھا۔اس خاندان میں علامہ اقبال کے وہ کونسے جدامجد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا کہا جاتا ہے وہ ایک بزرگ تھے جن کا اصل نام تو معلوم نہیں ہوسکا نہ یہ پتہ چل سکا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا اسلامی نام کیا تھا صرف یہ معلوم ہوسکا کہ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اتنی مرتبہ پاپیادہ حج کیا کہ ان کا نام ہی ''لول حج''، یعنی حج کا عاشق پڑ گیا۔ بابا لول حج یا لولی حج کی آنکھیں بھینگی اور پاؤں ٹیڑھے تھے۔کہا جاتا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کی شادی کسی مسلم خاتون سے ہوئی جس نے غالباً بابا صاحب کی بھینگی آنکھوں اور ٹیڑھے پاؤں کی وجہ سے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا اور ان سے خلع حاصل کر لیا کہتے ہیں بابا کو اشارہ غیبی ہوا اور وہ حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولی کے ایک مقتدر خلیفہ بابا نصرالدین کے مرید ہوئے اور ساری عمر اپنے پیر کی خدمت میں گزار دی موت کے بعد اپنے پیر کے مزار کے پاس ہی ان کی قبر بنی۔حضرت بابا لول حج کی اسی شادی کا ذکر ہے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس سے ان کا کوئی فرزند ہوا اور اگر ان کا کوئی فرزند تھا تو اس کا نام کیا تھا۔بہر حال اقبال ان ہی کے اخلاف میں ایک اور بزرگ کا ذکر کرتے ہیں سید نذیر نیازی کی روایت کے مطابق اقبال نے خود انہیں بتایا

''ہمارے والد کے دادا یا پردادا بڑے پیر تھے ان کا نام شیخ اکبر تھا انہیں پیری اس طرح ملی کی سنکھترا میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے اور اس لئے ان پر ہمیشہ طعن و تشنیع ہوا کرتی تھی اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے اس کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا مخالفین نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقع سید ہیں ان کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے'' [1]

ان شیخ اکبر کے متعلق کچھ اور تفصیل محمد دین فوق نے کچھ اس طرح دی ہے۔

''بابا لول حج کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ اکبر کے نام سے موسوم ہوئے ہیں باعمل صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے والوں میں تھے ان کے تقدس و اتقاء اور ان کی خاندانی نجابت کی وجہ سے ان کی شادی ان کے مرشد نے جو سید تھے اپنی صاحبزادی سے کر دی تھی مرشد کی وفات پر ان کے فرزند سید میر نام نابالغ تھے اس لئے وہی اپنے مرشد کے جانشین قرار پائے شیخ اکبر سیلانی طبع تھے کئی بار انہوں نے پنجاب کا سفر کیا'' [2]

فوق کی روایت کے مطابق شیخ اکبر اقبال کے دادا شیخ رفیق سے اوپر چوتھی پشت میں تھے شیخ اکبر کے پیر کا نام نہیں بتایا گیا لیکن ان کے فرزند کا نام محمد دین فوق نے سید میر بتایا ہے خود اقبال کی روایت میں اس کا ذکر نہیں اقبال سے منسوب روایت میں ایک مشہور کہانی دہرادی گئی ہے جو اکثر لوگوں سے منسوب کرتے ہیں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سید پر لوگوں نے شبہ کیا تو وہ آگ میں بیٹھ گیا اور آگ نے اس پر کوئی اثر نہ کیا۔ انگریز معاشرہ ہوتا تو وہ شاید کوشش کرتا کہ زمانہ موجودہ کے سید کہلانے والے لوگوں کو اسی تجربہ سے گزار کر دیکھ لیا جائے تا کہ روایت علم Knowledge کا حصہ بن سکے شاید حفظ ماتقدم کے طور پر اقبال نے کہہ دیا کہ وہ سبز لباس اپنے اوپر اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے اور اس سبز کپڑے کو امام حسین علیہ السلام کی یادگار بتایا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو پھر سبز کپڑے کی برکت ہوئی اُسے جو بھی اوڑھ کر بیٹھ جاتا آگ اثر نہ کرتی اس سے اس بزرگ کا سید ہونا کیسے ثابت

[1] اقبال کے حضور ج 1 ص 169 [2] تاریخ اقوام کشمیر طبع 1943ء ص 323

ہو گیا مگر ہم مشرقی لوگ ایسے سوالات کی طرف دھیان نہیں دیتے یہاں سے ایک اور بات بھی سامنے آ گئی کہ اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح خود اقبال بھی ''خوش عقیدہ'' شخص تھے۔ ہم اقبالؔ کی مناسبت سے لفظ ''خوش عقیدہ'' لکھ رہے ہیں وگرنہ '''توہم پرست'' لکھ دیتے۔

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد کا عرف ''نتھو'' تھا اور وہ ''نتھو'' کی عرفیت سے پکارے جاتے تھے اس عرفیت کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق کی پہلی بیوی بے اولاد فوت ہو گئی تھیں دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی سے ہوئی۔ کہتے ہیں یہ بیوی بہت خوبصورت تھی اس سے شیخ محمد رفیق کے اوپر تلے دس لڑکے ہوئے اور سب کے سب فوت ہو گئے نور محمد گیارہویں بیٹے تھے ان کی پیدائش پر پیروں فقیروں سے بڑی دعائیں کرائی گئیں بڑی منتیں مانی گئیں کہ یہ بیٹا باقی لڑکوں کی طرح کم عمری میں موت کا شکار نہ ہو۔ وہ ہندو مسلم میل جول کا معاشرہ تھا تمدنی زندگی میں بہت سے رسم ورواج اور خیالات وتوہمات مشترک تھے ہندوؤں میں یہ خیال عام تھا کہ بدنصیبی نازل کرنے والی دیویاں اور بلائیں یا قدرت کی منفی قوتیں ہی کسی انسان کی دشمن بن جاتی ہیں اور اولادِ نرینہ کو زندہ نہیں چھوڑتیں ان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں دھوکا دیا جائے کہ لڑکا پیدا نہیں ہوا لڑکی پیدا ہوئی ہے اس خیال کے تحت توہم پرست معاشرہ میں لڑکوں کو بچانے کے لیے ان کی ناک میں نتھ ڈال دی جاتی یا کانوں کو چھید کر بالیاں پہنا دی جاتی تھیں جن لڑکوں کو نتھ ڈالی جاتی وہ بالعموم نتھو کے عرف سے مشہور ہو جاتے تھے شیخ نور محمد کو بھی نتھو اسی لئے کہا جاتا تھا کہ انہیں ''بلاؤں'' سے بچانے کے لئے ان کی ناک میں نتھ ڈال دی گئی تھی بہر حال وہ بچ گئے اور انہوں نے بڑی طویل عمر پائی۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ اقبالؔ کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھے اور اُن کے دور کے آباؤ اجداد اور برہمن تھے ہندوؤں کے لئے تو برہمنوں کی اولاد ہونا باعث فخر ہوتا ہے عربی اور سنسکرت میں ماہرانہ دسترس رکھنے والے پنڈت رام چندم دہلوی نے اقبالؔ کی عارفانہ طبیعت اور ان کے دانائے اسرار ہوئے کی صفت میں پنڈتوں کے خون کے اثرات دریافت کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے لکھا۔

''ایشوری گیان اور کلام ربانی کو برہمن زادہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس میں اقبال نے کیا راز پنہاں رکھا ہے یہی کہ وہ کشمیری پنڈت تھے۔ ہزاروں برس تک ان کے آباؤ اجداد نے روحانیت کی تربیت میں

اقبالؔ کو اپنے اندر پرورش کیا'' ❸

اقبالؔ کو اس کا اعتراف تو ضرور ہے۔

میں اصل کا خاص سومناتی

آبا مرے لاتی ومناتی

مگر انہوں نے ان سومناتی آباواجداد پر فخر کبھی نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے جداعلیٰ نے ان کی ولادت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پیشتر اسلام قبول کیا تھا اور پھر اسلام سے ان کی وابستگی نسل درنسل عشق وجنوں کی حد تک رہی مگر معمولی سا تعجب ابھرتا ہے جب فرزند اقبال جناب ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''اقبالؔ کو اپنے اسلاف کے برہمن ہونے پر کیا فخر ہو سکتا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ گائے کا گوشت نہ کھا سکتے تھے۔ اس لئے گائے کا گوشت گھر میں نہیں پکتا تھا انہیں غلطی سے کوئی گائے کا گوشت کھلا دیتا تو ان کا معدہ اسے قبول نہ کرتا اور ان کی طبیعت مکدر ہو جاتی'' ❹

''اسرار خودی'' لکھنے والے اقبال عقیدہ جبر کے شدید مخالف تھے وہ کب تسلیم کر سکتے تھے کہ علم ونجوم کی کوئی حیثیت ہے اور ستارے آدمیوں کے مقدر کی خبریں دے سکتے ہیں اقبال نے صاف کہا تھا

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا

وہ خود فراخی افلاک میں ہے زار وزبوں

لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال یہ بھی بتاتے ہیں۔

''گو وہ علم نجوم کے قائل نہ تھے انہوں نے راقم کی پیدائش پر ان کی دو جنم پتریاں بنوائیں جو محفوظ رکھی گئیں ایک جنم پتری لاہور میں راجہ نریندر ناتھ نے ترتیب دی اور دوسری میسور سے پنڈت سرنیواسیہ نے بنا کر بھیجی'' ❺

علامہ اقبال کے والد مرحوم شیخ نور محمد کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ معلومات فراہم کی ہیں ''انہوں نے کسی مکتب میں تعلیم نہ پائی تھی مگر شاید حروف شناس ہونے کے سبب اردو اور فارسی کی چھپی

---

❸ ''احسان'' اقبالؔ نمبر 27 جون 1938ء ❹ زندہ رود ج 1 ص 15 ❺ ایضاً ج 1 ص 16

ہوئی کتابیں پڑھ سکتے تھے۔فوق کے بیان کے مطابق تجارت پیشہ ہونے کے باوجود صوفیاء اور علماء کی مجلسوں میں بیٹھتے اور ان کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے شریعت اور طریقت کے نکات ورموز سے پورے آگاہ تھے۔ وہ فکر کی عادت کے علاوہ تصوف کی پیچیدگیوں سے بھی آشنا تھے اس لئے بعض ہم عصر اکابر علم انہیں ان پڑھ فلسفی کہتے تھے اور بعض لوگ تصوف کی کتابوں کے مشکل مطالب کی تشریح کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے تھے'' 6

آج کے دور کے لوگ اس سارے بیان پر بمشکل یقین کریں گے، ایک آدمی جس نے کسی استاد سے تعلیم نہیں پائی محض حروف شناس ہے وہ اردو کی کتابیں تو پڑھ اور سمجھ سکتا ہوگا لیکن فارسی زبان کی کتابیں پڑھ لینا بھی ناممکن نظر آتا ہے اس طرح لوگ اس پر بھی یقین نہیں کریں گے کہ وہ شریعت اور طریقت کے نکات ورموز سے پوری طرح آگاہ ہوں گے لیکن میں یہاں تک کے بیان کو خوش عقیدگی کی مبالغہ آرائی نہیں سمجھتا شیخ نور محمد کا زمانہ تو بہت پہلے کا زمانہ ہے خود میرے زمانہ یعنی بیسویں صدی کے تیسرے عشرہ میں میرے اپنے خاندان میں بعض بالکل ان پڑھ لوگ جو مجھ سے چودہ پندرہ سال زائد عمر کے تھے شریعت اور طریقت کے بعض نکات کی فہم رکھتے تھے اور ان پر گفتگو کر سکتے تھے میری ولادت سے بیس تیس سال پہلے ہمارے علاقہ میں ایک مادرزاد اندھا سرائیکی شاعر غلام غریب تھا اس کے ''دوہڑے'' ہمارے دور میں زبان زد عام تھے اس کی شاعری میں تصوف کی دقیق اصطلاحات کا عام استعمال ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کا رجوع مذہب کی طرف زیادہ تھا مساجد میں آئے دن علماء کے مواعظ کا اہتمام رہتا دور ونزدیک سے علماء آتے اور لوگ ان کی تقریریں سننے کے لئے جوق در جوق مساجد میں حاضر ہوتے پھر چوکوں اور چوپالوں پر ان ہی مواعظ پر بحثیں چھڑی رہتی تھیں اس طرح پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود لوگوں کو ان نکات ورموز سے شناسائی تھی اس لئے ایسے ''ان پڑھ فلسفی'' ہوا کرتے تھے تاہم ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کی آخری جملہ پر مجھے بھی مبالغہ کا گمان ہے کیونکہ تصوف کی کتابوں کا پوری طرح سمجھنا اچھے اچھے عالموں کے لئے مشکل ہے کجا کہ ایک ان پڑھ آدمی ان کتابوں کے مشکل مطالب کی تشریح کر سکے ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ تو کہہ

6 ایضاً ج1 ص19

دیا کہ ان کے جد محترم کو بعض ہم عصرا کابر علم ان پڑھ فلسفی کہتے تھے مگر وہ کون سے اکابر اہل علم تھے ان میں سے کسی ایک کا نام بھی نہیں لیا گیا۔

علامہ محی الدین ابن عربی وحدت الوجود جیسے انتہائی پیچیدہ اوت عسیر الفہم فلسفہ کے ایک طرح کے بانی تصور کئے جاتے ہیں اس فلسفہ کو اسلام میں ابن عربی نے ہی رواج دیا۔ اس دقیق فلسفہ پر ''فصوص الحکم'' ابن عربی کی مشکل ترین کتاب ہے مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے میں نے اپنے بہت سے ہم عصر علماء کی لائبریریوں میں یہ نسخہ دیکھا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ اکثر علماء کے نسخے ایسے تھے کہ پہلے سات آٹھ صفحے کھولے گئے تھے آگے ورق آپس میں اوپر سے جڑے ہوتے تھے اور انہیں چھڑایا بھی نہیں گیا تھا گویا لائبریری کے مالک عالم نے پہلے سافی آٹھ صفحے پڑھے اور کتاب کو مشکل پا کر اسی حالت میں چھوڑ دیا اور بطور تبرک لائبریری میں رکھ دیا یہ تو ترجمہ کی حالت ہے اسی سے آپ اصل کتاب کے عسیر الفہم ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ فلسفہ وحدت الوجود کا پورا فہم رکھنا بڑا مشکل ہے اس لئے عام علماء نے اسے گمراہ کن کتاب سمجھا خود علامہ اقبال 1916ء تک فصوص الحکم کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے۔

''جہاں تک مجھے علم ہے (فصوص الحکم از محی الدین ابن عربی) میں سوائے الحادو زندقہ کے اور کچھ نہیں''

(مکتوب اقبال 1916ء)

مگر جب اقبال اسی مشکل کتاب میں اپنے والد کے انہاک کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے یہ اقبال کی طرف سے اپنے والد کے متعلق خوش گمانی کا مبالغہ ہی لگتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں۔ میرے والد کو فتوحات (فتوحات مکیہ از ابن عربی) اور فصوص (فصوص الحکم از ابن عربی) سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفل درس میں ہر روز شریک ہوتا بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا

گیا میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی'' [7]

اپنے باپ سے ہر آدمی کو محبت ہوتی ہے اور اس محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جب بھی آدمی کو اپنے باپ کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملے وہ اسے دنیا کے تمام باپوں سے بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ہم مشرقی لوگوں کے نزدیک ''بڑے پن'' کی یہ تصویر تب مکمل ہوتی ہے جب اس میں کرامات اور خرق عادات کی رنگینیاں بھری جائیں۔ اقبال کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد صاحب کرامات بزرگ تھے خود اقبال کی پیدائش بھی ان کے والد پر ایک کشفی خواب کی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''اقبالؔ کی پیدائش سے کچھ روز قبل ان کی صوفی منش والد نے خواب میں دیکھا کہ کسی وسیع میدان میں بہت سے لوگ فضا میں چکر لگاتے ہوئے ایک سفید کبوتر کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ کبوتر کبھی نیچے اترتا اور کبھی آسمان کی طرف اڑ جاتا۔ بالآخر اس نے اچانک فضا میں غوطہ لگایا اور ان کی جھولی میں آ گرا۔ شیخ نور محمد اسے اشارہ غیبی سمجھے اور خواب کی تعبیر یوں کی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو خدمت اسلام میں نام پیدا کرے گا'' [8]

اس خواب کا ذکر بھی خود اقبالؔ کی زبانی ہوا ہے [9]

شیخ نور محمد ٹوپیاں بنا کر بیچتے تھے اس لئے اقبالؔ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق وہ شیخ نتھو کہلاتے تھے یا کشمیری برادری سے متعلق ہونے کے سبب نتھو کشمیری یا اپنے پیشے کی نسبت سے نتھو ٹوپیاں والے کہلاتے تھے اس کاروبار میں ان کی مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی یہ حالات بہتر کس طرح ہوئے اس سلسلہ میں اقبال خود بتاتے ہیں کہ وہ بزرگ جن کے خلیفہ اقبال کے جد امجد شیخ اکبر تھے اسی بزرگ کے خاندان کے ایک فرد کی رہنمائی سے یہ کچھ ہوا فرماتے ہیں۔

''ایک مرتبہ اسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے اس زمانہ میں معمولی دھسے کی قیمت دو روپے سے زیادہ نہ تھی والد ماجد نے کوئی

---

[7] انوار اقبالؔ مرتبہ شبیر احمد ڈار ص 178 [8] زندہ رود ج 1 ص 50 [9] اقبالؔ کے حضور از سید نذیر نیازی ج 1 ص 95، ذکر اقبالؔ از عبد المجید سالک ص 10، فکر اقبالؔ از خلیفہ عبد الحکیم ص 14

دو چار سودھسے تیار کئے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بک گئے حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی دو چار سودھسے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا پس یہ ابتداء تھی ہمارے دن پھرنے کی (10)

یہ روایت بھی اقبال سے منسوب ہے اس میں اگر خوش عقیدگی کی بات آتی بھی ہے تو اپنے جدامجد کے پیر کے خاندان کے ایک نامعلوم الاسم فرد سے وابستہ ہو جاتی ہے اقبال کے اپنے والد محترم کی اپنی کوئی خاص کارکردگی نہیں اس خلاء کو پر کرنے کے لئے خود اقبال ہی سے ایک اور روایت بھی منسوب ہے فرماتے ہیں۔

''میرے والد ایک روز گھر آرہے تھے ہاتھ میں رومال تھا رومال میں تھوڑی سی مٹھائی تھی، اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جسے اُسے پانی کی طلب ہے والد ماجد نے ُ سے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا رات کو سوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اُس نیک عمل کا ثمرہ تھا جو کل اُن سے سرزد ہوا۔ چنانچہ اس دن سے انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں'' (11)

اپنے والد بزرگوار کے متعلق علامہ اقبال نے کئی جگہ خوش عقیدگی کا اظہار کیا ہے اور بعض کرامات بھی ان سے منسوب کی ہیں عبدالمجید سالک کہتے ہیں کہ ذیل کا واقعہ اقبال نے خود مجھ سے بیان کیا اقبال نے فرمایا۔

''جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے جارہی ہیں میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازہ کے پاس پہنچا جو آدھا کھلا تھا اور اُس میں

---

(10) اقبال کے حضور ج 1 ص 170 ' روایات اقبال از عبداللہ چغتائی ص 22 ' ذکر اقبال ص 9

(11) اقبال کے حضور ج 1 ص 169

سے روشنی اندر آرہی تھی والدہ اس دروازہ میں سے باہر جھانک رہی تھیں میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور اک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روک دیا اور مجھے سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تا کہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رویا سنا رہے تھے جو رات انہوں نے بحالت بیداری دیکھا تھا والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے اس قافلہ میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لئے فوراً پہنچنا چاہئے والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے ٹانگہ منگایا مجھے بھی ساتھ بٹھایا اور چل دیئے چند گھنٹوں میں ٹانگہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کاروان کا ڈیرہ تھا ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے تھے والد نے ٹانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلہ کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو سالار بے حد متعجب ہوا چلو کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے اور اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفاء حاصل ہوگی اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہو گیا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی، جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے'' [12]

---

[12] ذکر اقبال ص 12 تا 14

عطیہ بیگم فیضی نے اپنی انگریزی کتاب ''اقبال'' میں یہ سارا واقعہ اس طرح نقل کیا ہے اور واقعہ نقل کرنے کے بعد اپنی طرف سے یہ جملے بڑھائے ہیں کہ ''اقبال کے والد نے کسی ولی کی رہنمائی میں کئی ماہ تنہائی میں گزارے تھے اور انہیں جو کچھ حاصل ہوا بیٹے کو بھی دیا'' [13]

والد نے جو کچھ حاصل کیا بیٹے کو دیا'' عطیہ فیضی کے اس جملہ کی تصدیق کے لئے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں لکھتے ہیں

''عین ممکن ہے کہ شیخ نور محمد نے اپنے قوائے روحانی کی نشوونما کے لئے چلہ کشی کی ریاضت بھی کی ہو بعض اوقات اقبال خود بھی باری کے بخار کے مریضوں کو پیپل کے پتوں پر قرآنی آیات قلم سے لکھ کر دیتے تھے جس کے چاٹنے سے مریض کا بخار اتر جاتا تھا [14]

اپنے بچپن میں راقم نے انہیں پیپل کے پتوں پر ایسا تحریر کرتے دیکھا ہے اس قسم کا روحانی علاج کرنے کی اجازت ممکن ہے انہوں نے والد سے لی ہو۔ لیکن شیخ نور محمد باقاعدہ بیعت لے کر کسی کو مرید نہیں کرتے تھے ان کی سوچ فرار پر اقبال کے تحریر کردہ قطعہ تاریخ وفات میں اُنہیں پیرومرشد اقبال کہا گیا ہے مگر اس بیان مین کوئی صداقت نہیں کہ اقبال اپنے والد سے بیعت تھے البتہ معنوی رنگ میں اقبال کی نگاہ میں، اپنے والد کا وہی رتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر میں مرشد کا ہوتا ہے'' [15]

---

[13] ''اقبال'' از عطیہ بیگم فیضی اردو ضیاء الدین برنی ص 16 [14] باری کا بخار شاید ملیریا ہی کی ایک قسم تھی ایک دن بخار ہوتا پھر ایک دن اتر جاتا اسی طرح باری باری چڑھتا اترتا رہتا۔ میرے والد مرحوم مولانا حکیم محمد امیر علی شاہ بتایا کرتے تھے کہ جب کچے کے گاؤں گانگی میں مقیم تھے تو موسمی بخار کے دنوں میں ایک شخص کچے کے علاقہ میں آجاتا وہ لوگوں کا باری کا بخار دور کرتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ نرم گڑ جس کی ہاتھ سے گولی بنائی جاسکے لانے کا کہتا، اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی طرف سے ایک سبز سفوف انگلی پر لیتا اور گڑ کی گولی بنا کر بہت کچھ پڑھ کر اس پر دم کرتا اور مریض کو چوسنے کے لئے دے دیتا عام طور پر پہلی ہی گولی سے بخار کا حملہ رک جاتا۔ میں نے اس شخص سے اس سبز سفوف کا بڑی مشکل سے بھید معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک نشہ آور پودا ''دھتورا'' کے سبز پتوں کو خشک کر کے بنالیا جاتا ہے ممکن ہے پیپل کے پتوں اور اس وقت کی گڑ سے تیار ہونے والی کالی سیاہی میں بھی کوئی ایسی تاثیر ہو یا پیپل کے پتے میں اثر کہ آخر اسی پر لکھ کر کیوں چاٹا جاتا تھا اس سے بڑے پتوں والے درخت اور پودے بھی ہوتے ہیں (سید نصیر شاہ)

[15] زندہ رود ج 1 ص 64

اقبالؔ نے اپنے والدِگرامی سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر کے سنائی ہیں کہ لوگ اُنہیں ''ان پڑھ فلسفی'' کہتے تھے ہمارا ذہن تو انہیں ''ان پڑھ'' کہنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا مثلاً یہ کہ ایک دفعہ انہیں والد صاحب نے قرآن پڑھتے ہوئے دیکھا تو یہ ہدایت کی کہ جب قرآن حکیم پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کر قرآن حکیم تم پر نازل ہو رہا ہے [16]

اقبالؔ نے یہی نکتہ ا۔۔ یت حکیمانہ شعر میں بیان کیا کہتے ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اقبالؔ نے اپنے والد کو صاحب کرامات بزرگ بتایا ہے ہم چونکہ اس دنیا میں داخل نہیں ہوئے اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتے ایسی باتیں بہت سے مرحومین کے متعلق ان کی زندگی کے بعد منسوب ہو جاتی ہیں میں نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ۔۔یکھے ہیں جنہوں نے میرے سامنے عمر گزاری وہ کچھ بھی نہیں دکھا سکے اور فوت ہوئے تو ان کی اولاد نے ان ہی سے بہت سی کرامات منسوب کر دیں میرے والد صاحب کی وفات کے بعد ایک صاحب ایک روز میرے پاس آگئے اور ایک دو کرامتیں والد صاحب سے منسوب کر کے کہنے لگے ''رات وہ میرے خواب میں آئے میں نے انہیں بہشت بریں میں سیر کرتے دیکھا بڑے ہشاش بشاش اور مسرور پھرتے تھے ہاں ان کے کپڑے کچھ بوسیدہ تھے آپ کا نام لے کر فرمایا ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ کورے لٹھے کی قمیض اور چادر ململ کی دستار اور ملتانی جوتے کا جوڑا خرید کر تمہارے حوالے کرے'' میں نے ان صاحب سے کہا ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ابا جان کی قبر ہمارے گھر سے زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور آپ بتا رہے ہیں کہ آپ جنڈانوالہ میں رہتے ہیں جو یہاں سے کم از کم پینتالیس میل دور ہے ابا جان نے مجھے خواب میں یہ سب کچھ کیوں نہیں کہہ دیا وہ اتنی دور آپ کے پاس کیوں گئے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ میاں جنت میں اپنے بندوں کو لباس نہیں دے سکتا اور جنتیوں کو دنیا سے اپنے لواحقین سے کورے لٹھے کے سوٹ اور ململ کی پگڑیاں منگوانا پڑتی ہیں تو اس نے جنت بنائی کیوں ہے تیسری بات یہ ہے کہ ابا جان کو یہ بھی علم ہوگا

---

[16] اقبال کے حضور ج1 ص61

کہ میں غریب آدمی ہوں آپ کپڑے پہنیں گے تو انہیں پہنچ جائیں گے انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ کپڑے میں پہن لوں''

بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کئی لوگوں سے ان کی وفات کے بعد عجیب عجیب کرامات منسوب کردی جاتی ہیں اور ایسا کچھ اکثر ان کی اولاد کی طرف سے ہوتا ہے علامہ اقبال نے اپنے والد بزرگوار سے جو باتیں منسوب کیں افسوس ہے کہ دوسروں کی زبان سے ایسی باتیں نہیں نکل سکیں رومی نے کہا تھا۔

خوشتراں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر اقبآل کے والد بزرگوار کے متعلق اس طرح کی باتیں کسی اور نے بھی کی ہوتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ (17)

اقبال خوش عقیدہ آدمی تھے اور عام بریلوی مسلمانوں کی طرح مزارات پر جاکر صاحب قبر سے استمداد کرنا اور تعاون مانگنا نہ صرف جائز سمجھتے تھے بلکہ خود بڑے اہتمام سے ایسا کرتے جب انگلینڈ جانے لگے تو پہلے دہلی گئے اور حضرت نظام الدین محبوب الاولیاء کے مزار پر حاضری دی اور اپنی وہ نظم پڑھی جو''التجائے مسافر'' کے عنوان سے''بانگ درا'' میں شامل ہے۔اقبآل نے عالم تنہائی میں مزار کے سرہانے بیٹھ کر یہ نظم پڑھی اور ان کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے بعد میں دوستوں کے اصرار پر یہی نظم صحن میں بیٹھ کر دربار کی طرف منہ کر کے دوبارہ پڑھی (18)

اسی طرح اقبال کے برادر بزرگ جب ایک کیس میں پھنس گئے تو علامہ اقبال نے حضرت نظام الدین محبوب الاولیاء سے استمداد کی نظم لکھی اور اپنے دوست خواجہ حسن نظامی کو بھیجی کہ دربار پر پڑھی جائے وہ نظم پڑھی گئی اور اس کا یہ شعر الگ کر کے دربار کے دروازے پر لٹکایا گیا۔

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

(17) زندہ رود ج 1 ص 92 (18) ایضاً ص 105

یہ نظم ''برگ گل'' کے عنوان سے ''باقیات اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ 169 پر موجود ہے معلوم نہیں اقبال نے اسے بانگ درا میں جگہ دینا کیوں مناسب نہ سمجھا۔

مرحوم اولیاء اللہ سے مدد کی درخواست کرنا ایک مذہبی مسئلہ ہے جو مدت سے مذہبی فرقوں میں موضوع بحث ومناظرہ چلا آتا ہے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اقبال کا عقیدہ یہ تھا۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اس عقیدہ کا حامل شخص اگر ''التجائے مسافر'' یا برگ گل'' جیسی نظمیں لکھ کر خواجہ محبوب الاولیاء سے استمداد کرتا ہے تو ہمیں اس پر اعتراض کیا۔ ہاں ''التجائے مسافر'' میں اقبال کا ایک مصرع زیر بحث رہا اور وہ یہ کہ انہوں نے خواجہ صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

خضر تو تقریباً مفروضاتی شخصیت ہے اور شعراء اکثر اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے ہیں غالبؔ نے کہا۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے

اب کسے رہنما کرے کوئی

''مسیح وخضر'' کے نام اکٹھے اس لئے کر دیئے جاتے ہیں کہ دونوں کے متعلق مسلمانوں میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ دونوں زندہ ہیں اور قیامت تک انہیں زندہ رہنا ہے شعراء حضرات نے دونوں کا کچھ استخفاف بھی کیا ہے مثلاً شیخ محمد ابراہیم ذوق نے کہا۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

مگر اقبال کو عام شاعروں میں شمار نہیں کیا جاتا اُسے اسلام کا نقیب سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کے اشعار کو محتاط چھلنیوں سے چھانا جاتا ہے اس نے کہہ دیا کہ حضرت خواجہ محبوب الاولیاء کا مقام حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی بلند ہے تو لوگ معترض ہوئے کہ خواجہ نظام الدین بے شبہ اللہ کے برگزیدہ اولیاء

میں بلند مقام رکھتے ہیں مگر حضرت مسیح علیہ السلام تو خدا کے اولوالعزم نبی ہیں تو کیا ایک ولی کا رتبہ نبی سے بلند ہوسکتا ہے؟ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ خود مسلمانوں میں ہی کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جو ولایت کو نبوت سے بہتر اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔ایک صاحب سید محمد جونپوری ہوئے ہیں جنہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں۔

''ان کا مقصد حیات دعوت وتبلیغ حق، احیائے شریعت اور قیام فرض امر بالعروف اور نہی عن المنکر تھا'' (19)

سید محمد جونپوری نے اپنی جو جماعت پیدا کی تھی اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔''ان لوگوں کے طور طریقے کچھ عجیب عاشقانہ ووالہانہ تھے اور ایسے تھے کہ صحابہ کرام کے خصائل ایمانی کی یادتازہ ہوجاتی تھی۔عشق الٰہی کی ایک جان سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن وزمین کی فانی الفتوں کو ایمان ومحبت کے رشتہ پر قربان کردیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق وغمگسار بن گئے تھے۔امیر وفقیر، اعلیٰ وادنیٰ، سب ایک حال اور ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت وخدمت اور احکام شرع کے اجراء وقیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے'' (20)

ان ہی سید محمد جونپوری کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ نبوت سے ولایت افضل ہے جب ''برلی'' میں مُلا معین الدین کی سرکردگی میں پٹن کے بعض دانشور سید محمد جونپوری سے بحث کرنے آئے تو انہوں نے پوچھا ''کیا ولایت نبوت سے بہتر ہے تو سید محمد جونپوری نے جواب دیا کہ وہ ولایت کو نبوت سے برتر تصور کرتے ہیں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ولایت کو نبوت سے اعلیٰ وبرتر قرار دیا ہے۔ (21)

صرف سید محمد جونپوری ہی نہیں بعض اور صوفیاء اور دانشور بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے (22)

اور یہ روایت تو زبان زد خاص وعام ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' علماء امتی کا نبی

---

(19) تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد ص40 (20) ایضاً ص41 (21) ''حیات پاک'' از سید محمود دیدالٰہی ص 164-165
(22) مسلم فکر کا ارتقاء از قاضی جاوید ص113

اسرائیل''(میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں)۔پس اگر انتہائے عقیدت میں علامہ اقبال نے ''مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا'' کہہ دیا تو ہمارے خیال میں فتویٰ بازوں کو اس سے صرف نظر کر لینا چاہئے مگر اقبال کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے اس لئے انہیں محتاط ہونا چاہئے تھا۔علامہ صاحب خود اپنے متعلق بھی خوش عقیدگی کا شکار تھے۔یہاں ہم فرزند اقبال کا ایک طویل اقتباس درج کئے دیتے ہیں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں۔

''اقبال کو جنوری 1920ء میں ایک گمنام خط موصول ہوا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تمہیں کچھ پتا نہیں اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تمہیں اس کا علم ہو جائے گا اور وہ وظیفہ خط میں درج تھا چونکہ خط گمنام تھا اس لئے اقبال نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی وہ خط ضائع ہو گیا چار ماہ بعد اسی سلسلہ میں اقبال کے ساتھ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اپنی روح کے کرب واضطراب کو کم کرنے یا تسکین قلب کے حصول کی خاطر اپنے والد سے رہبری کی التماس کی اپنے خط محررہ 23 اپریل 1920ء میں انہیں تحریر کیا۔

'پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا اس کی عمر قریباً تیس پینتیس سال کی ہوگی شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے گفتگو سے ہوشیار سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔میں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے استفسار حال کیا تو کہنے لگا کہ کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی اور میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں رونے کی وجہ خوشی ہے نہ غم، مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا نوگام میں جو میرا گاؤں سری نگر کے قریب ہے میں نے عالم کشف میں نبی کریمؐ کا دربار دیکھا'صف نماز کے لئے کھڑی ہوئی تو حضور سرور کائنات نے پوچھا کہ محمد اقبال آیا ہے یا نہیں معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں۔اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی جس کے داڑھی منڈی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا مع ان بزرگ کے صف نماز میں داخل ہو کر حضور سرور کائناتؐ کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا

نہ نام معلوم تھا کشمیر میں ایک بزرگ نجم الدین صاحب ہیں جن کے پاس جا کر میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعے جانتے ہیں گو انہوں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ کو ملوں گا سو محض آپ کی ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہوگئی کیونکہ جو شکل آپ کی میں نے حالت کشف میں دیکھی اس سے سر مو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھے معاً وہ گمنام خط یاد آیا جس کا ذکر میں نے اس خط کی ابتداء میں کیا ہے مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ میں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں جو اس خط میں لکھا تھا آپ مہربانی کر کے اس مشکل کا کوئی علاج بتائیں کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے متعلق میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں ایسا فعل ضرور ہے کہ دعا کا ہی نتیجہ ہو لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میر لئے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے اس کا یا تو کوئی علاج بتائیے یا مزید دعا فرمائیے کہ خدا تعالیٰ اس گرہ کو کھول دے،، 23

خط بھی گمنام تھا اور ملنے کے لئے اتنی دور سے آنے والے پیرزادہ صاحب نے بھی سب کچھ بتا دیا صرف اپنا نام نہیں بتایا۔ پیرزادہ صاحب کو ایک بزرگ نجم الدین صاحب سے رہنمائی ملی۔ پیرزادہ صاحب نے نجم الدین صاحب کے متعلق بھی بات کو مبہم کر دیا اس کا کوئی متعین پتہ نہیں بتایا صرف یہ کہا ''کشمیر میں ایک بزرگ نجم الدین صاحب ہیں اب کشمیر تو بہت بڑا علاقہ ہے اس میں سینکڑوں نجم الدین نکل آتے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ بیان میں اتنا ابہام کیوں آگیا ہے۔ اس طرح کی ایک اور بات بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ اقبال کو شیخ احمد سرہندی (جو مجدد الف ثانی کہلاتے ہیں) سے بھی بڑی عقیدت تھی 1934ء میں یعنی اپنی وفات سے قریباً 4 سال پہلے اقبال شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضر ہوئے یہ پورا واقعہ فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے لکھتے ہیں۔

23 زندہ رود ج 2 ص 135-134

''29 جون 1934ء کی شام کو اقبال سرہند تشریف لے گئے اور شیخ احمد (حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ چودھری محمد حسین، حکیم طاہر الدین، علی بخش اور راقم (جاوید اقبال) ان کے ہمراہ تھے۔ غلام بھیک نیرنگ ان کے پرانے دوست انبالے سے سرہند پہنچے اور اقبال کے ساتھ مزار پر حاضری دی راقم کو خوب یاد ہے کہ وہ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا گنبد کے تیرہ و تار مگر پروقار ماحول نے اس پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی اقبال تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور راقم کو بھی پاس بٹھا لیا پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی رُندھی ہوئی مدھم آواز گونج رہی تھی راقم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راقم کی پیدائش پر اقبال نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ دوسری وجہ کے متعلق انہوں نے اپنے خط مورخہ 29 جون 1934ء میں تحریر کیا۔

''چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان (شام کے معروف دروزی رہنما، اتحاد ممالک اسلامیہ اور احیائے اسلام کے بہت بڑے داعی) کے متعلق دیکھا تھا وہ سرہند بھیج دیا ہے ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے) پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کون ہے اس خواب کی بناء پر وہاں کی حاضری ضروری ہے'' [24]

ہم تو ناشناسان حجلہ معرفت اور نا آشنایان کوئے طریقت میں سے ہیں اس لئے اس طرح کے خیالات رکھنے والے شخص کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں اور اگر کوئی اور ہوتا تو ہم اور آپ بآسانی اس کے لئے تو ہم پرست کا لفظ استعمال کر دیتے مگر یہ معاملہ علامہ اقبال کا ہے ان کے لئے یہ لفظ استعمال کریں تو کئی نازک آبگینے چوٹ کھا سکتے ہیں اس لئے ہم صرف خوش عقیدگی ہی کہہ سکتے ہیں۔ اقبالؒ کی نظم ''خضر راہ'' جو بانگ درا میں شامل ہے 1922ء میں لکھی گئی اور انجمن حمایت اسلام کے جلسہ سالانہ

---

[24] ایضاً ج 3 ص 258 نذیر نیازی کے نام خط مکتوبات اقبال ص 161 پر ہے

منعقدہ 16 اپریل 1922ء کو اقبال نے یہ نظم کوئی بیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی اس نظم کے پیچھے ایک کہانی ہے مگر بے ترتیب سی یا خام سی، خوش عقیدہ عقیدتمندان اقبال اسے بآسانی ترتیب دے سکتے ہیں۔ جو بات علامہ کے ملازم خاص علی بخش کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ خاصی زرخیز ثابت ہو سکتی ہے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''اس کیفیت (کیفیت کی وضاحت ہم آگے لکھیں گے) میں انہیں (اقبال کو) محسوس ہوا کوئی مرد بزرگ ان کے پاس بیٹھا ہے اقبالؔ اس مرد بزرگ سے سوال پوچھتے ہیں اور وہ ان کے ہر سوال کا جواب دیتا جاتا ہے کچھ دیر کے بعد وہ مرد بزرگ اٹھتا ہے اور چل دیتا ہے۔ اس کے رخصت ہونے کے فوراً بعد اقبالؔ نے علی بخش کو آواز دے کر بلایا اور اس مرد بزرگ کے پیچھے دوڑایا تا کہ اسے واپس لے آئے علی بخش کا بیان ہے کہ وہ بیٹھک کے فرش پر لیٹا اس وقت جاگ رہا تھا اور اقبال کو تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سن رہا تھا رات کے تقریباً تین بجے تھے علی بخش تعمیل حکم میں پھرتی سے سیڑھیاں اترا لیکن نچلے دروازہ کو اندر سے مقفل پایا دروازہ کھول کر بازار میں نکلا مگر ہو کا عالم طاری تھا اور بازار کی دونوں طرف دور دور تک اسے کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ [25]

سچ مچ خضر آئے تھے یا اقبال کا واہمہ تھا اس کا فیصلہ کرنے میں خود ڈاکٹر جاوید اقبال تھوڑے تردد کا شکار ہیں شاید ان کا اپنا علم اس کی تائید نہیں کرتا کہ خضر اور اقبال کی ملاقات کو حقیقی طور پر وقوع پذیر ہونے والا کوئی واقعہ تسلیم کریں اس لئے وہ اس کی تاویل کی کوشش کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ ''جن دنوں اقبال نے یہ نظم لکھنی شروع کی ان پر نقرس کے مرض کا شدید حملہ ہوا اور کئی راتیں لگاتار بیداری کے عالم میں گزاریں وہ انارکلی والے مکان کی بیٹھک سے ملحقہ کمرے میں اٹھ آئے تھے'' ذرا آگے چل کر تحریر کرتے ہیں'' سو ظاہر ہے کہ نظم تحریر کرتے وقت کسی مرحلہ پر اقبال حالت سکر سے گزرے کیونکہ وہ بیمار تھے اور شدت درد کا عالم ایسا تھا کہ شعوری طور پر اس پر غالب آسکنا یا حالت صحو برقرار رکھ سکنا غالباً ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا'' [26]

اگر چہ جاوید اقبال نے یہ نہیں بتایا کہ مرض نقرس کے اس شدید حملہ اور درد کی بیقرار کر دینے

---

[25] ایضاً ج 2 ص 259 [26] ایضاً۔ ایضاً

والی حالت سے اچانک اتنی صحت کس طرح مل گئی کہ بیس ہزار کے مجمع میں یہ طویل نظم پڑھ لی ممکن ہے خضر کی ملاقات سے صحت کاملہ وعاجلہ مل گئی ہو۔اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی بے جواب رہتا ہے کہ علی بخش صاف کہتا ہے (روایت جاوید اقبال) ''وہ بیٹھک کے فرش پر لیٹا اس وقت جاگ رہا تھا اور اقبالؔ کو تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سن رہا تھا'' حالت سکر اقبالؔ پر طاری تھی علی بخش پر نہیں علی بخش جاگ رہا تھا وہ اقبال کو کسی کیساتھ باتیں کرتے سن رہا تھا۔علی بخش برسوں اقبال کے پاس ملازم رہا تھا وہ اس کی خلوتوں اور جلوتوں کا ساتھی رہا تھا اگر اقبال خود کلامی کر رہے تھے تو کیا وہ آواز بدل بدل کر بول رہے تھے کہ علی بخش کہتا ہے ''وہ انہیں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سن رہا تھا'' تعجب ہے اس وقت اسے یہ خیال نہ آیا کہ دروازے تو اس نے خود مقفل کئے تھے پھر یہ دوسرا آدمی کدھر سے آ گیا اُسے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے جانا چاہئے تھا اور خاص طور پر اُن دنوں میں جب بقول ڈاکٹر جاوید اقبال ''شدید تنہائی اور ہر طرف سے مخالفت کے سبب انہیں (اقبال کو) شاید اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا تھا[27]

مگر اس وفادار ملازم نے اس کا احساس نہ کیا اور پڑا باتیں سنتا رہا پھر جب اقبال نے اسے بلا کر مرد بزرگ کو واپس بلالانے کا حکم دیا تو اس نے دروازہ کو مقفل پایا پھر بھی اس کی تلاش میں باہر نکل گیا اور اُسے اقبال کے ہوش وحواس کے بجا نہ ہونے کا گمان نہ گزرا، یہ سارے سوالات بے جواب ہیں اور آپ حیران ہونگے کہ اس بدحواسی کے عالم میں اقبال نے اتنی زبردست نظم تخلیق کر لی اور سوال جواب کی اتنی باریکیوں کا خیال رکھا کہ خضر کی زبان کیسی ہونی چاہئے اور اس کی پر حکمت باتوں کا رنگ کیا ہو کہ اس میں شاعرانہ نازک خیالی کا دخل نہ ہو۔ڈاکٹر جاوید اقبال حواشی میں وضاحت کرتے ہیں کہ ''اس واقعہ کا ذکر علی بخش نے راقم سے (یعنی ڈاکٹر جاوید اقبال سے) کیا تھا بعد میں اس قسم کے چند اور واقعات راقم کے اپنے مشاہدہ میں بھی آئے'' گویا علی بخش نے یہ واقعہ صرف ڈاکٹر جاوید اقبال سے بیان کیا علی بخش 2 جنوری 1969ء کو فوت ہو گیا بقول ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود لکھنے کا ارادہ 1975ء میں کیا اور اس کی پہلی جلد 1979ء میں منظر عام پر آئی۔علی بخش کے بعد کوئی بات بھی

---

[27] ایضاً۔ایضاً

اس سے منسوب ہوسکتی ہے ویسے اس کی زندگی میں بھی اس سے کیا کچھ منسوب کر دیا گیا ہوگا؟

شیخ اعجاز احمد، علامہ اقبال کے برادر بزرگ اوران کے محسن شیخ عطا محمد کے فرزند ارجمند ہیں شیخ اعجاز احمد اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''احمدیت'' سے وابستہ ہوگئے اور آخر دم تک احمدی (میرزائی) رہے، احمدی حضرات کا زیادہ کاروبار خوابوں اور مکاشفات پر چلتا ہے اور وہ ان چیزوں پر بہت یقین رکھتے ہیں ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے متذکرہ حاشیہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں، شیخ اعجاز احمد کے خیال میں اقبال کے اس کشف کا تعلق 1910ء سے ہے فرماتے ہیں کہ انارکلی والے مکان میں اقبال رات گئے اشعار قلم بند کرنے کی غرض سے نچلی منزل میں واقع اپنے دفتر میں گئے جب واپس اوپر جانے لگے تو کمرے میں ایک دراز قد، سفید ریش، متبرک صورت بزرگ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے دکھائی دیئے بزرگ نے انہیں ارشاد کیا کہ پانچ سو آدمی تیار کرو اور اتنا کہنے کے بعد غائب ہوگئے چند ماہ بعد جب اقبال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے تو اس واقعہ کا ذکر اپنے والد سے کیا۔ میاں جی نے انہیں کہا میں سمجھتا ہوں تمہیں ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انہیں ''آدمی'' بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھو۔

شیخ اعجاز احمد کی رائے میں اس کشفی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب دراصل مثنوی اسرار خودی تھی لیکن راقم کے خیال میں اسرار خودی کا سبب تخلیق ایک خواب تھا جس میں مولانا رومی نے اقبال کو مثنوی لکھنے کی تلقین کی تھی فقیر سید وحید الدین روز گار فقیر حصہ اول صفحات 115، 116، 117 پر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ وہ کتاب مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' تھی کیونکہ اس کے اشعار کی تعداد 531 ہے اور آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

(ترجمہ: چونکہ حرم میں عقل کی بغاوت سے خطرہ ہے اس لئے میں عشق کی سلطنت سے تازہ فوج تیار کر رہا ہوں)

علاوہ اس کے شیخ اعجاز احمد بیانی ہیں کہ ایک خاتون مضمون نگار کہکشاں ملک کی تحقیق کے

مطابق ''طلوع اسلام'' وہ نظم تھی جو کشفی ہدایت کی تعمیل میں کہی گئی اس خاتون مضمون نگار کی رائے میں یہ واقعہ خود اقبال نے اپنی طویل نظم طلوع اسلام کی تخلیق کے بارے میں بتلایا ہے گو اس بیان کی تائید میں اقبال کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا گیا'' (28)

ہمارے نزدیک ان تردد خیز اختلافات کی کیا ضرورت ہے یہ سب نظمیں ہی کسی سفید ریش مرد بزرگ کی کشفی ملاقات کے بعد لکھی گئی ہونگی جب ایک بار ملاقات ہو سکتی ہے تو بار بار کیوں نہیں ہو سکتی۔

علامہ غلام احمد پرویز کے مشہور مجلّہ ماہنامہ طلوع اسلام لاہور کے مئی 1984ء کے شمارہ میں ایک مضمون کا عنوان ہے ''اب اقبال یہ رہ گیا ہے'' مضمون نگار لکھتے ہیں ''اقبال اکادمی کے مجلّہ بابت جنوری 1984ء کے اقبال نمبر میں۔۔قریب پچاس صفحات پر پھیلا ہوا ایک مقالہ ہے جس کا عنوان ہے ''علامہ اقبال کی عقیدت صوفیائے عظام سے'' اس میں براہ راست اقبال کی طرف یا ان بزرگوں کی طرف جن کا عقیدت مند اقبال کو بتایا گیا ہے ایسے ایسے فوق الفطرت طلسم آفریں قصے منسوب کئے گئے ہیں جن کی روشنی میں وہ (اقبال) کسی مزار کا مجاور دکھائی دیتا ہے'' (29)

یہ ''فوق الفطرت طلسم آفریں قصے'' ہم بیشتر اپنے زیر نظر مقالہ میں سمو چکے ہیں باقی نقل کئے دیتے ہیں۔

''دست غیب کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو ان کے پیر حضرت غوث علی شاہ قلندر نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا تمہارا والد ہمارا دوست تھا ہم تمہیں ایک وظیفہ بتاتے ہیں جب روپیہ کے حصول کی کوئی اور صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں نہ آٹا نہ دال' وظیفہ پڑھا گیا تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے جب تک انہوں نے وظیفہ جاری رکھا پانچ روپے ملتے رہے'' (30)

آگے لکھا ہے ''کرامت کی ایک اور مثال ڈاکٹر صاحب نے سنائی فرمایا سر سید کی طرح ان کے گلے میں بھی رسولی تھی وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی

---

(28) ایضاً ص 305 (29) ماہنامہ طلوع اسلام لاہور مئی 1984 ص 28-27

ہے اس کا کچھ علاج کیا جائے پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی نظر نہیں آتی'' (31)

اب رسولی حقیقت میں غائب ہو چکی تھی آگے چل کر صفحہ 19 پر لکھا ہے حضرت علامہ اقبال خود بھی مستجاب الدعوات تھے اور صاحب کرامت بزرگ تھے ایک دفعہ ان کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر عبدالحمید ملک ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری شادی کو بہت عرصہ گزر چکا ہے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہوں دعا فرمائیں چنانچہ آپ کی دعا سے وہ اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوئے ایک دفعہ حضرت علامہ کی وفات کے بعد وہ بچہ بیمار ہو گیا تو ان کے مزار کی مٹی چٹانے سے اچھا ہو گیا'' (32)

طلوع اسلام کے متذکرۃ الصدر مضمون کے مضمون نگار نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ باتیں علامہ اقبال کے اس دور کی ہیں جب وہ ذہنی ارتقاء کی ابتدائی سٹیجوں میں تھے مگر یہ سراسر خلاف حقیقت تاویل ہے یہ باتیں ان کے اس دور کی ہیں جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے ''فلسفہ عجم'' لکھ کر جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لے چکے تھے اصل میں اقبال ایک بہت بڑے شاعر تو تھے فلسفہ کے طالب علم بھی رہے تھے مگر فلسفی تھے نہ محقق، حیرانی کی انتہا نہیں رہتی جب وہ انتہائی بے سرو پا باتوں پر بغیر تحقیق یقین کر لیتے ہیں اور پھر انہیں آگے بھی پہنچا دیتے ہیں اس سلسلہ میں ہم حضرت علامہ اقبال کا ایک طویل خط نقل کرنے پر مجبور ہیں یہ خط بقول ڈاکٹر جاوید اقبال ''اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کو اس وقت لکھا تھا جب شیخ عطا محمد ریٹائرمنٹ کے بعد شدید بیمار ہوئے اور بیماری کی حالت میں مشکلات یا ذمہ داریوں کے متعلق سوچتے سوچتے اتنے افسردہ ہوئے کہ زندگی سے دل برداشتہ ہو گئے اقبال نے اپنے خط محررہ 28 ستمبر 1922ء میں لکھا۔

''میں آپ کے متعلق دعا کر رہا ہوں انشاء اللہ آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی میں نے جو نسخہ آپ کو بتایا تھا اس پر ضرور روزانہ عمل کیے جایئے۔ اس کی بناء محض فلسفیانہ خیالات پر نہیں بلکہ اس انکشاف پر ہے جو خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے قلب انسانی کے متعلق مجھے عطا فرمایا ہے۔ اگر بعض خیالات آپ کو افسردہ کر رہے ہیں تو ان کو یک قلم دل سے نکال دینا چاہئے خدا تعالیٰ آپ کی تمام

(30) اقبال نمبر شائع کردہ اقبال اکادمی جنوری 1984 ص 15 (31) ایضاً ص 16 (32) ایضاً ص 20-19

مشکلات رفع کر دے گا۔ اور برکت نازل کرے گا اگر آپ زندگی سے دل برداشتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ اپنی صحت کی طرف توجہ کیجئے تا کہ اپنی آنکھوں سے اس زمانہ کا ایک حصہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید سولہ سال ہو گئے جب مجھ کو اس زمانہ کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بار الٰہی اس وقت تک مجھے زندہ رکھ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہوگی۔ آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہو گا کہ ترکوں کو قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہو گیا۔ آبناؤں پر ان کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا ہے البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہو گا۔ جس کا فیصلہ مجلس اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے اس کے صدر غازی انور پاشا ہوں گے اس سے بھی زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد استالین نام ہے۔ لینن جو پہلے صدر تھا بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام قرہ خان ہے ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹکل حلقوں میں بہت اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور ان سب پر طرہ یہ کہ ایشیا میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت اس سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب مسلمانان ایشیاء کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کر کے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام اسلامی ریاستوں سے گزرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہوئے ہیں انہوں نے قرآنی حقائق پر مہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کون کمزور یا طاقتور ہیں جس کو اللہ چاہتا ہے طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے آن کی آن میں تباہ کر دیتا ہے“ (33)

خوابوں کی دنیا میں رہنے والا یہ عظیم شاعر بلاشبہ بہت بڑا شاعر تھا اسے اپنے ان خوابوں پر بھی پختہ یقین تھا کہ اسلام بہت جلد ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لے گا اور وہ اپنے اس خواب کی تائید میں

(33) زندہ رود ج2 ص 265-264

اڑائی جانے والی افواہوں اور گپ شپ پر بھی فوری طور پر یقین کر لیتا تھا کاش اُسے بہت بڑا شاعر ہی سمجھا جاتا۔ اسی میں اس کی حقیقی عظمت تھی مگر ہم نے اس کے سر پر بہت بڑے مفکر، فلاسفر اور محقق کے تاج بھی رکھ دیئے یہ غالباً ہمارا قصور ہے اقبال اپنی کوخوش عقیدگی میں اپنی شاعری میں پیش گوئیاں بھی کیا کرتے تھے 1903ء میں تحریر کردہ ان کی ایک نظم کا معروف شعر ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

آج 2010ء ہے گویا اس پیش گوئی کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اب تک مغربی تہذیب نے تو خودکشی نہیں کی البتہ اقبال کے شاہین اور عقاب خودکش حملے کر کے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو ہلاکتوں سے دوچار کر رہے ہیں اور بے گناہ آبادیوں سے ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

☑

اقبال اور انگریز حکمران

''یوم اقبال'' کے حوالہ سے 1975ء میں روزنامہ ''امروز'' لاہور کے اقبال نمبر کی دس ہزار کاپیاں چھپ چکی تھیں اور باقی چھپ رہی تھیں کہ اچانک ادارہ کے بعض سینئر ارکان کی نظر ایک تحریر پر پڑ گئی پریس میں چھپائی کا کام روک دیا گیا اور ایڈیٹر کی اجازت سے طبع شدہ دس ہزار کاپیاں تلف کر دی گئیں ادارہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا

''علامہ اقبال کی جو عزت اور احترام ہمارے دلوں میں پایا جاتا ہے اس کے سامنے یہ نقصان کوئی حیثیت نہیں رکھتا'' [1]

وہ تحریر کیا تھی؟ جس سے علامہ اقبال کی جلالت شان میں کمی آنے کا خطرہ پیدا ہو گیا اور گورنمنٹ کا ادارہ ''امروز'' نقصان کو اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھنے لگا، وہ ''یادگار'' تحریر 1929ء کی ہے جو حضرت علامہ نے ایک انگریزی سرکار کے خادم ایم بی گوہری کو بطور تصدیق نامہ (سرٹیفکیٹ) لکھ کر دی تھی۔ ایم بی گوہری نے جنگ عظیم اوّل 1914ء میں بطور سپیشل ریکروٹر سرکار برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں علامہ اقبال نے لکھا تھا۔

''تصدیق کی جاتی ہے کہ ایم بی گوہری صاحب نے مختلف حیثیتوں سے گورنمنٹ کی اچھی خدمات سرانجام دی ہیں جن کے لئے ان کے پاس سندات و دستاویزات موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کو پڑھا ہے اور میں یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ وہ اپنی وفادارانہ خدمات کے لئے کسی نوعیت کا اعتراف حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ سب کچھ

---

[1] روزنامہ امروز لاہور 22 اپریل 1975ء اقبال نمبر

اپنے احساس فرائض منصبی کے تحت سرانجام دیا ہے نہ کہ کسی معاوضہ کے حصول کی غرض سے جیسا کہ کئی دیگر آدمیوں نے کیا"

محمد اقبال (کے ایم ایل ای)

بیرسٹرایٹ لاء۔ پی ایچ ڈی۔ ایم اے۔ لاہور" ❷

یہ تھی وہ تحریر جس کے لئے عوام کے لہو سے نچڑے ہوئے سرکاری خزانہ کا نقصان گوارا کر لیا گیا۔ میرے خیال میں تو یہ تحریر کوئی ایسی قیامت خیز نہیں تھی کہ حضرت علامہ کی عزت واحترام کے آبگینہ کو ٹھیس لگ جاتی۔ لیکن ہمارے پرستاران اقبالؔ عقیدت کشی میں کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آتے ہیں انہوں نے علامہ اقبال کا یہ عجیب وغریب امیج ڈھال دیا ہے کہ وہ انگریز دشمنی کے بہت بڑے نقیب تھے اور اُن کی پوری زندگی انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں گزر گئی انہیں آزادی کے مجاہد اعظم کا تاج بھی پہنا دیا گیا ہے اس لئے ان حضرات کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی تمام تحریروں کو برص کے داغوں کی طرح چھپائیں اپنی اس کوشش میں وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح تاریخ کے ساتھ کیسا سفاکانہ مذاق ہو رہا ہے۔

یوں تو مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں علم کے تمام شعبوں میں بے انتہاء پیش رفت کی لیکن کچھ علوم میں خاص طور پر انہوں نے انفرادیت حاصل کر لی ان علوم میں تاریخ بھی ہے۔ صحیح، سچی، بے میل، بے آمیزش انصاف پسندانہ اور تعصب وعقیدت کورانہ سے ماورا تاریخ لکھنے میں ان کا بڑا مقام ہے لیکن افسوس ہے کہ بعد میں یہ معیار قائم نہ رکھا جا سکا۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی اس بدعت کو ہندوستان میں انگریزوں نے رواج دیا اور پھر ہمارے مسلمان مؤرخین نے اس پر بے انتہا ردے چڑھا دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تاریخ کے نام سے جو کچھ موجود ہے وہ دھندلکوں کا ایک ڈھیر ہے جس میں سچائی کی کوئی کرن تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ تاریخ کے ساتھ ہی ظلم نہیں اس شخصیت کے ساتھ بھی ظلم ہے۔ جس پر ہم اپنی عقیدتوں یا تعصبات اور عداوتوں کی چادریں لپیٹ دیتے ہیں اقبال بھی ان ہی مظلوم شخصیات میں سے ایک ہے۔

---

❷ روزنامہ نوائے وقت لاہور اقبال ایڈیشن اپریل 1975ء

قیام پاکستان کے بعد ہمیں چاہئے تھا کہ نئی نسلوں کو حقیقت پسندانہ شعور سے بہرہ ور کرتے تاکہ وہ سچی دانش سے مسلح ہو کر آگے بڑھتیں مگر ستم ناک حقیقت ہے کہ ہم نے جھوٹ کو فروغ دینے میں اور زیادہ مستعدی دکھائی جس آدمی سے ہمیں محبت وعقیدت تھی اُسے دیوتا بنادیا اور جس سے نفرت وعدادت ہوئی اُسے ابلیس لعین ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس کوشش میں ہم نے برسوں پر پھیلا ہوا تاریخ کا ایک پورا باب غائب کردیا۔

انگریز ہندوستان کے سنہرے وسائل پر قابض ہوا تو اُس نے یہاں پر مسلط رہنے کا طویل العہد منصوبہ بنایا۔ اپنے اس منصوبہ کو کامران وباثمر کرنے کے لئے اس نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف المذاہب لوگوں کو آپس میں لڑاتا رہے کیونکہ اگر ان لوگوں میں اتفاق واتحاد کو فروغ ملتا تو وہ غیر ملکی آقاؤں کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریز اپنے منصوبہ میں بہت کامیاب رہے۔ انہوں نے کبھی اپنا وزن ہندوؤں کے پلڑے میں ڈالا کبھی مسلمانوں کو رفاقت کا یقین دلایا اس طرح انہیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کمزور کرتے رہے۔ جس دور میں انہوں نے مسلمانوں کے دل جیت کر انہیں اپنا رفیق ودمساز بنایا اور مسلمان ان کی محبتوں کے گیت گاتے رہے وہ ایک طویل دور تھا مگر جب ہم پاکستان بنانے کی بات شروع کرتے ہیں تو یہ تاثر دیتے ہیں کہ انگریز یہاں آیا ضرور اس نے ہم پر حکومت بھی کی لیکن روز اوّل سے اُسے ہماری مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہماری حریت پسندی نے کبھی اسے قبول نہ کیا تاریخ ہماری تائید نہیں کرتی۔ اس لئے ہم تاریخ کے اس حصہ کو طاق نسیاں میں پھینک دیتے ہیں یہ نئی نسلوں کو گمراہ کرنے والی بات ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ایک طویل دور انگریز کی وفاداری اس کی خوشنودی کے لئے جتن کرنے یا اس کے ساتھ مسالمت اور مدارا میں گزارا ہے مگر چونکہ وہ دور غائب کردیا گیا ہے اس لئے ہمارے ذہنوں میں یہ تصور جڑیں پکڑ گیا ہے کہ ہمارے بزرگ انگریز کے خلاف جہد مسلسل میں سرگرم رہے اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ ایک حریت پسند مجاہد کی طرح گزرا یہی وجہ ہے کہ ہم نے جنہیں ہیرو بنایا ان کے دامن پر ہم انگریز کے ساتھ رواداری کا داغ نہیں دیکھنا چاہتے اور اس سلسلہ میں ہم تاریخ کو قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے اس کی ایک مثال یہ واقعہ ہے، جس کے ذکر سے ہم نے زیر نظر مقالہ شروع کیا ہے۔

اس دور وفاداری یا عہد مسالمت ومدارا میں تو سچے مجاہد بھی انگریزوں کی تحسین کرتے رہے ہیں اقبال کی تو خیر بقول فرزند اقبال کی یہ حالت تھی کہ

''اقبال کا کلام گو خنجر و شمشیر یا تیر و تفنگ کے ذکر سے بھرا پڑا ہے لیکن آپ نے خود زندگی بھر نہ تو کبھی پستول چلائی نہ بندوق اور اگر کبھی چاقو استعمال کیا تو وہ بھی قلم یا پنسل گھڑنے کے غرض سے'' 3

حضرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ کے اخلاص او رللٰہیت میں کسے شک ہے انہوں نے دور دراز آ کر سکھوں کے خلاف تو جہاد کیا مگر انگریزوں کی تحسین کی حضرت شہید کے معتبر ترین سوانح نگار مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں۔

''جب آپ سکھوں پر جہاد کرنے تشریف لئے جاتے تھے کسی شخص نے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے منکر ہیں گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لیں یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے، جواب دیا کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے نہ انگریزوں کا اور نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آ جائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم وتعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرائیں'' 4

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے یہ بھی بتایا ہے کہ جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لیفٹیننٹ گورنر کو ارادہ جہاد کی اطلاع دی جواب ملا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں 5

---

3 زندہ رود ج 1 ص 180 4 سوانح احمدی از مولانا محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ صوفی پرنٹنگ کمپنی منڈی بہاء الدین ص 70 5 ایضاً

سکھوں کو دراز دستیوں پر آمادہ کرنا اور انہیں قوت دینا یہ بھی انگریزوں کا کام تھا میجر باسو نے لکھا ہے ''انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تھا تاکہ وہ سندھیا کا مقابلہ کریں اسی لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہمیشہ انگریزوں سے ملے رہے اور ان کے وفادار رہے'' ❻

اور جب حکومت کی ضروریات بدلیں تو کیا پالیسی اختیار کی گئی میجر باسو لکھتے ہیں۔

''کپتان ایبٹ نے جو ریذیڈنٹ لاہور کا اسسٹنٹ تھا سردار چتر سنگھ کو پے در پے زیادتیوں سے مجبور کر کے مقابلہ پر لایا اور صوبہ ہزارہ کے مسلمانوں میں جن کی آبادی بہت تھی اور جو بڑے جنگ جو تھے روپیہ تقسیم کر کے ان سے کہا کہ سکھوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کئے تھے اس کا تمہیں انتقام لینا چاہئے اس طرح مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا'' ❼

میجر باسو کے یہ اقتباسات ہم نے یہ دکھانے کے لئے درج کئے ہیں کہ انگریز دور دراز سے آ کر یہاں حکومت کر رہے تھے انہوں نے اتنی دور آ کر اتنے بڑے ملک کو زیر تسلط رکھنے کے لئے Divide and Rule (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) کی پالیسی اپنائی تھی اور فی الواقع انہوں نے اس پالیسی کو اس دانشمندی سے چلایا کہ بہت کامیاب رہے۔

سید احمد شہید کی تحریک کے سلسلہ میں کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ انگریزوں کا آلہ کار بن کر چلائی گئی کیونکہ حقیقت میں اس وقت سکھوں کی دراز دستیاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں اور سید صاحب کے رفقاء سچا جذبہ جہاد لے کر مسلمانوں کی دستگیری کو اٹھے تھے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ مزاحمت پیدا نہیں کی بلکہ بعض صورتوں میں تعاون بھی کیا سر سید احمد خان لکھتے ہیں۔

''اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہیں کرنی چاہئے۔ دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی'' ❽

❻ تاریخ میجر باسو ج 2 ص 153 ❼ ایضاً ج 3 ص 245

اسی طرح مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں

''سید صاحب جب یاغستان میں مصروف جہاد تھے تو سات ہزار روپے کی ایک ہنڈی پنجاب میں موصول ہونے پر دیوانی میں دعویٰ کیا جس کی ڈگری دیوانی اور ہائی کورٹ سے ملی'' (9)

سید صاحب اوران کے رفقاء تو یقیناً رضائے خداوندی کے حصول کے لئے جہاد کر رہے تھے لیکن انگریز کس لئے تحریک کو آسانیاں فراہم کر رہا تھا اس کا جواب مولانا جعفر تھانیسری کے ان الفاظ میں ملتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ سرکار اس وقت سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کوئی مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو'' (10)

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں

''قبل اس کے کہ ہم نے پنجاب کا الحاق کیا یہ مجاہدین ہر سال اضلاع انگریزی سے پر جوش دینداروں کو جماعت مجاہدین میں بھرتی کرتے رہتے تھے اور ہم اپنی رعیت کے ان ''مذہبی دیوانوں'' کو ان ''جنونیوں'' کے پاس جانے سے روکنے کے لئے کوئی احتیاط نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ اپنا غصہ سکھوں پر اتارا کرتے تھے سکھوں کی جماعت وہ تھی جو مختلف قوموں (سکھ جتھوں) کا غیر یقینی مجموعہ تھی جو کبھی ہماری دشمن اور کبھی ہماری دوست ہو جاتی تھی صوبہ جات متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار مسٹر نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک حصہ ستھانہ کیمپ کے مجاہدین کے لئے الگ کر کے رکھ لیتے تھے اور انہیں بھجواتے تھے جو لوگ زیادہ بہادر اور جرات مند تھے وہ کچھ عرصہ کے لئے ستھانہ کیمپ جا کر خدمات سرانجام دیتے تھے جس طرح ہندو ملازم اپنے پرکھوں کے شرادھ کے لئے چھٹیاں مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کہ چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انہیں فریضہ جہاد ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے'' (11)

ان تفاصیل سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اگر انگریزوں کی اس حمایت کو اور سید صاحب کے

---

(8) مضمون سرسید بجواب ڈاکٹر ہنٹر مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 8 دسمبر 1871ء (9) سوانح احمدی ص 70

(10) ایضاً ص 139 (11) (Indian Musalmans by Hunter P.20)

انگریزوں کو چھوڑ کر سکھوں سے جہاد کو سید شہید مرحوم کے لئے موجب ننگ و عار نہیں سمجھا جا سکتا تو ایم بی گوہری کے لئے لکھا جانے والا اقبال کا سرٹیفکیٹ ایسا کونسا داغ ندامت تھا جسے دھونے کے لئے ادارہ امروز کا دفتر لرزہ براندام ہوگیا۔

ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سامنے آتی ہے دارالعلوم دیوبند کے بانی تو دیوبند کے ایک نیک نفس انسان قاضی عابد تھے انہوں نے مدرسہ قائم کیا اور پھر مولانا قاسم نانوتوی کو لکھا کہ پڑھانے کے لئے دیوبند تشریف لائیں مولانا قاسم خود تشریف نہ لائے ایک اور عالم ملا محمد محمود کو پندرہ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر کے بھیج دیا مولانا قاسم نانوتوی تو کچھ سال بعد یہاں تشریف لائے مگر ان کو ہی بانی دارالعلوم دیوبند مشہور کر دیا گیا ہے پھر قاری محمد طیب صاحب اور کچھ دوسرے علماء نے مولانا قاسم نانوتوی کے سر پر یہ سہرا بھی سجا دیا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کا نقطہ آغاز تھے۔ جنگ آزادی 1857ء میں انہوں نے بھرپور حصہ لینے کی تحریک کی اور ''شاملی'' کے قصبہ میں انگریزوں کے خلاف جو معمولی سی بغاوت ہوئی اس کے پیچھے بھی مولانا قاسم نانوتوی کا ہاتھ تھا مگر یہ سب غلط ہے۔ علامہ مناظر احسن گیلانی نے اس طرح کی روایات کو ٹھکراتے ہوئے فیصلہ دیا ہے۔

''اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ غدر کا ہنگامہ برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی فسادوں سے کوسوں دور تھے'' (12)

طویل بحث کے بعد ڈاکٹر رشید احمد جالندھری بھی یہی فیصلہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں

''معلوم ہوتا ہے کہ جب بیسویں صدی میں ہندوستان کی فضا آزادی کے نعروں سے گونج اٹھی اور دارالعلوم دیوبند کی بعض ممتاز علمی شخصیتوں نے (مثلاً مولانا محمود حسن مولانا حسین احمد مدنی) برطانوی حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا تو مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی ''سیاسی خدمات'' کا کھوج بھی لگایا گیا اور

(12) سوانح قاسمی از مناظر احسن گیلانی 27 ص 155

ان کی عظمت کا راز ان کی خاموش دینی خدمات میں نہیں بلکہ سیاسی کارناموں میں تلاش کیا گیا چنانچہ سیاسی کارناموں کی تلاش میں تھانہ بھون اور شاملی کے وقتی ہنگاموں کو ''آزادی ہند'' سے متعلق ایک مربوط پروگرام کی کڑیاں قرار دیا گیا چونکہ یہ سب کچھ جوش عقیدت کا کرشمہ تھا اس لئے بات بن نہ پائی ہر چند شاملی کی ''داستان جہاد'' آج بھی پر جوش عقیدت مندوں کے لئے اپنے اندر ایک کشش اور سحر رکھتی ہے لیکن افسوس کہ تاریخ کا واقعہ نہ بن سکی'' (13)

دارالعلوم کے بانی حاجی عابد حسین کے دست و باز و بیشتر وہ لوگ تھے جو برطانوی سرکار کے ملازم رہ چکے تھے مثلاً مولانا فضل الرحمٰن، مولانا ذوالفقار علی، مولانا یعقوب علی وغیرہ'' اس لئے حکومت برطانیہ نے بھی مدرسہ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ بلکہ ایک سرکاری خفیہ رپورٹ میں کہا گیا ''یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں'' بعض رپورٹوں میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں ''یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں ہے'' (14)

اور خلاف سرکار ہوتا بھی کیسے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے نزدیک مرحوم دہلی کالج ہی تھا جس نے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کی شکل میں جنم لیا تھا دہلی کالج کا عربی حصہ مولانا قاسم دیوبند لے گئے اور اس کا انگریزی حصہ سرسید علی گڑھ لے گئے (15)

مولانا قاسم نانوتوی کے صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد دارالعلوم دیوبند کے کافی عرصہ تک ناظم اعلیٰ رہے یوپی حکومت کے سربراہوں سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے اور مولانا محمود حسن کی سیاسی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کرتے رہتے تھے پہلی جنگ عظیم میں مولانا محمود حسن ترک راہنماؤں سے مل کر آزادی ہند سے متعلق جو پروگرام بنانا چاہتے تھے حافظ صاحب موصوف نے مختلف ذرائع سے اس پروگرام کا سراغ لگایا اور اس سے صوبائی گورنر کو آگاہ کر دیا بعد میں حافظ صاحب مرحوم کو ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا گیا حافظ صاحب علماء کا ایک وفد لے کر گورنر سے ملے اور اس کا شکریہ ادا کیا یہ سب کچھ دستاویزات میں موجود ہے کہتے ہیں ان دستاویزات کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حافظ محمد احمد مرحوم

---

(13) دارالعلوم دیوبند ج 1 ص 114 (14) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج 1 ص 180 از سید محبوب رضوی

(15) ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' مرتبہ محمد سرور ص 137

کے عہد تک دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد کے حکومت وقت سے خوشگوار تعلقات تھے اور حافظ صاحب کی ذات نے جنگ کے ہنگامی حالات میں دارالعلوم کو انگریز کے عتاب سے بچائے رکھا [16]

کوئی اور ہوتا تو معلوم نہیں اس کے لئے کیا کچھ کہا جاتا مگر حافظ صاحب مولانا قاسم نانوتوی کے فرزند تھے اس لئے زبانیں گنگ اور قلم پتھر رہے۔ بہرحال یہ دارالعلوم دیوبند کی بات تھی اس سلسلہ میں دیوبند ہی کے ایک اور صاحب محمد رفیع لکھتے ہیں۔

''ہر مومن مسلمان سے استدعا ہے کہ وہ گورنمنٹ عالیہ کے لئے کہ جس کے عہد حکومت میں ہر فرد بشر نہایت عیش آرام سے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کی عطا کردہ آزادی کی بدولت اسلامی چمنستان سرسبز و بارآور ہے ضرور بالضرور دن اور رات، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے غرض ہر لحظہ اور ہر ساعت دعا کریں۔ اے خدا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انہیں مسند حکومت پر حکمران وقائم رکھ'' [17]

مولانا قاسم نانوتوی کے دست راست اور عزیز خاص حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے فتویٰ دیا تھا ''جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ملک حبشہ میں جو مقبوضہ نصاریٰ تھا بھیج دیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ کسی مذہب میں دست اندازی نہیں کرتے تھے۔ اور جب مسلمان رعایا بن کر ہندوستان میں رہے اور حکام سے عہد و پیمان کر چکے کہ کسی حاکم یا رعایا و حکام کے جان و مال میں دست اندازی نہیں کریں گے اور کوئی امر خلاف اطاعت نہیں کریں گے تو مسلمانوں کو خلاف عہد پیمان کرنا یا کسی قسم کی خیانت ومخالف حکام کرنا ہرگز درست نہیں عہد کے پورا کرنے کی مسلمانوں کے مذہب میں اس قدر تاکید ہے کہ شاید ہی دوسرے مذہب میں ہو'' [18]

دارالعلوم دیوبند کے بعد مذہبی علوم کی تدریس کے لئے جو دوسرا بڑا ادارہ قائم ہوا تھا وہ ''ندوۃ العلماء'' تھا اس کے افتتاحی اجلاس کا پورا منظر نامہ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کے ماہوار رسالہ ''الندوہ'' دسمبر 1908ء میں چھپا تھا اسے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے مرتب کیا تھا

---

[16] ہندوستانی مسلمان ایک دستاویزی ریکارڈ ج 5 ص 54-53 [17] رسالہ ''دیوبند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ ''مطبوعہ پرنٹنگ ورکس دہلی یکم ستمبر 1917ء [18] پیسہ اخبار لاہور 11 مئی 1918ء

اس کے چند اقتباسات دیکھئے ''ہزانر لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے منظور فرمایا تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے یہ تقریب 28 نومبر 1908ء کو عمل میں آئی۔ معزز شرکائے جلسہ میں علماء میں سے مولوی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواری مولوی مسیح الزمان خان صاحب استاذ حضور نظام اور ارباب وجاہت میں سے جناب آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، شیخ عبدالقادر بیرسٹر، خان بہادر سید جعفر حسین صاحب سیکرٹری صاحب انجمن حمایت اسلام جلسہ میں شریک تھے۔

ارکان انتظامیہ، ہزآنر کے استقبال کے لئے لب فرش دورویہ صف باندھے کھڑے ہوئے کمشنر صاحب لکھنؤ نے سیکرٹری دارالعلوم شبلی نعمانی کو لیفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا۔ ہزآنر سرخ بانات کے خیمہ میں لیڈی صاحبہ کے ساتھ چاندی کی کرسی پر رونق افروز ہوئے'' ص 3,2

''الندوہ کا سنگ بنیاد دارالعلوم ندوۃ العلماء حیرت انگیز عظیم الشان جلسہ''

اس عنوان کے تحت علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں۔

''ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دلفریبیاں بارہا دیکھی ہیں، جاہ وجلال کا منظر بھی اکثر نظر سے گزرا ہے۔ کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش وخروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں وعظ وپند کے پراثر جلسے بھی ہم کو متاثر کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا وہ ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرت انگیز تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آرہے تھے یہ پہلا موقع تھا کہ مقدس علمائے اسلام، عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکرگزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جارہا تھا

مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا (ص 2,1)

عربی استقبالیہ میں کہا گیا ''مذہبی رواداری حکومت انگریزی کا خاصہ ہے (ص 4) ہم اس یقین پر قائم ہیں جیسا کہ ان کی وفاداری مسلم ہے یہاں سے پیدا ہونے والے علماء کے ذریعے سے وہ حکومت کی اطاعت اور فرماں برداری میں زیادہ ہوجائیں گے۔ ہزآنر نے ایڈریس کے جواب میں جو سپیچ دی اس کا ایک ایک حرف ندوہ کے لئے آب حیات ہے'' [19]

یہ تو تھی مسلمانوں کی دو بڑی مذہبی درسگاہوں کی حالت' علماء نے وقتاً فوقتاً انفرادی طور پر انگریزی حکومت کے حق میں جو کچھ کیا ہم اس کی تفاصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف چند لوگوں کے چند الفاظ ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

پہلے اہلحدیث حضرات کے معروف ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا یہ اقتباس دیکھئے

''مسلمانوں کے دو عظیم فرقوں احناف اور شیعہ نے اسے (انگریز حکومت کو) کامل وفاداری کا یقین دلایا اور گورنمنٹ بھی ان دونوں فرقوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوگئی اور یہ سب کچھ 1870ء سے پہلے ہو چکا تھا'' [20]

مگر خود اہل حدیث بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اس زمانہ کے مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی جو ماہنامہ ''اشاعت السنّت'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور ایڈووکیٹ بھی تھے انہوں نے لکھا۔

''ملکہ معظمہ اور اس کی سلطنت کے لئے دعائے سلامتی وحفاظت وبرکت وعلی ہذہ القیاس ان امور سے کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کے جواز پر شریعت کی شہادت نہ پائی جاتی ہو'' [21]

اُس زمانہ میں اہل حدیث فرقہ کے لئے ''وہابی'' کا لفظ استعمال ہونے لگا تھا اس لفظ کو حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دیئے جانے کے لئے مولانا محمد حسین بٹالوی نے درخواست دی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا

''میں آپ کی خدمت میں سطور ذیل کو پیش کرنے کی اجازت ومعافی کا خواستگار ہوں جناب من الفظ ''وہابی'' جس کو عموماً ''باغی ونمک حرام'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس لفظ کا استعمال مسلمانان ہندوستان کے اس گروہ کے حق میں جو اہل حدیث کہلاتا ہے مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سے سرکار کے نمک حلال وخیر خواہ رہے ہیں اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور سرکاری خط وکتابت میں تسلیم کی جا چکی ہے پس اس فرقہ کے لوگ اپنے حق میں اس لفظ کے استعمال پر سخت اعتراض کرتے ہیں اور کمال ادب وانکسار کے ساتھ گورنمنٹ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس لفظ کے استعمال سے

---

[19] رسالہ الندوہ دسمبر 1908۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کو گورنمنٹ کی طرف سے 6 ہزار روپے سالانہ امداد بھی ملتی تھی

[20] ہفت روزہ ''الاعتصام'' 9 اکتوبر 1970ء [21] اشاعت السنّت جلد نمبر 10 شمارہ نمبر 1 جنوری 1888ء

ممانعت کا حکم صادر کرے''[22]

مولانا بٹالوی کی یہ درخواست 1888ء میں منظور ہوئی اور مختلف صوبائی گورنروں کی طرف سے احکامات صادر ہو گئے[23]

اسی درخواست کا حوالہ دیتے ہوئے سر سید مرحوم نے لکھا تھا۔

''انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں اس فرقہ کے لئے جو 'وہابی'' کہلاتا ہے ایک رحمت ہے۔ جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں ان میں بھی ''وہابیوں'' کو ایسی آزادی مذہب ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے سلطان کی عمل داری میں ''وہابی'' کا رہنا مشکل ہے اور اگر مکہ معظمہ میں تو جھوٹ موٹ سے وہابی کہہ دے تو اسی وقت جیل جائے تمام مسلمانوں کو مولوی محمد حسین بٹالوی کا ممنون ہونا چاہئے (کہ انہوں نے یہ کاوش کی)''[24]

شیعہ حضرات کی طرف سے عقیدت کا یہ اعلان نامہ شائع ہوا تھا

''شیعہ بھائیوں کی عقیدت

(ایڈریس بنام گورنر آگرہ و اودھ)

ہم اپنی باوقار جماعت کا حق ادا کرتے ہوئے تمام ہندوستان کے اہل تشیع عزم بالجزم اور ارادہ مصمم و کامل مستعدی کے ساتھ اپنی جان و مال، اپنے عزیز و اقارب، اپنی اور اپنی اولادوں کی جانوں کو حضور شہنشاہ برطانیہ و ہند اور اپنی گورنمنٹ کو پیش کرتے ہیں''[25]

علمائے اسلام میں سے ہم مولانا شمس العلماء سید میر حسن کی رائے نقل کرتے ہیں مگر اس سے پہلے ہم ان کے لئے لکھے ہوئے وہ جملے نقل کرتے ہیں جنہیں فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

---

[22] اشاعت السنّت جلد 8 شمارہ چھ 1886ء [23] مثلاً دیکھئے گورنمنٹ بمبئی کا حکم نامہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نمبر 5722 مورخہ 24 اگست 1888ء دستخط ڈبلیو لی وانر اور گورنمنٹ مدراس کا حکم نامہ چٹھی نمبر 1237 مورخہ 28 جولائی 1888ء دستخط بی ایف پرائس وغیرہ [24] مقالات سرسید ج 9 ص 211 [25] ''پیسہ اخبار'' 11 اپریل 1918ء ص 5

''اقبال کے والد شیخ نور محمد خود بڑے دیندار اور پارسا مسلمان تھے (لیکن وہ) ہر دینی یا دنیوی مسئلہ میں مولانا سید میر حسن سے رجوع کیا کرتے تھے اور اقبال انہیں اپنا استاذ اور مرشد تسلیم کرتے ہوئے ان کی بے حد عزت کرتے تھے'' (26)

علامہ اقبال نے اظہار عقیدت کرتے ہوئے اپنے اس استاذ محترم کے لئے کہا۔

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

علامہ اقبال نے

''سید میر حسن کی وفات پر مادۂ تاریخ نکالا ''وَمَآاَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ'' (27)

ان ہی مولانا میر حسن نے انگریزی حکومت کی اطاعت کے متعلق جو فتویٰ دیا اس کا ایک حصہ درج ذیل ہے'' رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر نعمت کا شکر کرنے کی تعلیم فرمائی ہے اور اپنے حکام وقت کی اطاعت اور فرماں برداری کی ہدایت فرمائی ہے پس جب ہم حکام وقت کی اطاعت کریں اور اس نعمت عظمیٰ کا شکر کریں تو ہم اپنے پاک رسول صلعم کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔۔ ہمارے شفیع ورہنما حضرت رسول مقبول صلعم عادل بادشاہ کو ''ظل اللہ'' کے لفظ سے تعبیر فرماتے ہیں اور عادل بادشاہ کے زمانہ میں جو مذہباً مجوسی تھا اپنے پیدا ہونے پر فخر کرتے ہیں اور **لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس** (جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرتا) فرما کر انسان کے شکر گزار کو خدا کا شکر گزار ثابت کرتے ہیں تو ہم کو اپنی مہربان عادل علیا حضرت قیصرۂ ہند (ملکہ وکٹوریہ) کے وجود باوجود کو نعمت الٰہی سمجھنا اور اس کے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ کرنا اور اس کے عہد میں پیدا ہونے پر فخر کرنا اور اس کے زیر سایہ امن کے ساتھ رہنے کا شکر ادا کرنا' موجب سعادت دارین ہے'' (28)

ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال کہتے ہیں ''اقبال سرسید کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے'' (29)

سرسید اور برطانوی حکومت کے تعلقات پر کچھ کہنے کی ضرورت تو نہیں لیکن پھر بھی بات کو زیادہ

---

(26) زندہ رود ج 3 ص 574 (27) ایضاً ج 1 ص 62 (28) ''شمس العلماء مولانا سید میر حسن کے حیات وافکار'' شائع کردہ اقبال کیڈیمی پاکستان۔ بحوالہ روئداد جلسہ عام 1897ء ص 80-79 (29) زندہ رود ج 3 ص 584

منقح کرنے کے لئے ہم ان کے کچھ اقتباسات درج کرتے ہیں۔ سر سید فرماتے ہیں۔

''وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی اور اسے ایک شوہر کی ضرورت تھی اس لئے خود اس نے انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تا کہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (دائمی) رہے ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے ملک کے لئے ہے'' (30)

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

''میں نے گورنمنٹ کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ میں نے اپنے پاک مذہب اور سچے ہادی کے حکم کی تعمیل کی ہے ہمارے سچے ہادی نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ تم جس گورنمنٹ کے امن میں ہو اس کی اطاعت کرو اس کے خیر خواہ اور وفادار رہو پس جو کچھ کہ گورنمنٹ کی خدمت مجھ سے ہوئی ہے وہ حقیقت میں میرے مذہب کی خدمت تھی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے پیشوا نے کیا کہا تھا اس نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ حاکم وقت بادشاہ وقت کی اطاعت کرو ''ولو کان حبشیا'' پس آپ خیال کیجئے کہ جب ہم کو ایک کالے منہ کے غلام بادشاہ کی اطاعت کی ہدایت کی گئی ہے تو ہم ان گورے منہ والے حاکموں کی اطاعت سے کیوں منہ پھیریں'' (31)

سر سید کے یہ بیانات ان کی ''نمائشی سیاست'' کا یونہی سا اظہار نہیں تھے بلکہ یہ سب کچھ وہ پورے خلوص قلب سے کہہ رہے تھے چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

''مرزا (غلام احمد قادیانی) صاحب نے جو اشتہار 1897ء کو جاری کیا ہے اس اشتہار میں مرزا صاحب نے ایک لطیف عمدہ فقرہ گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری کی نسبت لکھا ہے ہمارے نزدیک ہر مسلمان کو جو گورنمنٹ انگریز کی رعیت ہے ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ مرزا صاحب نے لکھا

---

(30) سر سید احمد خاں کی کہانی سر سید احمد خاں کی زبانی از الطاف حسین حالی مولفہ ضیاء الدین لاہوری ص 71

(31) سر سید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب ص 65 شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور

ہے اس لئے ہم اس کو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں

''اے نادانو! گورنمنٹ انگریزی کی تعریف تمہاری طرح میری قلم سے منافقانہ نہیں نکلتی وہ لوگ سخت نمک حرام ہیں جو حکام انگریزی کے روبرو خوشامد کرتے ہیں اور ان کے آگے گرتے ہیں اور پھر گھر آکر کہتے ہیں کہ جو شخص اس گورنمنٹ کا شکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ ہماری یہ کارروائی جو اس گورنمنٹ کی نسبت کی جاتی ہے منافقانہ نہیں لعنۃ اللہ علی المنافقین جبکہ ہمارا یہی عقیدہ ہے جو ہمارے دل میں ہے'' [32]

مذہبی مدارس اور علماء کی انگریز حکمرانوں سے عقیدتمندیاں آپ نے دیکھ لیں اب ہم مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے قیام کا مقصد معلوم کرنا چاہتے ہیں تا کہ مذہبی رہنمائی کے بعد سیاسی رہنمائی بھی واضح ہو جائے۔ 30 دسمبر 1906ء کو نواب وقار الملک کی صدارات میں وہ سیاسی جلسہ منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے عمائدین سیاست نے ''آل انڈیا مسلم لیگ'' قائم کی نواب وقار الملک بہادر آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے انہوں نے 23 مارچ 1907ء کو علی گڑھ میں مسلم لیگ کے قیام کے اسباب و مقاصد واضح کرتے ہوئے فرمایا۔

''ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس (1/5) ہے۔ اب اگر کسی وقت ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا۔ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا اور اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندوستان کی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم وملزوم ہیں انگریزوں کے بغیر ہم عزت و آسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر مسلمان دل سے انگریزوں کے ساتھ ہیں تو ہندوستان سے ان کو کوئی نہیں نکال سکتا ان مسلمانوں کو اس عمدہ خیال کی تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے تئیں مثلاً ایک انگریزی فوج کے تصور کریں اور تاج

[32] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تہذیب الاخلاق 24 جولائی 1897ء

برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کرنے اور اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہیں اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق نہایت ادب اور متانت سے طلب کریں نہ کہ اس طریقہ پر جس پر ہمارے دیگر ابنائے وطن (انڈین نیشنل کانگریس) کا عمل ہے اور اس سے میری مراد ایجی ٹیشن کے طریقہ سے ہے پس تمہارے دل میں ہر وقت یہی ایک خیال موجزن رہنا چاہئے کہ اس سلطنت کی حمایت کرنا تمہارا قومی فرض ہے تم فٹ بال کے کھیلنے میں مشغول ہو یا کرکٹ کے میدان میں کود پھاند کر رہے ہو یا ٹینس کے کھیلنے میں سرگرمی دکھار ہے ہو غرضیکہ اس قسم کی ہر ایک حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمہارے سروں پر لہرا رہا ہے۔ تم یقین کرو کہ تمہاری یہ دوڑ دھوپ اس لئے ہے کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر (اگر اس کی ضرورت ہو) اپنی جانیں نثار کر دو اور انگریزی سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس سلطنت کے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ کلہ بکلہ لڑو۔ اگر یہ خیال تم نے ذہن نشین رکھا تو مجھ کو امید ہے کہ تم اپنی قوم کے لئے باعث فخر ہو گے اور آئندہ نسلیں تمہاری شکر گزار ہوں گی اور تمہارا نام ہندوستان کی انگریزی حکومت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا'' (33)

یہ تھا ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا آغاز' اور یہ تھا مسلم لیگ کے قیام کا مقصد' سیاست کے بعد اب ہم صحافت پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کا صحافت میں بھی اور سیاست میں بھی امتیازی مقام ہے اس وقت ان کے مشہور اخبار ''زمیندار'' کے سرنامہ کی فوٹو سٹیٹ میرے سامنے ہے اور پر جلی قلم سے لکھا ہوا ہے ''روزانہ زمیندار'' اس کے دائیں طرف ''تاج'' بنا ہوا ہے اور بائیں طرف ''ستارہ وہلال'' ہیں ''تاج'' کے نیچے یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

اور ''ستارہ وہلال'' کے نیچے علامہ اقبال کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشان ہمارا

(33) مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری رجسٹرار علی گڑھ یونیورسٹی ص 288-287

نیچے لکھا ہوا ہے ''ایڈیٹر ظفر علی خان بی اے (علیگ) اس سے نچلی لائین پر اخبارات کی روایت کے مطابق تاریخ لکھی ہوئی ہے ''لاہور یوم جمعہ 18 ربیع الاوّل 1330ھ مطابق 8 مارچ 1912ء'' میرا خیال ہے سب کچھ واضح ہے اس پر مجھے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اس وقت مسلمانوں کا ایک مشہور اخبار پیسہ اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم تھے۔ انارکلی بازار میں ایک تنگ سی گلی نکلتی ہے اس میں اس اخبار کا دفتر تھا۔ اسے آج بھی ''پیسہ اخبار بلڈنگ'' کہتے ہیں اور اس گلی کا نام آج بھی ''پیسہ اخبار سٹریٹ'' ہے اسی ''پیسہ اخبار'' کے ایک اداریہ کے یہ الفاظ دیکھئے

''اہل اسلام دس کروڑ سے زیادہ شہنشاہ جارج کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں یہ تعداد مسلمانوں کی ترکی، ایران، افغانستان کی تین سب سے بڑی مسلمان حکومتوں کے باشندوں سے بڑھی ہوئی ہے اور اسی بناء پر برٹش ایمپائر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہلاتی ہے''[34]

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت ''پیسہ اخبار'' اسلامیان ہند خصوصاً شمالی ہند کے مسلمانوں کی زبان اور ان کے دلوں کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ اب اسی ''پیسہ اخبار'' کا جنگ عظیم اول کے بعد کا ایک ایڈیٹوریل نوٹ دیکھئے ''پیسہ اخبار'' مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔

''لندن کے اخبار ''ڈیلی گریفک'' میں ''جنگ عظیم اوّل میں عالم اسلام کا شاندار ریکارڈ'' کے عنوان کے تحت ایک دلچسپ مضمون میں مسٹر ''ایف اے ڈی وی آر'' نے دنیا کے مسلمانوں کی ان شاندار خدمات کے لئے خراج تحسین ادا کیا ہے جو انہوں نے جنگ عظیم میں دول متحدہ کی' کی ہیں۔ شاید جنگ کا دوسرا سال جا رہا تھا ''پیسہ اخبار'' نے ایک لیڈنگ آرٹیکل میں اسی عنوان پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ دنیا کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا حصہ سوائے ترکوں کے قریباً تمام مسلمان دول متحدہ کی حمایت میں لڑ رہے ہیں۔ انگلستان، فرانس، روس، اٹلی وغیرہ کے ماتحت دنیا کے مسلمانوں کا جزو اعظم آباد تھا کہ جو اپنی اپنی سلطنتوں کی تعمیل حکم وفاداری سے کر رہا تھا۔ ان کے علاوہ راقم الحروف (مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار) نے لندن میں جزلسٹس انسٹی ٹیوٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بھی بتلا دیا تھا کہ دنیا کے مسلمانوں کا جزو اعظم اتحادیوں کی طرف سے لڑتا رہا ہے۔

---

[34] روزنامہ ''پیسہ اخبار'' 22 جون 1911ء

چنانچہ آج اس ''ڈیلی گریفک'' کے مضمون میں ''پیسہ اخبار'' کے اسی خیال کی تائید کی گئی ہے ''اخبار گریفک'' موجودہ جنگ (1918ء) کے حوالہ سے لکھتا ہے۔ایک لحہ کے غور کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانان عالم کا بڑا حصہ اتحادیوں کا طرف دار تھا چھ کروڑ مسلمانان ہندوستان شاہ جارج قیصر ہند کے دلی وفادار ہیں جو اس وقت قیصر کے نام والا اکیلا تاجدار جنگ کے بعد رہ گیا ہے۔ پنجاب کے مسلمان اور صوبہ سرحد شمال مغربی کے پٹھان سب سے زیادہ بہادر سپاہی تھے 15-1914ء میں پہلا ہندوستانی، وکٹوریہ کراس کا تمغہ پانے والے ایک مسلمان حوالدار خداداد خان نامی تھا اور دوسری جنگ عظیم میں بھی اعلیٰ انعام بہادری (یعنی تمغہ وکٹوریہ کراس) ایک پٹھان جمعدار میر دوست محمد نے حاصل کیا پٹھان اور پنجابی مسلمانوں کی وہ دھوم اخبارات میں نہیں مچائی گئی جیسی کہ سکھوں اور گورکھوں کی مچائی گئی وہ حریفوں سے کچھ کم بہادر نہیں تھے۔ (آگے کی سطروں میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے ترکی کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دیا) فی الجملہ تمام عالم اسلام میں سے ترکی نے ہی دشمن کی تائید کی اس لئے اسلام کو اپنے ریکارڈ پر نازاں ہونا چاہئے'' یہاں تک ''ڈیلی گریفک'' کے مضمون کا ترجمہ ہے جو پیسہ اخبار کی رائے کی پوری تائید کرتا ہے'' [35]

یہ رہی ایک دور میں ہماری صحافت اب ہم شعروادب پر انگریز کی وفاداری کے جذبوں کا ہلکا سا پرتو پیش کرتے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابتداء سے ہی ہمارا ادب زندگی سے دور ہو گیا تھا۔ انگریز کے آنے کے بعد اگر ہماری شاعری پر انگریزی ادب کا کچھ اثر پڑا تو وہ یہ تھا کہ ہم غزل کی وادی عارض وگیسو سے نکل کر نظم کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ نظم مناظر فطرت کی تصویر کشی تک محدود ہو گئی زندگی اور معاشرت سے اس کی ہم آہنگی کی صورت بہت کم پیدا ہوئی۔ میرے نزدیک اردو ادب میں سب سے بڑا شاعر غالب ہے غالب بلاشبہ ایک بہت بڑا فلسفی اور حکمت پرور شاعر تھا وہ بھی انگریزوں سے متاثر ہوا مگر اس کی یہ اثر پذیری بڑی ہی مثبت تھی۔

1855ء میں سرسید احمد خان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرتے ہوئے سترہ سال گزر چکے تھے مگر ان کی سوچ وہی قدامت پرستانہ تھی انہیں ابوالفضل کی مشہور کتاب آئین اکبری کا قلمی نسخہ ہاتھ آیا

---

[35] روزنامہ ''پیسہ اخبار'' 25 فروری 1919ء

اس کے بوسیدہ اوراق کہیں کہیں سے کچھ کٹے پھٹے تھے سرسید نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس کی نقل تیار کی جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں اپنی طرف سے ابوالفضل کے رنگ میں نثر لکھ کر عبارات مکمل کیں اب وہ اسے طبع کرانا چاہتے تھے انہوں نے تقریظ لکھنے کے لئے یہ کتاب مرزا غالبؔ کے سپرد کی مرزا غالبؔ نے حکیمانہ فارسی اشعار میں اپنی رائے دی انہوں نے سرسید کی ہمت عالی، انکی محنت اور ذہنی کاوش کی داد دی مگر ساتھ ہی یہ کہا کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ محض وقت کا ضیاع ہے اور ان کی ہمت عالی کے لئے باعث عار ہے انہیں قدامت پرستی کی راہ چھوڑ کر جدت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اکبر اعظم کا آئین ان کے وقت میں بہتر اور قابل تعریف تھا مگر اب زمانہ بدل گیا ہے اب ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں سرسید کو انگریزوں کی دانش کی طرف متوجہ ہونا چاہئے ان کی سائنسی ایجادات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے ان کے آئین وضوابط کو دیکھنا چاہئے اور جدید علوم کی ترویج کی طرف دھیان دینا چاہئے انہوں نے آئین اکبری کے سلسلہ میں جو کاوش کی اس مشغلہ سے انہوں نے اپنا دل تو شاد کرلیا مگر میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں اس لئے ان کے کام کی تحسین نہیں کرسکتا سرسید جیسے دیدہ ور کو آنکھیں کھول کر جدید دور کا مطالعہ کرنا چاہئے اس نظم کے ابتدائیہ میں غالب نے کہا۔

صاحبان انگلستان را نگر
شیوہ و انداز ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنر منداں ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشنیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن
کس نیا رد ملک بہ زیں داشتن
دادو دانش راہبم پیوستہ اند
ہندرا صد گونہ آئیں بستہ اند

(ترجمہ: انگریزوں کو اوران کے انداز و اطوار کو دیکھ یہی وہ ہنر مند لوگ ہیں جن سے ہنر کا وقار بلند ہوا یہ تمام پچھلے لوگوں پر سبقت لے گئے آئین و دستور کی پاسبانی ان لوگوں کا حق ہے کسی اور کو ان سے بہتر ملک چلانا نہیں آتا انہیں نے عدل اور دانائی کو باہم ملا دیا ہے اور ہندوستان کو سوگنا سرزمین آئین بنا دیا ہے)

اس کے بعد سائنسی ایجادات کا تذکرہ کیا ہے بھاپ کی قوت سے انجن چلانا وائرلیس وغیرہ کا ذکر ہے اور آخر میں جا کر کہتے ہیں

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم پار

(آج کے دور میں جو آئین ہمارے سامنے ہے اس کے مقابلہ میں دوسرے آئین پرانے کیلنڈروں کی طرح بے کار ہو گئے ہیں)

ہست اے فرزانہ بیدار مغز ؟
در کتاب ایں گونہ آئیں ہائے نغز

(اے بیدار مغز دانشور کیا اس کتاب (آئین اکبری) میں بھی ایسی دانائی کے آئین ہیں؟)

چوں چنیں گنج گہر بیند کسے
خوشہ از خرمن چرا چیند کسے

(جب سامنے موتیوں سے بھرپور خزانے پڑے ہوں تو کھلیان سے ایک بالی کیوں چنی جائے)

آخر میں کتنی خوبصورت ضرب لگائی ہے۔

مردہ پرور دن مبارک کار نیست
خود بگوکاں نیز جز گفتار نیست

(مردے پالنا کوئی اچھا مشغلہ نہیں تم خود ہی کہو کیا یہ (آئین اکبری) سب باتیں ہی باتیں نہیں ہیں؟)

اس طویل مثنوی میں انگریزوں کے تمدن اور رہن سہن سے مرعوبیت کی کوئی بات نہیں اس میں اگر کچھ ہے تو قرآن حکیم کی اسی بات کی تصدیق ہے کہ وَمَنْ یُّوْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (جسے حکمت ودانائی دی گئی اُسے خیر کثیر عطا کر دی گئی) (القران الحکیم)

اور جس انداز میں مرزا غالبؔ نے سرسید احمد خان کو تعلیم دی ہے وہ دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس فرمان کی تعمیل واشاعت ہے جس میں انہوں نے فرمایا

''حکمت ودانائی مؤمن کی گم شدہ چیز ہے پس اسے جہاں نظر آئے اُسے چاہئے کہ اسے جھپٹ کر اپنا لے'' (مفقق علیہ) فی الواقع مرزا غالب کی یہ مثنوی جس کا کوئی چرچا نہیں کیا گیا ایک عظیم سنگ میل ہے سرسید احمد خان نے اس تنقیدی نظم کو اپنی کتاب میں تو جگہ نہ دی لیکن ان کی باقی زندگی میں یہ نظم ان کے لئے نشان منزل بن گئی سچی بات تو یہ ہے کہ مرزا غالب کے عظیم شاگرد مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی انقلاب آفریں کتاب ''مثنوی مدوجزر اسلام'' المعروف بہ ''مسدس حالی'' غالب کی اسی مثنوی سے متاثر ہو کر لکھی ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' جدید علوم کی طرف توجہ دے کر اور عصری شعور اپنا کر ہی مسلمان قوم اپنی کھوئی ہوئی عظمت واپس لا سکتی تھی مگر افسوس کہ خود سرسید نے زندگی کے آخری دور میں اپنے ابتدائی افکار سے روگردانی کر لی اور بات حکمت مغرب سے استفادہ کرنے تک نہیں رہی۔ انگریزوں پر محبت وعقیدت نچھاور کرنے اور پرستش کی حد تک انہیں قبول کرنے تک پہنچ گئی۔ اس طرح شعر وادب میں بھی یہی رویے درائے ذرا ہمارے شعراء میں سے چند ایک کے انداز ملاحظہ فرمائیے۔

مسدس حالیؔ لکھنے والے مولانا الطاف حسین حالیؔ نے 1887ء میں جو قصیدہ انگریز حکومت کی شان میں لکھا اور جسے انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک سپاسنامہ کے ساتھ ملکہ وکٹوریہ کو پیش کیا اس کے چند اشعار دیکھئے۔

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
احساں مگر اسلام پہ ہیں اس کے گراں تر

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجئے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لئے اور نہ دفتر
قیصر کے گھرانوں پہ رہے سایہ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایہ قیصر

(36)

اسی طرح کے ایک قصیدہ دعائیہ میں ایک اور شاعر جناب صغیر بلگرامی ارشاد فرماتے ہیں۔

جہاں تک گل پہ بلبل ہو فدا' گل میں رہے خوشبو
جہاں تک پیچ سنبل میں ہے، سنبل صورت گیسو
جہاں تک دن کی شب ہو، باغ میں شب کو کھلے شبو
جہاں تک راستی ہو سرد میں اور سرد ہو دل جو
مبارک جشن جوبلی قیصر ہندوستاں کو ہو
خوشی اسی کی صغیر طالب اردو زباں کو ہو

(37)

1901ء میں ملکہ وکٹوریہ فوت ہوگئیں ان کی وفات پر مولانا الطاف حسین حالی نے بھی ایک پر درد مرثیہ لکھا جس میں حدیث نبوی کو بنیاد بنا کر جو شعر لکھا گیا وہ یہ تھا۔

شکر بندوں کا خدا کے جو نہیں کرتے ادا
وہ نہیں لاتے بجا شکر خدائے ذوالجلال

(38)

اسی طرح کا ایک مرثیہ انجمن حمایت اسلام کے ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر منعقدہ اجلاس میں پڑھا گیا اس میں ملکہ کو ''ظل اللہ'' اور ظل سبحانی کہا گیا اس جلسہ کی صدارت شمس العلماء مولانا مفتی

---

(36) کلیات نظم حالی ج 1 ص 270 (37) در مدح شاہ انگلستان بر موقع جشن جوبلی 1887 مشمولہ کتاب ''تحفہ جوبلی'' از منشی عبدالکریم ص 128 (38) رسالہ ''معارف'' پانی پت جنوری 1901 مرثیہ ملکہ وکٹوریہ

عبداللہ ٹونکی نے کی تھی اس مرثیہ کے پڑھے گئے چند اشعار یہ تھے۔

کر گئیں رحلت جہاں سے آسماں پر ہائے ہائے
دے گئیں صدمہ دلِ اہلِ جہاں پر ہائے ہائے
باادب یوں ہیں کھڑے سب لاش شاہنشاہ پاس
جس طرح مدھم ستارے صبح دم ہوں ماہ پاس
سایہ حق ہے نگہبانی کو ظل اللہ پاس
حاضر خدمت قدیمانہ ہے عز و جاہ پاس
سایہ حق ان پہ تھا خود ظل سبحانی تھیں وہ
سارے عالم میں بڑی یکتا مہارانی تھیں وہ

39

ندوۃ العلماء کے اجلاس نہم منعقدہ اکتوبر 1902ء بمقام امرتسر میں گورنمنٹ برطانیہ کی شان میں جو نظم پڑھی گئی اس کے یہ اشعار ملاخط کیجئے۔

ہے رحیم ومہرباں ہم پر ہماری گورنمنٹ
ظل سبحانی ہے سر تا سر ہماری گورنمنٹ
اس کے سایہ میں ملی ہے ہم کو آزادی کمال
اے خدا ہر دم بلند اس کار ہے جاہ وجلال

40

1903ء شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی پر مولوی فیروز الدین مالک اخبار ''مشیر ہند'' نے یہ اشعار لکھے۔

دیکھتے ہیں، جبین شاہ میں ظل الہٰ
شان وشوکت میں تری پاتے ہیں شان ایزدی

39 تبصرہ ص 151 40 ایضاً ص 154

بعد طاعت کے اطاعت فرض ہے اسلام میں
دین وایماں ہے ہمارا شاہ کی فرماں بری
سایہ دولت میں تیرے ہیں کروڑوں کلمہ گو
تیری اسلامی حکومت ہے شاہ سب سے بڑی
شکر احساں ہے دلوں میں اور لبوں پر یہ دعا
تاابدقائم رہے یہ تخت وتاج قیصری

41

روز نامہ ''پیسہ اخبار''میں بھی دعائیں شائع ہوتی رہتی تھیں ایک قطعہ یہ ہے۔

جب تک چمن دہر الٰہی رہے قائم
اور پھولتا جب تک رہے نسرین وگل ولالہ
دائم رہے سر پر مرے ایڈورڈ کا سایہ
ہوجاہ وحشم دولت اقبال دوبالا

42

ایک اور قطعہ دعائیہ یہ تھا۔

ہردم یہی دعاہے کہ جب تک جہاں رہے
بس فتح مند قیصر ہندوستاں رہے
سکہ جہاں میں شاہ کاہر سورواں رہے
فتنہ فساد دورہو' امن واماں رہے

43

غرضیکہ یہ ہے تاریخ کا وہ باب جسے ہم نے اپنی آئندہ نسلوں سے بالکل چھپادیا ہے ہم اپنے بچوں کو وہ جھوٹی تاریخ پڑھاتے ہیں جو یہ تاثر دیتی ہے کہ ہمارے آباواجداد نے انگریز کے خلاف ہمیشہ

41 ایضاً ص 154 42 پیسہ اخبار 24 اپریل 1909ء 43 ایضاً 12۔ اگست 1915ء

زبان و قلم بلکہ تلوار سے جہاد کیا اور بڑی مشکل سے ہمیں پاکستان بنا کر دیا۔

ہم نے اس جہاد آزادی کا سب سے بڑا ہیرو اقبال کو بنا دیا ہے ہمارے پاس اِدھر اُدھر سے نوچے ہوئے جتنے تاج تھے وہ سارے ہم نے جمع کر کے اقبال کے سر پر لاد دیئے ہیں۔ اسی لئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی بات کہیں نہ آجائے جس سے ہمارے بنائے ہوئے ''آزادی اور انگریز دشمنی کے دیوتا'' کی دیوتائی ہلکی سی ضرب خوردہ ہو جائے۔ اسی آبگینے کو بچاتے بچاتے ہم نے تاریخ سے بے رحمانہ مذاق کیا ہے۔ میرا خیال ہے اگر اقبال خود وہ تمام کچھ پڑھ لیتا جو اس کے بعد ہم نے اس پر لکھا ہے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ ''ایں دفتر بے معنی غرق مےَ ناب اَولٰی''

آیئے ہم اقبال اور انگریز حکمرانوں کے موضوع کو کریدیں اور کوشش کریں کہ اقبال کو اس کے اپنے افکار کے تناظر میں دیکھا جائے۔ ہم ماہ و سال کے صحراؤں میں اقبال کے اشعار و افکار کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اس لئے اسے سن وار لکھتے ہیں۔

1901ء

ہم نے ابھی لکھا ہے کہ 1901ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی۔ یہ 22 جنوری کا دن تھا اور اتفاق سے وہی دن تھا جس دن ہندوستان کے مسلمان عبدالفطر منا رہے تھے۔ علامہ اقبال نے اس موقع پر ملکہ وکٹوریہ کے غم میں ایک سو دس اشعار پر مشتمل پر درد اور طویل مرثیہ لکھا۔ بلاشبہ اس کا ایک ایک شعر کمال فن کا ثبوت ہے۔ یہ پرسوز مرثیہ انگریز حکمرانوں کو بے انتہا پسند آیا۔ اسے سرکاری خرچ پر طبع کرایا گیا اس کا انگریزی میں ترجمہ خود علامہ اقبال نے کیا۔ اس کا نام رکھا گیا ''Tears of Blood''[44]

اسے بھی حکومت نے طبع کرا کے ملک کے طول و عرض میں پھیلایا۔ اس کے علاوہ کئی دوسری زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ یوں یہ نظم جہاں تک ممکن تھا پہنچا دی گئی۔ یہ علامہ اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور تھا، شاعر جوان تھا اس کی قوتیں شباب پر تھیں، اس لئے نظم میں تشبیہ و استعارہ کی ندرت کے ساتھ حسن بیان تھا۔ شوکت الفاظ تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ عقیدت آمیز تاثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آغاز

[44] دانائے راز ص 361 نیز رسالہ ''اقبال'' اقبال اکادمی پاکستان شمارہ جولائی تا ستمبر 1988ء ص 13

شاعرانہ نازک خیالی کا شاہکار ہے کہتے ہیں ملکہ کی موت کا غم سب پر واجب ہے اور ہلال عید کو بھی اس غم میں شریک ہونا چاہئے۔ اگر عید کی تقریب مسرت کے باعث ہلال عید ''خوشی کی بیماری'' میں مبتلا ہوگیا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ اتنا اندوہناک ہے کہ صبح غم ہلال عید کو بیمارئی نشاط'' سے نجات دلانے کے لئے سورہ والحشر پڑھ کر دم کرے گی تا کہ وہ بھی خوشی کے مرض سے چھٹکارہ پا کر غم میں شریک ہوجائے وہ ہلال عید سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں۔

بیمارئی نشاط اگر ہے تو صبح غم
پڑھ کر کرے گی سورۃ والحشر دم تجھے

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

آئی ادھر نشاط ادھر غم بھی آگیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آگیا

اسی طرح بند در بند نظم چلتی جاتی ہے اور تاثر ابھرتا چلا جاتا ہے برطانیہ سے اشتراک غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو
سامان اشک ریزئی طوفاں لئے ہوئے

اور آگے اپنی جان نثاری کی بات آتی ہے۔

میت اٹھی ہے شاہ کی تعظیم کے لئے
اقبالؔ اڑ کے خاک سرا ہگذار ہو

چوتھے بند میں ایک عظیم حاکم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس کی ہر بات ایسی تقدس مآب ہونی چاہئے جیسے صدائے جبریل امین ہو وہ معاملات کا فیصلہ اس دانشمندی سے کرے گا یا تقدیر کی مراد یہی تھی مرثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام محاسن ملکہ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے وہ کہتے ہیں ان ہی محاسن کے باعث۔

وکٹوریہ نہ مرد کہ نام نکو گزاشت

ہے زندگی یہی جسے پروردگا دے

ملکہ کے وجود سے ہندوستان کی محرومی کو انتہائی بدنصیبی بتاتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایہ خدا

ایک انگریز ملکہ کو ''سایہ خدا'' کہنا کہاں تک جائز ہے؟ یہ مسئلہ تو علمائے دین اور مفتیان شرع متین ہی جانتے ہوں گے مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اُس زمانہ میں یہ بات عام تھی اور علماء یہی حدیث بیان کیا کرتے تھے ''عادل سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے''۔ حضرت علامہ کا یہ مرثیہ ان کے مجموعہ کلام ''سرودرفتہ'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

1902ء

انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں انگریز گورنر پنجاب شریک ہوئے تو علامہ اقبال نے منظوم ہدیہ عقیدت پیش کیا اس کے یہ اشعار دیکھئے۔

ہے کون زیب دہ تخت صوبہء پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصر عدل کی تعمیر
جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگین
تو درس گاہ رموز وفا کی ہے تفسیر
اس اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں
نہیں ہے غیر اطاعت جہان میں اکسیر

[45]

1905ء تا 1908ء حضرت علامہ بغرض حصول تعلیم انگلینڈ میں رہے۔

[45] سرودرفتہ کلام اقبال مرتبہ غلام رسول مہر ص 176

1909ء

حضرت علامہ کشمیری مسلمانوں کی ایک انجمن کے سیکرٹیری تھے انہوں نے کشمیری مسلمانوں کو خوش خبری سنائی کہ آنرا ایبل سلیم اللہ خان نواب آف ڈھاکہ کو انگریزی افواج کے کمانڈر لارڈ کچنر نے بتایا ہے کہ اب کشمیری مسلمانوں کو انگریزی افواج میں بھرتی ہونے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں علامہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ''ہم فوج میں کشمیری مسلمانوں کی علیحدہ کمپنی کے لئے کوشاں ہیں'' [46]

اس سال علامہ صاحب نے اراکین انجمن کشمیریان کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مرسلہ فارموں پر اپنے کشمیری بھائیوں کی شجاعت و جاں نثاری اور فوجی خدمات کا ذکر کریں اور دفتر بھجوائیں تاکہ نواب سلیم اللہ خان کی وساطت سے یہ فہرست کمانڈر ان چیف کو بھجوائی جائے۔

1910ء

ایک رحمت علی صاحب تھے (خیال رہے کہ لفظ ''پاکستان'' متعارف کرانے والے چودھری رحمت علی نہیں) انہوں نے اسی سال سے انگریز حکمرانوں کی تعریف وتوصیف میں بارہ نہار اشعار کا ایک مجموعہ ''وفائے رحمت'' کے نام سے شائع کیا۔ مصنف نے اس کی تیاری میں علمی وادبی معاونت کرنے والوں میں نمایاں طور پر حضرت علامہ اقبال کا ذکر کیا ہے۔ اسی سال ایک صاحب علی گوہر سیکرٹری انجمن اسلامیہ ہزارہ نے پیسہ اخبار کے ذریعے بعض معروف مسلمان زعماء سے استفسار کیا کہ مصر میں ایک عالمگیر اسلامی کانفرنس ہو رہی ہے اس میں مسلمانان ہند کی شرکت مناسب ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں علامہ اقبال نے یہ مشورہ دیا کہ ایسی انجمنوں میں شرکت سے احتراز بہتر ہے۔ فرماتے ہیں ''جب تک ہم کو یقین نہ ہو جائے کہ کسی بدنتیجہ کے پیدا ہونے کا احتمال نہیں ہے تب تک کوئی عملی کام کرنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمان شاید اسلامی ممالک کی حالت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ حکومت برطانیہ کے سبب جو امن اور آزادی اس ملک کے لوگوں کو حاصل

---

[46] کلیات مکاتیب اقبال ج 1 ص 168 شائع کردہ اردو اکیڈیمی دہلی مکتوب بنام محمد دین فوق

ہے وہ اور ممالک کو ابھی نصیب نہیں ہے۔ مسلمانانِ عالم کے کسی ملک میں کوئی ایسی تحریک عام طور پر نہیں ہے جس کا منشاء یوروپ سے پالٹیکل مقابلہ کرنا ہو اایسا خیال ایک ایسی قوم میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کو کلام الٰہی میں امن اور صلح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ پوشیدہ طور پر مشورہ کرنے کی بھی ممانعت ہے اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ“ [47]

1911ء

22 جون 1911ء کو شہنشاہ جارج کا جشن تاجپوشی منایا گیا اور آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ لاہور کے مسلمان زعماء نے شہنشاہ جارج کا جشن تاجپوشی منانے کے لئے جس جگہ کو مناسب وموزوں سمجھا وہ لاہور کی شاہی مسجد تھی۔ تاج پوشی کی رسوم منانے کے لئے جو اعلان نامہ شائع ہوا اس کا عنوان تھا۔

”لاہور میں کارونیشن ڈے کی اسلامی رسوم“

ان ”اسلامی رسوم“ میں سے باقی زعماء کی تقاریر کے ساتھ علامہ اقبال کی تقریر اور منظوم کلام بھی تھا ”پیسہ اخبار“ میں دی ہوئی تفاصیل کے مطابق علامہ اقبال نے اپنی تقریر میں ایک افریقی ملک کا حوالہ بھی دیا کہ وہاں کے وحشی لوگوں کو مہذب بنانے کے لئے ایک انگریز افسر نے وہاں ایک مسلمان مبلغ کو بھیجنا مناسب خیال کیا حضرت علامہ نے اپنے تقریر کے آخر میں کہا۔

”مسلمان نہ صرف مراعات حاصل کرنے کے لئے سرکار کے وفادار ہیں بلکہ مذہباً وہ بادشاہ وقت کے وفادار ہوتے ہیں مسلمانوں کا آئیڈیل سلطنت نہیں بلکہ اپنے دین کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے اور انگریزوں کی حکومت میں اس کی اجازت ہے“ [48]

جشن تاج پوشی کے حوالے سے ان کی نظم کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہُمائے اوجِ سعادت ہے آشکار اپنا
کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا

---

[47] پیسہ اخبار 21 جولائی 1915ء (اقبال کا جواب دوسری بار شائع کیا گیا)

[48] روزنامہ پیسہ اخبار 24 جون 1911ء ص 7

اسی سے عہد وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کی خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

49

فرزند اقبال کہتے ہیں کہ 1912ء تک اسلامیان ہند کا دور وفاداری تھا اس لئے اگر علامہ اقبال نے بھی ایسی باتیں کہیں تو انہیں مورو دِالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہم کہتے ہیں حضرت علامہ کا ''عہد وفا'' تو 1912ء کے بعد بھی قائم رہتا ہے''

1918ء

1918ء میں لاہور کے ٹاؤن ہال میں سر مائیکل اوڈائر گورنر پنجاب کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا اس جلسہ کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ مصارف جنگ کے لئے پیسہ جمع کیا جائے اور پنجاب سے کم از کم دو لاکھ جوان فوج میں بھرتی کرانے کا ریزولیوشن پاس کرایا جائے۔ جلسہ میں پنجاب کے تمام اضلاع کے مسلم اور غیر مسلم عمائدین حاضر تھے۔ پہلے مسلمانوں کی طرف سے مولوی رحیم بخش پریذیڈنٹ کونسل بہاول پور نے مسلمانوں کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق شہنشاہ عادل ظل اللہ ہوتا ہے اور اس کی اطاعت اور وفاداری ان کا فریضہ ہے۔ پھر انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی کا شرعی فتویٰ پڑھ کر سنایا (یہ فتویٰ ہم پہلے درج کر آئے ہیں۔ راقم) اور اس کے بعد حضرت علامہ اقبال سٹیج پر تشریف لائے۔ پیسہ اخبار لکھتا ہے۔

''شیخ محمد اقبال نے سلطنت برطانیہ کے اوصاف کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ اصول انصاف اس وقت خطرہ میں ہے اور اس اصول کا تحفظ ہر ہندوستانی کے لئے بہت ضروری ہو جاتا ہے کوئی قوم عظمت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کرے۔ لاٹ صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں مَیں نے ''پنجاب کی آواز ملک معظم کی خدمت میں'' منظوم کی ہے اس پر انہوں نے اپنی نظم سنائی جس کا پہلا بند یہ ہے۔

---

49 سرودِ رفتہ

اے ناخدائے خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم کریں قلم سے نظام جہان ہند
تیرے جگر شگاف تیرے پاسبان ہند

[50]

یہ پوری نظم اقبال کے مجموعہ کلام ''سرود رفتہ'' میں موجود ہے بلاشبہ اس میں اقبال کی شاعری کا تمام حسن موجود ہے اور لفظ دلی عقیدت کا حسین ترین اظہار ہیں اختتامی ''بند ملاحظہ کریں۔

اخلاص بے غرض ہے' صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے اطاعت بھی بے غرض
عہد وفا و مہرومحبت بھی بے غرض
تخت شہنشاہی سے عقیدت بھی بے غرض
ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محضر قبول ہو

آخری بند میں یہ دعائے پرخلوص دیکھیئے

جب تک چمن کی جلوہ گل پہ اساس ہے
جب تک فروغ لالۂ احمر لباس ہے
جب تک نسیم صبح' عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرہ شبنم کی پیاس ہے
قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

یہ جنگ عظیم اوّل کی بات ہے اس کے لئے حضرت علامہ اپنے ''سر کا نذرانہ'' پیش کررہے

---

[50] روزنامہ پیسہ اخبار 11 مئی 1918ء

ہیں مگر وہ اکیلے نہیں پنجاب کے بہت سے ''اہل وفا'' مسلمان ان کے ساتھ ہیں سر مائیکل اوڈائر گورنر پنجاب نے لکھا۔ ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پنجاب کی نصف سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور جن لوگوں کو دیہاتی مسلمانوں کا صرف سطحی علم تھا وہ قیاس کر رہے تھے کہ ایسی جنگ کے لئے جو ترکوں کے خلاف لڑی جارہی ہے اور جو مصر، فلسطین اور عراق جیسے ان مسلمان ممالک میں لڑی جارہی ہے جہاں مسلمانوں کے مقدس و متبرک مقامات بھی ہیں، مسلمان بھرتی نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ سب مایوسانہ خیالات باطل ثابت ہوئے۔ جنگ کی ابتداء میں صرف ایک لاکھ پنجابی سپاہی تھے لیکن جنگ کے اختتام تک پنجابیوں کی تعداد 5 لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس طرح دوران جنگ تین لاکھ ساٹھ ہزار نئے سپاہی بھرتی ہوئے تھے جو سارے ہندوستان کے بھرتی شدہ سپاہیوں کی مجموعی تعداد کے نصف سے زائد تھے اور ان میں سے نصف پنجاب کے مسلمان تھے جو اس علم کے باوجود بھرتی ہوئے تھے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی ترکوں کے ساتھ جنگ کرنے جا رہے ہیں''[51]

فرزند اقبال جناب ریٹائر جسٹس جاوید اقبال کا خیال ہے کہ انگریزوں کے لئے وفاداری کا دور 1911ء کے بعد ختم ہونے لگا تھا لکھتے ہیں 1911ء اور 1914ء کے درمیانی عرصہ میں بعض ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انگریزی حکومت کی وفاداری کے متعلق کچھ قائدین کے انداز فکر میں تبدیلی آ گئی''[52]

حضرت علامہ کے عقیدت مند خاص سید نذیر نیازی نے لکھا ہے۔

''یہ ہندی سیاست کا دور وفاداری تھا جو 1919ء میں ختم ہوا اور جس میں ہندوستانی معاشرہ کا ہر طبقہ عوام، خواص، راجے، مہاراجے، نواب، حتی کہ آزادی ہند کے مجاہد اعظم مہاتما گاندھی بھی سرکار کی اعانت کے لئے میدان عمل میں اتر آئے تھے لہٰذا اقبال کے سیرت و کردار پر کوئی حرف نہیں آتا''[53]

جو لوگ علامہ اقبال کے سیرت و کردار پر اعتراض کرتے ہیں وہ کوئی اور ہونگے اور ہمارا خیال ہے کہ حضرت علامہ کے کردار پر اعتراض کا جواب خود ان کے عقیدت مند ہی فراہم کرتے ہیں وہ اگر انہیں اس دور کے معاشرہ میں رہنے والا انسان سمجھتے تو کبھی ان کے سر پر عجیب و غریب قسم کی ٹوپیاں

[51] India as i knew it by Sir Michael O' Dwyer P 415 [52] زندہ رود ص 290

رکھنے کی کوششوں میں نا قابل فہم اور خلاف واقعہ حرکتیں نہ کرتے۔ مثلاً ان ہی نظموں کے سلسلہ میں فرزند اقبال رقم طراز ہیں

''جہاں تک ان کا انگریزی حکام کی مدح میں یا فرمائش پر اشعار لکھنے کا تعلق ہے تو اقبال نے کئی وقتی نظمیں کہی ہیں جو خاص مواقع پر انہوں نے طبعاً' اخلاقاً یا مصلحتاً تحریر کیں اور جنھیں اس قابل نہ سمجھا کہ اپنے مطبوعہ کلام میں شائع کریں۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کا تعلق سرسید کے سیاسی مکتبہ فکر سے تھا وہ کلمہ حق کہنے سے باز نہ رہ سکتے تھے لیکن ایجی ٹیشنل یا احتجاجی سیاست ان کی فطرت کے خلاف تھی انگریزی حکومت اور ہندو اکثریت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی نازک سیاسی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مسلمانوں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ ایجی ٹیشنل سیاست گریز کریں'' [54]

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب آدمی اپنے بیان پر ذہنی طور پر مطمئن نہ ہو تو اس کی باتوں کا انداز مبہم ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے جن کا کوئی خاص مفہوم متعین نہ ہو سکے۔ اب اسی عبارت کو دیکھئے اس میں کہا گیا کہ علامہ اقبال نے انگریزوں کی مدح میں یہ نظمیں ''طبعاً، اخلاقاً یا مصلحتاً تحریر کیں'' اس جملہ میں ''طبعاً'' کا لفظ خاصا مبہم ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ جاوید اقبال صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی طبیعت یہی کہتی تھی کہ انگریزوں کی تعریف کی جائے؟ آگے ''اخلاقاً'' کا لفظ بھی اسی طرح کا ہے پھر مصلحتاً کہہ کر بات کو اور الجھا دیا گیا ہے وقتی مصلحت کے تحت آدمی مجبوراً کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جس پر اس کا دل مطمئن نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے فرزند اقبال شاید یہی کہنا چاہتے ہیں کہ یہ نظمیں یونہی لکھ دی گئیں، اس میں کوئی وقتی مصلحت کسی قسم کی بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا تعین نہیں کیا گیا اگلے جملہ میں اسی تاثر کو مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایسی نظمیں لکھیں کیونکہ اسے انہوں نے اپنے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں کیا چلئے ہم نے مان لیا کہ ان کی کوئی مجبوری تھی مگر آگے فرزند اقبال یہ لکھ دیتے ہیں ''اقبال کا تعلق سرسید کے سیاسی مکتبہ فکر سے تھا وہ کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے'' یہ جملہ بہت زیادہ مبہم ہے انہوں نے جو کچھ کہا وہ تو آپ کہہ رہے ہیں کسی مصلحت کے تحت لکھا گیا تھا پھر فرماتے ہیں وہ کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے'' وہ کلمہ حق

[53] دانائے راز از سید نذیر نیازی ص 361 [54] زندہ رود ص 399

کونسا تھا اور کہاں تھا؟ کیا یہی تعریف وتوصیف کلمہ حق تھا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جہاں تک سرسید کی بات ہے تو یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ سرسید کی سوچ پر بھی دوطرح کے ادوار گزرے ہیں اور ان دوادوار میں پہلے والے سرسید اور دوسرے والے سرسید بالکل متضاد سوچوں کے مالک ہیں اس حقیقت کو اضح کرتے ہوئے سرسید کے پہلے دور کے معتمد رفیق علامہ شبلی نعمانی کو کہنا پڑا

''وہ پرزور دست قلم جس نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈلٹن کی اسپچوں کی دھجیاں اڑادی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کالٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کرسکتا، وہ جانباز جوآگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہوکر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جن پر ہم واجبی طور پر فخر کرسکتے ہیں اور یہ صرف ان ہی کی بدولت ہے کہ علم وآزادی اور حب وطن کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقیں ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں، حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا یہ کیوں ہوا کن اسباب سے ہوا کس چیز نے دفعتاً یہ انقلاب پیدا کردیا؟'' (55)

یہ ایک طویل بحث ہے کہ سرسید کے خیالات میں تغیرات کیوں کر آگئے؟ اصل میں جب مسٹر بیک جیسا شاطر اور مکار انگریز علی گڑھ کالج کا پرنسپل بنا تو اس نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' والی سرکاری پالیسی کو فروغ دیا سرسید کے قویٰ اس وقت مضمحل ہو چکے تھے انہوں نے بیک پر ہی سب کچھ انحصار کرلیا اور ان کے خیالات بھی ڈھلتے چلے گئے علی گڑھ یونیورسٹی کے رجسٹرار مولانا طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں۔

''اس پر طرۂ یہ ہوا کہ سرسید کے افکار میں اضافہ ہوتا گیا۔ کالج کی مالی مشکلات اور سید محمود کی خرابی صحت نے ان کے دماغ کو ماؤف کردیا تھا بہت سے پرانے دوست اور ساتھی تو مولوی سمیع اللہ

(55) مسلم گزٹ لکھنؤ

خان کے ساتھ ہی انہیں چھوڑ چکے تھے جو باقی تھے وہ مسٹر بیک کے دروبست حاوی ہو جانے سے دست کش ہو گئے تھے'' [56]

مولانا منگلوری نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے انہوں سرسید کے انقلاب حال کی داستان بیان کرنے پر افسوس بھی ہے مگر وہ اسے ضروری بھی سمجھتے ہیں چنانچہ انہوں نے آخر میں لکھا

''یہ واقعات ہرگز اس قابل نہ تھے کہ ضبط تحریر میں لائے جاتے مگر چونکہ ان کے ظاہر نہ ہونے سے مسلمانوں کو نقصان اٹھاتے پوری نصف صدی ہو چکی اور وہ سرسید کے نام سے اب تک غیر قوم کے مدبر یعنی مسٹر بیک کی حکمت عملی پر چل رہے ہیں اس لئے محض قوم کے نفع کی خاطر ان حالات کا انکشاف ضروری معلوم ہوا تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ سرسید کی 25 سال کی سیاسی پالیسی 1884ء میں ختم ہو چکی تھی اور اس کے بعد سے سرسید کی جو ''نام نہاد پالیسی'' تھی وہ فی الواقع مسٹر بیک کی تھی'' [57]

ہم اس وقت علامہ اقبال کی سیاست پر بات نہیں کر رہے ورنہ یہ ثابت کرتے کہ انہوں نے سرسید کی 1884ء کے بعد کی پالیسی کو اپنا رہنما بنایا جسے ابھی ابھی مولانا منگلوری نے ''نام نہاد پالیسی کہا ہے اور جو ان کی وضاحت کے مطابق مسٹر بیک کی پالیسی تھی۔

مدحیہ نظموں کے سلسلہ میں فرزند اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ علامہ صاحب نے ''انہیں اس قابل نہ سمجھا کہ مطبوعہ کلام میں شامل کریں'' اس سے فرزند اقبال یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علامہ نے یہ نظمیں ''طبعاً'' یا ''اخلاقاً'' یا ''مصلحتاً'' تحریر کی تھیں یہ بات فرزند اقبال کہہ سکتے ہیں ہم تو حضرت علامہ کے متعلق اس بدگمانی کو حاشیہ خیال میں بھی نہیں لا سکتے کہ ان کے دل میں کچھ اور ہوتا تھا اور زبان و قلم پر کچھ اور یہ ''منافقانہ انداز'' ہمارے اس محبوب شاعر کے ساتھ ان کے فرزند نے منسوب کیا تو ہمارے دل کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ بہت سے علماء شعراء اور سیاسی زعماء اس وقت انگریز کی تعریف کر رہے تھے اگر ان میں ایک اقبال بھی تھا تو اس میں کیا قباحت ہے ہم فرزند اقبال کی طرح یہ گمان بد نہیں رکھتے کہ اقبال کا مدحیہ انداز ''منافقانہ مصلحت بینی'' پر مبنی تھا۔ آدمی کے خیالات بدلتے رہتے ہیں حضرت عمر فاروق اور خالد بن ولید کسی دور میں شرک میں مبتلا رہے پھر اس راستہ سے ہٹ کر توحید پر

[56] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 259 [57] ایضاً ص 260

آ گئے مگر وہ پہلے دور میں تھے تو بھی پورے اخلاص قلب سے تھے اور دوسرے دور میں آئے تو ان کی زبان پر ان کے دل نے مہر تصدیق ثبت کی رہی یہ بات کہ انہیں اقبال نے مطبوعہ کلام میں کیوں شامل نہ کیا؟ سوسیدھی بات ہے کہ یہ ہنگامی شاعری تھی اور علامہ اقبال اسے آفاقی شاعری میں جگہ نہیں دے سکتے تھے دیکھنا تو یہ ہے کہ جس وقت یہ کلام شائع ہوا کیا اس وقت مختلف رسائل و جرائد میں علامہ اقبال کے اپنے نام سے شائع نہیں ہوا تھا آخر اس وقت انہوں نے یہ لکھنا اور خود سے منسوب کرنا کیوں گوارا کیا۔ پھر یہ ہے کہ انہوں نے اپنا اور کچھ کلام بھی اپنے مطبوعہ کلام میں شامل نہ کیا۔

کیا وہ سارا کسی مجبوری کے تحت تھا مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد کی شان میں بھی قصیدہ لکھا تھا اور وہ بھی ان کے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں کیا وہ بھی کسی مجبوری کے تحت لکھا گیا۔

فرزند اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''اس دور کے اقبال کی ایک اور نظم بھی ہے جو انجمن حمایت اسلام کے اجلاس 1902ء میں سر میکورتو نیگ گورنر پنجاب اور ڈبلیو بل ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی آمد پر بطور خیر مقدم پڑھی گئی کیونکہ اس زمانہ میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ایسے حکام کی آمد سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور ویسے بھی اسے بہت بڑا اور نہایت اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا'' یہاں فرزند اقبال نے ''اس دور کا اقبال'' اور بعد کے اقبال میں حد بندی قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اقبال ایسی مدح و ستائش اپنے لئے نہ سہی غیروں کے لئے مفادات حاصل کرنے کی خاطر گویا جھوٹی خوشامدانہ شاعری بھی کر لیا کرتا تھا (معاذ اللہ)

فرزند اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''1911ء میں اقبال نے کچھ اشعار بیادگار دربار شاہی (یعنی تاجپوشی جارج پنجم) بمقام دہلی کہے جو'' زمانہ'' کانپور کے دربار شاہی نمبر دسمبر 1911ء میں شائع ہوئے 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کا یوروپ میں آغاز ہوا اور عثمانی ترکیہ جو خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا' نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا حلیف بننے کا اعلان کیا اس نہایت پر آشوب زمانہ میں حکام وقت کی ناراضگی مول لینا حکومت کی گرفت میں آجانے کے مترادف تھا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا سو اقبال نے مصلحتاً عزلت نشینی اختیار کی۔

لیکن 1918ء یعنی اواخر جنگ میں وائسرائے ہند نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی اور نواب سرذوالفقار علی خان کی وساطت سے اقبال کو اس موقع کے لئے ایک نظم تحریر کرنے کی فرمائش کی گئی اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی اس لئے اقبال نے مجبوراً نظم ''پنجاب کا جواب'' لکھی اور دہلی کے مشاعرہ میں جا کر پڑھی چند ماہ بعد اختتام جنگ پر سر مائیکل اوڈائیر گورنر پنجاب کی صدارت میں 15 دسمبر 1918ء کو بریڈلاء ہال لاہور میں جشن فتح کی صورت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اقبال نواب سر ذوالفقار علی خان کے ساتھ شریک ہوئے اور گورنر کی فرمائش پر اردو اشعار اور چند فارسی اشعار پڑھے اردو اشعار کا کوئی تعلق جشن فتح سے نہ تھا اور وہ ''بانگ درا'' میں ''شعاع آفتاب'' کی صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں'' [58]

فرزند اقبال کی اس تحریر پر ہم سوائے اظہار مذامت کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے وہ حکیم الامت جو مسلمانوں کو یہ درس دے رہا تھا کہ

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور جس ''اللہ کے شیر'' کے متعلق ابھی دو قدم پہلے ان کے فرزند عزیز ریٹائرڈ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ ''اقبال کا تعلق سرسید کے ''مکتبہ فکر'' (کذا) سے تھا وہ کلمہ حق کہنے سے باز نہ رہ سکتے تھے'' اب اسی کے متعلق ان کے فرزند کہہ رہے ہیں کہ اقبال دبک کر بیٹھ گئے کیونکہ ''اس نہایت پرآشوب زمانہ میں حکام وقت کی ناراضگی مول لینا حکومت کی گرفت میں آجانے کے مترادف تھا'' حالانکہ اس وقت کا تقاضا تو وہی تھا جس پر علی برادران اور دیگر مسلم زعماء بلکہ ان کے ساتھ کانگریس کے ہندو زعماء بھی عمل کر رہے تھے خیر ہم مزید کچھ نہیں کہتے آپ انصاف پسند ذہن سے اقبال کے وہ اشعار بھی پڑھیئے جو اس موقع پر انہوں نے لکھے اور پڑھے اور جنہیں ہم 1918ء کے لاہور کے جلسہ کے تحت نقل کر آئے ہیں یعنی وہی ''ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو'' یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جاوید اقبال نے ایک ''عقید تمند اقبال'' مولانا غلام رسول مہر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لاہور والے 1918ء

[58] زندہ رود ص 400-399

کے جلسہ میں علامہ اقبال نے وہ اردو اشعار پڑھے جن کا تعلق جشن فتح سے نہ تھا اور ''شعاع آفتاب'' نامی نظم کے تھے'افسوس ہے کہ مولانا مہر کی یہ بات بھی غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم نے جس کتاب سے حوالہ لکھا ہے اس میں روزنامہ پیسہ اخبار لاہور کے اصل صفحہ کا عکس دیا گیا ہے اور اصل خبر میں صاف طور پر اس نظم پنجاب کی آواز پڑھنے کا ذکر ہے اس کا ایک بند بھی دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ 1918ء کی بات ہے یعنی یہی نظم پہلے دہلی کی وار کانفرنس میں پڑھی گئی اور پھر بریڈلاء ہال لاہور میں پڑھی گئی۔

1923ء سر کا خطاب

ہم علامہ اقبال کے نیاز مند خاص جناب سید نذیر نیازی کی اقبال پر لکھی ہوئی کتاب ''دانائے راز'' کے حوالہ سے بتا چکے ہیں کہ سید نذیر نیازی نے لکھا ہے کہ 1919ء تک ہندی سیاست کا دور وفاداری تھا اس طرح دراصل وہ ان تمام نظموں کا جواز پیش کر گئے کہ پوری ہندوستانی سیاست اس وقت وفادارانہ تھی اس لئے حضرت علامہ نے اس طرح کی نظمیں لکھ دیں تو کیا ہوا؟ ہم کہتے ہیں علامہ صاحب کی وفاداری اور دوستی کی کہانی کچھ آگے تک جاتی ہے۔

جس دور میں علامہ اقبال کو''سر'' کا خطاب ملتا ہے اس دور میں ہندوستان کی سیاست میں انقلابی تبدیلیاں آچکی تھیں اس دور میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات دو مشہور تحریکیں اٹھیں ''تحریک ترک موالات'' کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں۔

''اس میں لوگوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ حکومت کے عطا کردہ خطابات اور اعزازی عہدے واپس کریں۔ اور تمام سرکاری و نیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے بھی انکار کر دیں مسلم علماء نے جمعیتہ العلماء کے اجلاس منعقدہ 19 تا 21 نومبر 1920 بمقام دہلی ترک موالات کے حق میں ایک فتویٰ دیا اس پر پانچ سو علماء کے دستخط تھے'' (59)

اسی دور میں بنگال کے عظیم ادیب، شاعر اور دانشور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی برطانوی حکومت کی طرف سے سر کا خطاب عطا ہوا مگر ٹیگور نے وائسرائے ہند کو سر کا خطاب واپس کر دیا اور لکھا۔

''The time has come when honours and awards are being looked down upon. On my part, without such awards, I want to be in the midst of my countrymen who are being contemptuously and inhumanely treated. Therefore, I shall request you to take back the honour bestowed upon me by his imperial crown.

(ترجمہ: وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے خطابات اور اعزازات کو حقارت سے ٹھکرایا جا رہا ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ایسے اعزازات کے بغیر اپنے ہم وطنوں کے درمیان رہنا پسند کرتا ہوں جن کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے اور جن کی تذلیل ہو رہی ہے اس لئے میں لازماً یہ التجا کروں گا کہ براہ کرم آپ تاج برطانیہ کی طرف سے مجھے عطا کیا ہوا یہ خطاب واپس لے لیں) (60)

عین اسی زمانہ میں انگریز حکمرانوں نے علامہ اقبال کو نائیٹ ہڈ یعنی سر کا خطاب عطا کرنے کا فیصلہ کیا خطاب کے پس منظر کے متعلق فقیر سید وحیدالدین کی روایت ہے کہ علامہ اقبال نے انہیں خود بتایا کہ پنجاب کورٹ کے چیف جج سر شادی لعل نے انہیں بلا کر کہا کہ اس سے گورنمنٹ نے خطابات کے لئے سفارشیں طلب کی ہیں اور وہ اقبال کا نام ''خان صاحب'' کے خطاب کے لئے تجویز کرنا چاہتا ہے اقبال نے جواب دیا کہ انہیں کسی خطاب کی خواہش نہیں زحمت نہ کی جائے چند دنوں بعد پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن نے اقبال کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں لندن ٹائم کے ایک مقالہ نگار جس نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا' سے ملوایا گیا مقالہ نگار نے کوئی کتاب تحریر کی تھی جس کے متعلق اقبآل کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا اقبال کی اس کے ساتھ خاصی دیر صحبت رہی جب رخصت ہونے لگے تو گورنر کا پیغام ملا کہ اس سے ملتے جائیں۔ اقبال اس کے کمرے میں گئے تو اس نے کہا کہ میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کے لئے نائیٹ ہڈ (Knight Hood) کے خطاب کی سفارش کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو اقبال

(59) ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' ص 358 (60) Sacrifice P 17

کچھ پس وپیش کے بعد رضا مند ہو گئے اس کے بعد گورنر نے پوچھا کہ کیا ان کی نگاہ میں کوئی ایسا شخص ہے جو شمس العلماء کے خطاب کا مستحق ہو اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ ایک نام پیش کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے گورنر نے قدرے تامل کے بعد شرط قبول کر لی تو اقبال نے اپنے استاد مولانا سید میر حسن کا نام تجویز کیا۔ گورنر مولانا سید میر حسن کے نام سے واقف نہ تھا اس لئے دریافت کیا کہ انہوں نے کون کون سی کتابیں تحریر کی ہیں اقبال نے کہا انہوں نے کوئی کتاب تو نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف ہوں جو آپ کے سامنے موجود ہے کیونکہ وہ میرے استاد ہیں اس کے بعد یہ بھی واضح کر دیا کہ اُن کے لئے شمس العلماء کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو ضعیف العمری کے سبب انہیں سند خطاب لینے کے لئے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے چنانچہ جب خطاب کا اعلان ہوا تو مولانا سید میر حسن کی سند خطاب ان کے فرزند کے حوالہ کی گئی [61]

اس طویل اقتباس میں بعض باتیں غور طلب ہیں سر شادی لعل والا واقعہ شاید اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال کی خطابات وغیر کی طرف سے بے اعتنائی ثابت کی جائے مگر سر شادی لعل نے جس خطاب ''خان صاحب'' کا ذکر کیا وہ علامہ صاحب کے مقام سے ویسے بھی فروتر تھا اس لئے انہوں نے انکار کر دیا ہو گا اس طرح علامہ اقبال کی خطابات سے بے اعتنائی ثابت نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات جس میں لندن ٹائمز کے ایک مقالہ نگار کی ملاقات کا ذکر ہے بظاہر بے تعلق معلوم ہوتی ہے لیکن شاید فقیر صاحب کا مقصد یہ واضح کرنا ہو کہ اقبال لندن میں بڑی شہرت کے مالک تھے اور وہ انگریز لندن سے اپنی کتاب کے متعلق رائے معلوم کرنے آیا تھا اور جب ایک ہندوستانی شاعر وادیب اتنا معروف ہو تو اسے خطاب ملنا چاہئے تھا۔ اگر فقیر صاحب یہ واقعہ (تصنیف) نہ فرماتے تو بھی کسی کو اس امر میں شبہ نہیں تھا کہ حضرت علامہ لندن کے اہل علم میں شہرت رکھتے تھے۔ فقیر صاحب نے گو یہ واقعہ علامہ اقبال کی زبانی روایت کے طور پر بیان کیا ہے مگر ان کی اپنی ''تصنیف'' معلوم ہوتا ہے اگر کوئی ایسا آدمی تھا اور واقعی اس نے اپنی کسی کتاب پر اقبال کی رائے معلوم کرنے کے لئے لندن سے لاہور تک کا طویل سفر کیا تھا تو اس کا نام ضرور بتانا چاہئے تھا مگر فقیر صاحب نے نہ اس کا نام بتایا ہے

[61] زندہ رود ص 268 بحوالہ روزگار فقیر ج ص 41 تا 44 ذکر اقبال از عبدالمجید سالک ص 118 تا 120

نہ اس کی کتاب کا نام بتایا ہے پھر یہ بھی ہے کہ جس آدمی نے رائے معلوم کرنے کے لئے یہ کھکھیڑ برداشت کیا یقیناً اس نے تحریری رائے لی ہوگی وہ رائے کہاں ہے؟

آخر میں گورنر کی بات آتی ہے یہاں اقبال اس طرح انکار نہیں کرتے جیسے سر شادی لعل کو کیا تھا یہاں فقیر صاحب ''پس وپیش'' کا لفظ لکھ دیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مولانا سید میر حسن کے لئے علامہ اقبال نے ضرور سفارش کی ہوگی یہ بات بالکل درست ہے مگر یہ بات لکھ کر اپنی اس بات کی تردید کردی گئی ہے کہ حضرت علامہ انگریزوں کے خطابات واعزازات سے بے اعتنائی برتتے تھے۔ یقیناً وہ اسے قابل قدر سمجھتے ہوں گے جبھی تو اپنے استاد محترم کے لئے خطاب کے طلبگار ہوئے یہاں سے یہ بات بھی مشکوک ہوگئی کہ اپنے لئے انہوں نے پس وپیش کی ہوگی ہاں عام ہندوستانیوں کی طرح کچھ عجز وانکسار دکھایا ہوگا ''جی بندہ اس کے قابل کہاں ہے'' وغیرہ وغیرہ

بہرحال سر کا خطاب علامہ صاحب کو باقاعدہ ایک تقریب میں دیا گیا اس تقریب کے متعلق فرزند اقبال لکھتے ہیں۔

''اخبار ''بندے ماترم'' لاہور اس تقریب کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کرتا ہے

''17 جنوری کو بوقت چار بجے شام ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو سر کا خطاب ملنے کی تقریب پر شاہدرہ میں ایک پر لطف گارڈن پارٹی دی گئی جن اصحاب کی طرف سے دعوتی کارڈ جاری ہوئے تھے ان میں گورنر پنجاب کی انتظامیہ کونسل کے ممبر سر جان مینارڈ، میاں فضل حسین وزیر تعلیم اور لالہ ہرکشن لعل وزیر صنعت وحرفت کے علاوہ سر ذوالفقار علی خان، نواب سر فتح علی خان قزلباش چودھری شہاب الدین، میاں احمد یار خان دولتانہ اور دیگر بہت سے سرکار پرستوں کے نام بھی تھے۔ دعوت شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ کے وسیع احاطہ میں دی گئی۔ جلسہ دعوت کے صدر سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر پنجاب تھے۔ مقبرہ کے دروازہ پر پولیس کے سپاہی تعینات تھے جو اصحاب اس دعوت میں شریک ہوئے وہ زیادہ تر ایسے تھے جن کو دیکھ کر اس خیال کی تردید ہوتی تھی کہ یہ دعوت کسی شاعر کی عزت افزائی کی خوشی میں دی گئی ہے۔ یوروپین لیڈیوں کے علاوہ متعدد ہندوستانی خواتین بھی شریک دعوت نظر آتی تھیں۔ جہاں تک دعوتی کارڈوں کا تعلق ہے میزبان سر ذوالفقار علی خان تھے لیکن جلسہ کو کامیاب بنانے کا سہرا زیادہ تر میاں

فضل حسین کے سرسمجھنا چاہئے کیونکہ لاہور کے تقریباً تمام سکولوں اور کالجوں کے پروفیسر اور ٹیچر اور شاید طالب علم بھی خاصی تعداد میں مدعو کئے گئے تھے۔

ایک اور بات جو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی وہ ہندو اصحاب کی کمی تھی اور اس سے اس امر کا ایک زبردست ثبوت مہیا ہو رہا تھا کہ جذبہ سرکار پرستی ہندو مسلمانوں کو گلے ملوانے میں جذبہ قوم پرستی کا ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کھانے کے دوران میں سرایڈورڈ میکلیگن اور سرجان مینارڈ کی کرسیوں کے قریب سکول کے چند لڑکے ''ہندوستان ہمارا'' ڈاکٹر اقبال کی نظم گا رہے تھے جو بہ اعتبار مضمون اس مجمع میں نہایت غیر موزوں معلوم ہوتی تھی۔ کھانا ختم ہو چکنے کے بعد سرذوالفقار علی خان نے ایک تقریر کی۔ تقریر میں ڈاکٹر ٹیگور کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر ٹیگور کو نوبل پرائز ملنے کے بعد سر کا خطاب دیا گیا لیکن انہوں نے اتنا کہنے کی تکلیف گوارا کرنا مناسب نہ سمجھا کہ ڈاکٹر ٹیگور اس خطاب کو واپس کر چکے ہیں۔ سرمحمد اقبال نے جوابی تقریر میں اس دلچسپی کا ذکر کیا جو مغربی ممالک میں ایشیائی خصوصاً عربی و فارسی علوم کے متعلق پیدا ہوگئی ہے جب سرمحمد اقبال نے یہ کہا کہ مجھ کو خطاب دے کر گورنمنٹ نے اردو و فارسی کے ادیبوں کی عزت افزائی کی ہے۔ اس وقت ان سے شاید یہ امر واقعہ نظر انداز ہو گیا تھا کہ آج کل سرکاری خطابوں کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ عوام ان کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ سرمحمد اقبال کو اردو و فارسی کا ایک بلند پایہ شاعر ہونے کی حیثیت سے خطاب دیا گیا اور حاضرین جلسہ میں بھی زیادہ تعداد یوروپیوں کی نہیں تھی لیکن سرذوالفقار علی خان اور سرمحمد اقبال دونوں کی تقریریں انگریزی میں تھیں ایک عجیب بات یہ تھی کہ سرایڈورڈ میکلیگن نے جو جلسہ دعوت کے صدر تھے کوئی تقریر نہ کی جلسہ کے اختتام پر ایک فوٹو لیا گیا جس میں سرمحمد اقبال کے علاوہ سرایڈورڈ میکلیگن، سرجان مینارڈ، سرذوالفقار علی خان، راجہ نرنیدرناتھ اور دیوان کشن شریک ہوئے گویا فوٹو سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سرمحمد اقبال کو خالص ادبی خدمات کے صلہ میں خطاب ملا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میاں فضل حسین، سردار سندر سنگھ مجیٹھہ ممبر انتظامیہ کونسل گورنر پنجاب اور لالہ کشن لعل فوٹو میں کیوں شریک نہ ہوئے'' [62]

ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے ''بندے ماترم'' اخبار کا یہ طویل اقتباس نقل کیا ہے جو آپ کے

سامنے ہے اس میں بھی دو چار جگہ چبھتے ہوئے طنزیہ جملے ہیں مگر جاوید اقبال صاحب نے انہیں بے تبصرہ چھوڑ دیا کہ شاید قارئین بھی رواروی میں انہیں نظر انداز کر جائیں انہوں نے اس تحریر کو روئیداد جلسہ کے طور پر نقل کر دیا لیکن انہوں نے اسی تحریر کا وہ حصہ چھوڑ دیا جو ''بندے ماترم'' کی جانب سے تبصرہ تھا آیئے وہ جملے ہم آپ کے سامنے رکھے دیتے ہیں آگے اخبار نے لکھا تھا ''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو سر کا خطاب ملنے کی تقریب پر 17 جنوری کے دن شاہدرہ میں جو شاندار دعوت دی گئی ہے۔۔۔تو معمہ کا حل واضح طور پر ہو گیا ہوگا کہ اقبال کو خطاب گزشتہ اور آئندہ سیاسی خدمات کے صلہ میں ملا ہے یا ادبی خدمات کے صلہ میں' شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ میں جس وسیع اور پر فضا صحن میں جلسہ دعوت منعقد ہوا۔ اس کے دروازوں پر یوروپین اور ہندوستانی پولیس کی نمائش، یوروپ نواز مسلمانوں کی کثرت، گورنر بہادر کی صدارت، سرکاری حضرات کی شرکت ان سب باتوں کو دیکھ کر بھی جو یہ کہے گا کہ ڈاکٹر اقبال کو اس وجہ سے خطاب ملا ہے کہ اردو و فارسی کے شاعر ہیں دوپہر کے وقت ستارے دکھانے کے مترادف ہے'' (63)

ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت علامہ خطاب کے مستحق نہیں تھے ہم تو یہ کہتے ہیں وہ اس اعزاز سے بھی بڑے اعزازات کے مستحق تھے ان کی اردو فارسی شاعری کی تحسین انگریزوں کی طرف سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ ان کی قوم ان کے کلام کی قدر منزلت اور توقیر و تعظیم کو انگریزوں سے زیادہ سمجھتی تھی اور انہیں اعلیٰ ترین مقام دے چکی تھی ہمیں اگر اعتراض ہے تو اس بات پر کہ جس وقت انگریز حکمرانوں کے ایسے اعزازات کو حقارت سے ٹھکرایا جا رہا تھا اس وقت حضرت علامہ نے کیوں سر کا خطاب لیا اور پھر کیوں عمر بھر اسے سینے سے لگائے رکھا اس بات نے علامہ اقبال کے قریبی دوستوں اور ان کے عقیدت کیشوں کو بھی تڑپا دیا تھا چنانچہ ان کے ایک بڑے عقیدت مند مولانا ظفر علی خان اپنے زخمی احساس کو خفتہ نہ رکھ سکے اور انہوں نے بھڑک کر کہا۔

سرفروشوں کے ہیں ہم سر، آپ ہیں سرکار کے
آپ کا منصب ہے سرکاری، ہمارا خانگی

---

(62) زندہ رود ص 270-269 بحوالہ ''بندے ماترم'' 20 جنوری 1923ء ص 7، 31 جنوری 1923ء ص 3

(63) اخبار ''بندے ماترم'' 31 جنوری 1923 ص 3

عافیت کوشی ہے پہلے دانا سے مسلک آپ کا
اور اس میں مستتر ہے آپ کی فرزانگی
مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آراء تو بھی ہو
چھوڑدے اس بزدلی کو اور دکھا مردانگی
64

علامہ اقبال کے ایک دوسرے قریبی عزیز مولانا عبدالمجید سالک تھے ان کی کتاب ''ذکر اقبال'' اقبالیات کے لڑیچر میں اہم حیثیت رکھتی ہے انہوں نے جو اشعار لکھے وہ تو خود فرزند اقبال نے نقل کئے ہیں جاوید اقبال بڑی دیانتداری سے لکھتے ہیں

''تحریک ترک موالات کے سبب لوگوں میں سرکاری خطابات کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی اس لئے سر کا خطاب ملنے پر اقبال کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اخبارات کے کالموں میں ان پر طنز بھری چوٹیں کی گئیں عبدالمجید سالک نے فوری ردعمل کے طور پر چند اشعار بھی زمیندار میں شائع کردیئے جو زبان زدعام ہو گئے۔

لومدرسہ علم ہوا قصر حکومت
افسوس کہ علامہ سے سر ہوگئے اقبالؔ
پہلے تو سرملت بیضا کے وہ تھے تاج
اب اور سنو تاج کے سر ہوگئے اقبالؔ
پہلے تو مسلمانوں کے سر ہوتے تھے اکثر
تنگ آکے اب انگریز کے سر ہوگئے اقبالؔ
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہوگئے اقبالؔ
سرہوگیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سرکار کی تدبیر سے سر ہوگئے اقبال 65

64 بحوالہ صحیفہ اقبال نمبر 2 شمارہ جنوری فروری 1978 ص 142

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی کے احساسات بھی ملاحظہ فرمایئے وہ لکھتے ہیں۔

''اس دور میں، اس طوفان خیز اور ہنگامہ آفریں دور میں اقبال کا کیا حال تھا؟ وہ کس کی طرف تھے؟ آزادی کے شیدائیوں اور ملت کے مجاہدوں کے ساتھ یا قوم کے دشمنوں یا ملت کے غداروں کے ساتھ؟ واقعات وحقائق بڑے بے مروت اور غیر جانبدار ہوتے ہیں وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے سچی اور کھری بات کہتے ہیں حقائق کی زبان سے واقعات کا بیان یہ ہے کہ اقبال سیاسی بیداری کے اس دور میں نہ صرف تحریک خلافت کے ساتھ نہیں تھے بلکہ اس سے ''اصولی اختلاف'' رکھتے تھے اور اس لئے اسی طرح الگ اور غیر متعلق تھے جس طرح ایک مخالف ہوسکتا ہے یہی نہیں عین اس زمانہ میں جب لوگ ملازمتوں پر لات مار رہے تھے سرکاری کالجوں، یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے اقبال کو سر کا خطاب دیا گیا اور انہوں نے اس کو قبول بھی کرلیا جس پر کسی دل جلے نے یوں فقرہ چست کیا

''سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال''[66]

مولانا رئیس احمد جعفری نے تحریک خلافت سے اختلاف کی بات کی ہے، ہم تفاصیل میں نہیں جاسکتے لیکن خلافت کمیٹیوں کے کچھ ممبران کے متعلق حضرت علامہ کے یہ الفاظ ضرور درج کئے دیتے ہیں وہ اپنے برادر بزرگ کو خط لکھتے ہوئے بتاتے ہیں۔

'' خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبران بظاہر جوشیلے مسلمان لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں''[67]

بہر حال ہم ''سر'' کے خطاب کی بات کر رہے تھے علامہ اقبال کی زندگی ہی میں اس سلسلہ میں ان کے اپنے عقیدت کیشوں کی جانب سے اعتراضات ہوتے رہے مگر انہوں نے انہیں پی لیا اور کسی طرح کی وضاحت نہ کی البتہ یہ تاثر دیا کہ یہ ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف ہے مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔

''سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ہے، صحیح ہے یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ

---

[65] زندہ رود ص 269-268 اشعار سالک بحوالہ ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور اقبال نمبر 125 اپریل 1949ء

[66] اقبال اور سیاست ملی ص 273 [67] ''مظلوم اقبال'' ص 314

ہونے اور یوروپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے'' (68)

اپنے پرانے دوست غلام بھیک نیرنگ کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

''میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں سینکڑوں خطوط اور تار آرہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے سو خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاءاللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے'' (69)

علامہ صاحب نے نیرنگ کے اس اندیشہ کا تو جواب دیا کہ کہیں خطاب اظہار و اعلان حق میں رکاوٹ نہ بنے یا جواب دینے کی کوشش کی لیکن دوسرے لوگوں کے ان اعتراضات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جو اس خطاب کے اس خاص وقت ملنے اور پھر اقبال کے اسے قبول کر لینے پر معترض تھے انہوں نے اس طرف سے یوں اغماض کیا جیسے انہیں کچھ خبر نہیں ہاں فرزند اقبال جناب ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں۔

''یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے نزدیک خطابات یا دنیاوی اعزازات کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لئے خطاب حاصل کرنے کے بعد جیسا کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے، آزادی اظہار میں کمی کی بجائے زیادہ شدت سے اضافہ ہوا۔ مگر ایسے زمانہ میں جب عوام میں خطابات کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی اقبال نے خطاب کیوں قبول کیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبال کا تعلق اقلیتی قوم سے تھا اور برصغیر کے سیاسی پس منظر میں اقلیتی قوم کی نفسیات اکثریتی قوم سے مختلف تھیں یعنی انگریزی حکومت یا ہندو اکثریت کے مقابلہ میں مسلم اقلیت کا رویہ بنیادی طور پر مدافعانہ تھا اور اقبال کے خطاب قبول کرنے کی مصلحت اسی مدافعانہ نفسیات کی غماز تھی'' (70)

---

(68) ''شاد و اقبال'' مرتبہ محی الدین قادری زور ص 135 خط مرقومہ 24 جنوری 1923ء

(69) ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ ج 1 ص 206 (70) زندہ رود ص 270

آپ نے دیکھا جب لکھنے والے کے پاس کوئی جواب نہ ہو مگر اُسے اپنے ممدوح کے دامن کے دھبے دور کرنے کی فکر بھی ہو تو وہ یونہی مبہم باتیں کر کے جان چھڑاتا ہے فرماتے ہیں ''اقبال کے نزدیک خطابات یا دنیاوی اعزازات کی کوئی اہمیت نہ تھی'' یہ بات خود اقبال نے بھی فرمائی ہے اور اس وقت پوری ملت اسلامیہ کا بھی یہی خیال تھا کہ اقبال کے نزدیک انگریزوں کے عطا کردہ اعزازات کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہئے مگر افسوس ہے کہ حضرت علامہ لوگوں کی توقعات پر پورے نہ اترے اور ساری عمر اس خطاب کو سینے سے لگائے رکھا۔ یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر انگریزوں کے عطا کردہ خطابات علامہ اقبال کے نزدیک اتنے ہی بے وقعت ہوتے تو وہ ''شمس العلماء'' کے خطاب کے لئے اپنے اُس اُستادِ محترم کے لئے کیوں اصرار کرتے جسے وہ صرف استاد ہی نہیں پیر و مرشد بھی سمجھتے تھے۔ خطاب قبول کرنے اور اسے عمر بھر اپنے ساتھ چمٹائے رکھنے کے لئے بڑا عجیب وغریب جواز فرزند اقبال نے پیش کیا کہ ''وہ اقلیتی قوم سے تھے اور اقلیتی قوم کی نفسیات یہی تقاضا کرتی تھی۔ ہم بڑی وضاحت سے بتا آئے ہیں کہ ایک پورا دور ایسا گزرا جس میں سارا ہندوستان انگریزوں کا دم بھرتا تھا اسی دور میں مسٹر بیک اور اسی جیسے دوسرے انگریزوں نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ہندوستان میں ''اقلیتی قوم'' ہیں اگر کبھی انگریز درمیان سے ہٹ گئے تو ہندو اکثریت مسلم اقلیت کو کھا جائے گی اسی خوف کی بنیاد پر مسلم لیگ وجود میں آئی۔ ہم نے مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل نواب وقار الملک کی اس تقریر کا اقتباس بھی درج کیا ہے جس میں انہوں نے مسلم لیگ کے قیام کے اغراض ومقاصد بیان کئے ہیں اور مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ انگریز حکمرانوں کے جان نثار سپاہی بن کر رہیں اسی جذبہ کے تحت علامہ اقبال نے پوری وفاداری سے جنگ عظیم کے تناظر میں ''پنجاب کا جواب'' کے عنوان سے اپنی وہ نظم پڑھی جس میں فرمایا ''ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو'' بعد میں آکر اہل ہند کا یہ دور وفاداری ختم ہوا فرزند اقبال کے بیان کے مطابق یہ دور 14-1913ء میں ختم ہوا اور عقیدت کیش اقبال جناب سید نذیر نیازی کے مطابق یہ دور 19-1918ء میں ختم ہو گیا۔

مگر کیا علامہ اقبال کے لئے بھی یہ دور ختم ہو گیا؟ ہمارا خیال ہے ختم نہیں ہوا فرزند اقبال اور دیگر عقیدتمندان اقبال کہتے ہیں کہ اقبال کے لئے بھی یہ دور ختم ہو گیا مگر اب فرزند اقبال اگر چہ اقبال کا

دفاع کر رہے ہیں لیکن لفظوں کے معمولی ہیر پھیر کے ساتھ وہی نواب وقار الملک والا فلسفہ دہرا رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اس دور میں بھی اقبال ''مصلحت'' پر عمل کر رہے تھے اور ''اقلیتی قوم کی نفسیات'' کی ترجمانی کر رہے تھے یہ ہاتھ کو سر کے پیچھے سے گھما کر ناک پکڑنے والی بات ہے فرزند اقبال بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ بڑا ہیجانی دور تھا ترکی خلافت کو تہس نہس کر دیا گیا تھا جس ''اقلیتی قوم'' کی نفسیات کا جاوید اقبال صاحب ذکر کر رہے ہیں وہ ''اقلیتی قوم'' بحیثیت مجموعی انگریز کے خلاف ہوگئی تھی مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر مولانا ابوالکلام آزاد کتنی بہادری سے انگریز کے خلاف برسرپیکار تھے کسی نے بھی ''اقلیتی قوم کے نفسیات'' والے فلسفہ کی پروانہیں کی تھی عین اس وقت علامہ صاحب اسی خطاب کو قبول کر رہے تھے اور اپنے قابل صد احترام استاد کے لئے بھی خطاب کا تقاضا کر رہے تھے اس پر خود علامہ اقبال کے عقیدت مند مولانا ظفر علی خان اور عبدالمجید سالک بھی اپنے مقتداء پر طنز کے تیر برسانے پر مجبور ہو گئے تھے پھر ''اقلیتی قوم کی نفسیات'' والے فلسفے کہاں رہ گئے تھے اصل مسئلہ وہ تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے کہا۔

عافیت کوشی ہے پہلے دن سے مسلک آپ کا
اور اس میں مستتر ہے آپ کی فرزانگی
مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آراء تو بھی ہو
چھوڑ دے اس بزدلی کو اور دکھا مردانگی

اصل میں یہ ''عافیت کوشی'' تھی ڈر تھا کہ اگر انکار کرتے ہیں تو کہیں قید و بند کی صعوبات کی نوبت نہ آجائے آگے ''مسلم خوابیدہ'' والا مصرع خود علامہ اقبال کا ہے جسے ظفر علی خان ''بزدلی'' قرار دیتے ہیں۔ اسی ''عافیت کوشی'' کا طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ اسی کو آپ ''فرزانگی'' سمجھتے ہیں فرزند اقبال اسے ''مصلحت'' سے تعبیر کرتے ہیں ہم اس وقت انہیں ان کے والد کا یہ قول یاد نہیں دلاتے۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

ہمارے خیال میں یہ ''مصلحت اندیشی'' عقل کی پختگی ہے ''فرزانگی'' ہے اور یہ شاید ''قوم کی

نفسیات'' نہیں ''شاعر کی نفسیات'' ہوتی ہے کہ ''وہ ''گفتار کا غازی'' ہوتا ہے ''کردار کا غازی'' نہیں ہوتا۔ ایران کے مشہور شاعر انوری نے کہا تھا ''حکیم وشاعر ودرزی چگونہ جنگ کنند'' رہے مولانا حسرت موہانی جیسے شاعر تو وہ درویش ''دیوانے'' ہوتے ہیں ''فرزانے'' نہیں ہوتے یا دوسرے لفظوں میں وہ ''عقل'' میں پختہ نہیں ہوتے ''عشق'' میں پختہ ہوتے ہیں۔

یہ سارے تنقیدی جملے جو ہم نے تحریر کئے ہیں فرزند اقبال کی اس پھسپھسی توجیہہ پر ہیں جس میں کسی طرح کی کوئی معنویت نہیں۔ جس ''قومی نفسیات'' کا فرزند اقبال نام لے رہے ہیں یہ اس وقت مسلمان قوم کی اجتماعی نفسیات نہیں تھی ہاں ان جیسے چند ''انگریز پرستوں'' یا ''حکمران پرستوں'' کی نفسیات تھی جس کے نمائندے اس تقریب میں موجود تھے۔ کاش اُس وقت حضرت علامہ پوری جرأت سے کہہ دیتے ''میں یہ خطاب وصول کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرا استحقاق ہے اور میں انگریز حکمرانوں کا حامی ہوں کیونکہ انہیں ''اپنی قوم' کا محافظ سمجھتا ہوں' ٹیگور ایسا نہیں سمجھتا تھا اس لئے اس نے واپس کر دیا وہ ''دوسری قوم'' سے تعلق رکھتا تھا''۔ مگر وہ ایسا نہ کہہ سکے اور اپنے پرستاروں کے لئے مزید مشکلات پیدا کر گئے اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے قارئین کے لئے خطاب کی سرکاری نوٹیفکیشن کے اصل الفاظ محض معلومات میں اضافہ کی خاطر درج کئے دیتے ہیں۔

Delhi: The ist January 1923

No 2. Gen, his imperial majesty the king emperor of India has been graciously pleased to confer the honour of knight hood, On Doctor Sheikh Muhammad Iqbal, Barrister Lahore, Punjab

J.B. Thompson

Political secretary to the Govt. of India Punjab Gazette, 19 January, 1923, Part II Page 10.

1927ء۔علامہ اقبال عملی سیاست کے میدان میں

علامہ اقبال نے 1926ء میں عملی سیاست کے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا اس سے پہلے بقول جاوید اقبال ''اقبال برصغیر میں عملی سیاست کو ایک بیکار مشق، وقتی شعور وشغب یا تحصیل جاہ کے لئے ذریعہ سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے'' [71]

اس دور میں سیاست کے متعلق ان کی ذاتی رائے وہی تھی جو انہوں نے اپنی اس نظم میں بیان کی ہے جو ''ایک خط کے جواب میں'' کے عنوان سے ان کی کتاب ''بانگ درا'' میں شامل ہے فرماتے ہیں۔

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز
حصول جاہ ہے وابستۂ مذاق تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار میری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش
یہ عُقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ 1914ء سے اقبال ماحول سے بے تعلق ہو کر عزلت نشین ہو گئے تھے اسی دور میں انہیں مولانا شوکت علی نے علی گڑھ کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے دعوت نامہ بھیجا تو حضرت علامہ نے جواب دیا۔

''بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چاردیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے۔دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا تعلق ضرور ہے مگر اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام

---

[71] ایضاً ص 291

کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی،، [72]

اب ذرا ایک نظر اس دور کی پرآشوب تاریخ پر بھی ڈال لیجئے تا کہ معلوم ہو سکے کہ حضرت علامہ کن حالات سے بے تعلق ہو کر '' خدا گڑھ،، میں عزلت نشین ہو گئے تھے جنگ عظیم اول میں اتحادی فوجوں کا ایک نشانہ ترکی بھی تھا ترکی سے تمام مسلمانوں کو بڑی جذباتی وابستگی تھی کیونکہ بغداد کے بعد خلافت عثمانی کو منتقل کر دی گئی تھی جنگ عظیم سے پہلے انگریز حکومت نے مسلمانان ہند سے بہت سے وعدے کئے تھے مگر فتح کے بعد وہ سارے وعدے توڑ دیئے گئے تھے۔ صرف مسلمانان ہند میں ہی نہیں تمام اہل ہند میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی تھی سیاسی طور پر بڑی بے چینی تھی حکومت اس بے چینی کا تدارک استبداد سے کر رہی تھی۔ 1917ء میں رولٹ کمیشن اس مقصد کے لئے وجود میں آیا کہ اہل سیاست کو دبایا جائے رولٹ کمشن نے حکومت کو جو سفارشات بھیجیں وہ بہت بے رحمانہ تھیں ان میں انتظامیہ اور پولیس کو بے تحاشا اختیارات دے دیئے گئے پولیس جسے چاہے بغیر وارنٹ کے گرفتار کر سکتی تھی اور عدالتی حکم کے بغیر ہر مکان پر چھاپہ مار سکتی تھی سیاسی طور پر جن لوگوں کو مجرم قرار دیا جاتا ان کے لئے عذاب ناک سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔ 1919ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہو گیا اور ان سفارشات کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مہاتما گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک بھر میں ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے کرائے محمد علی جناح نے وائسرائے کی امپیریل کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ احتجاج پنجاب میں بھی ہو رہا تھا اسی لاہور میں جہاں حضرت علامہ اقبال اپنا '' خدا گڑھ،، بنائے بیٹھے تھے روز جلوس نکلتے تھے جنہیں پنجاب کا گورنر سر مائیکل اوڈائر انتظامیہ کی مدد سے بری طرح کچل رہا تھا ہم آپ کو یاد دلاتے چلیں کہ یہ وہی سر مائیکل اوڈائر ہے جس کی صدارت میں منعقد ہونے والے لاہور کے جلسہ میں حضرت علامہ اقبال نے اپنی نظم '' پنجاب کا جواب،، پڑھی تھی اور '' ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو،، کہہ کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا بہر حال سر مائیکل اوڈائر کی سفاکیوں کی داستان رقم ہو رہی تھی لاہور کے ایک ایسے ہی جلوس کا آنکھوں دیکھا حال خالد نظیر صوفی صاحب نے اپنی والدہ کی زبانی نقل کیا ہے خیال رہے کہ خالد نظیر صوفی علامہ اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کے نواسے ہیں اور ان کی والدہ حضرت علامہ

---

[72] اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل ص 255

اقبال کی حقیقی بھتیجی اور جاوید اقبال صاحب کی چچیری بہن ہیں ان ہی محترمہ کا بیان ہے۔

''ان دنوں ہم انارکلی میں رہتے تھے ایک روز بازار سے بڑا عظیم الشان جلوس گزرا بے شمار نوجوان بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے اور ''رولٹ بل ہائے ہائے'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے جارہے تھے ہم سب نے دریچوں سے اس کا نظارہ کیا ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بازار میں پھر شور اٹھا ہم سب کھڑکیوں کی طرف لپکے تو ایسا دل فگار منظر نظر آیا کہ روح کانپ گئی چند فوجی گاڑیاں جن میں خون سے لت پت لاشیں بڑی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں آہستہ آہستہ بازار سے گزر رہی تھیں ہر طرف شور تھا کہ جلوس پر گولی چل گئی بڑے بڑے خوبصورت نوجوان جو ابھی چند لمحے پیش تر ''رولٹ بل ہائے ہائے'' کے نعرے لگاتے ہوئے گزر رہے تھے خون میں نہلا دیئے گئے جدھر سے ان شہیدوں کا جلوس گزرتا لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے یہ روح فرسا نظارہ دیکھ کر چچا جان (علامہ اقبال) کے چہرہ غصہ اور ضبط سے تمتا رہا تھا اور ان کے دل کا اضطراب چہرے سے صاف عیاں تھا سردار چچی جان (جاوید اقبال صاحب کی والدہ) زاروقطار رو رہی تھیں انہوں نے روتے روتے چچا جان (علامہ اقبال) سے کہا ''ظالموں نے کتنی ماؤں کے لال موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں'' چچا جان سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے آہستہ سے سر اٹھا کر دل گیر لہجے اور گلوگیر آواز میں فرمایا ''میرے مولا کو یہی منظور ہے سرتابی کی مجال نہیں، وہ ان شہداء کی قربانیاں ضرور قبول کرے گا جنہوں نے عروس آزادی کی مانگ کے لئے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے'' اتنا کہا اور پھر سر جھکا لیا اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے''[73]

اس سلسلہ کا احتجاجی جلسہ 13 اپریل 1919 کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں تھا حاضرین میں ہندو، مسلم، سکھ بلا امتیاز شامل تھے جلسہ گاہ کا محل وقوع کچھ اس طرح کا تھا کہ ہر طرف سے دیواروں کا احاطہ تھا۔ آمدورفت کے لئے صرف ایک راستہ تھا جنرل ڈائیر ایک فوجی دستہ کے ساتھ امرتسر شہر میں آیا تھا اور اس نے اعلان کرایا تھا کہ جلسہ، جلوس ممنوع ہے اور خلاف ورزی ہوئی تو گولیاں برسادی

[73] اقبال درون خانہ ص 56-55 ایک سکھ انقلابی نوجوان جس نے اپنا نام رام محمد سنگھ رکھ لیا تھا کئی سال بعد لندن میں جنرل اوڈوائر کو قتل کیا تھا اور نعرہ لگایا تھا ''شہدائے جلیاں والا باغ'' زندہ باد

جائیں گی جنرل ڈائر کو بتایا گیا کہ جلیانوالہ باغ میں ایک احتجاجی جلسہ ہو رہا ہے اس نے خالص ہندوستانی فوجی جوانوں کا ایک دستہ اپنے ساتھ لیا اور جلیانوالہ باغ پہنچ گیا وہ پچاس سپاہیوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہو گیا اور حکم دیا کہ فوری طور پر جلسہ گاہ خالی ہو جائے اور پھر گولیاں برسانے کا حکم دے دیا فوجی سپاہیوں نے ایک ہزار چھ سو پچاس راؤنڈ چلائے مجمع میں افراتفری پھیل گئی تھی نکلنے کا وہی ایک تنگ راستہ تھا لوگوں نے دیواریں پھاندنے کی کوشش کی مگر ناکام گرتے رہے کہتے ہیں اس وحشیانہ فائرنگ سے تین سو آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے اور لاتعداد زخمی ہوئے بلاشبہ یہ درندگی کا خوفناک مظاہرہ تھا پورا ہندوستان لرز اٹھا جنرل ڈائر نے ہندوستانیوں کے لہو سے ظلم کا ایک اور باب لکھا۔ ہندوستان کا ہر شہر ماتم کدہ بن گیا۔ ہمارا قومی شاعر اقبال جو بقول خویش عرصہ سے ''خدا گڑھ'' میں مقیم تھا اس پر اس حادثہ فاجعہ کا کیا اثر ہوا فرزند اقبال لکھتے ہیں ''اقبال نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک پاک،
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

وہ اقبال جو اس نظریہ کا نقیب تھا کہ ادب برائے زندگی ہوتا ہے اور وہ ادب ادب ہی نہیں جو زندگی کا ترجمان نہ ہو اُس اقبال کا اتنے بڑے حادثہ پر صرف یہی دو بے جان سے شعر کہنا اور لاہور کے واقعہ پر صرف آنسو برسا کہ یہ کہتے رہنا کہ ''میرے مولا کو یہی منظور تھا'' بڑا تعجب خیز ہے اور ہمارا تعجب اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دو بے جان سے شعر بھی حضرت علامہ نے انگریزوں کے قصائد کی طرح اپنے مطبوعہ کلام میں شامل نہ کیے یہ شعر بھی ''باقیات اقبال'' میں لکھے ملتے ہیں جو اقبال کے نظر انداز کردہ کلام پر مشتمل ہے جلیانوالہ باغ کے ہیبت ناک تشدد کے بعد جنرل ڈائر نے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا علامہ اقبال کے معروف عقیدت مند ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اُن دنوں لاہور میں ہی تھے انہوں نے مارشل لاء کے بعد کے واقعات پر قلم اٹھایا ہے لکھتے ہیں ''اس نے

لاہور، قصور، امرتسر، گوجرانوالہ، گجرات، شیخوپورہ اور لائل پور وغیرہ میں مارشل لاء جاری کر کے مظالم کی وہ آگ برسائی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف 1857ء کا کشت وخون ہی پیش کر سکتا ہے چودہ چودہ برس کے بچوں کو ٹکٹکی میں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا گیا کم از کم بیس کوڑوں کی سزا مقرر تھی حالانکہ بڑے سے بڑے سخت جان کی کھال بھی چھ کوڑوں کے بعد ادھڑ جاتی ہے وہ بے ہوش ہو جاتا ہے ہر محلہ سے چُن چُن کر معززین کو گھر سے نکالا گیا تا کہ کھلے بندوں ان کی تذلیل ہو وہ لوگ جو اپنی قابلیت کی بناء پر آئندہ ہائی کورٹ کے جج اور صوبہ کے وزیر بننے والے تھے انہیں گورا فوج کے سپاہیوں سے پٹوا کر پھانسی کے مجرموں کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ [74]

مئی کی گرمی میں لاہور کے کالجوں کے طلباء کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سروں پر اپنے بستر اٹھا کر دن میں چار مرتبہ سولہ میل کا فاصلہ طے کر کے آئیں اور یونین جیک کو سلامی دیں لاہور کے تمام باشندوں کو حکم مل گیا کہ وہ اپنی موٹر کاریں، سائیکلیں بجلی کے پنکھے اور بجلی کے لیمپ فوج کے حوالہ کر دیں اسکول کے بچوں کو ہر روز دھوپ میں کھڑے ہو کر ایک فوجی افسر کے سامنے یہ کہنا پڑتا 'حضور ہم نے کوئی قصور نہیں کیا، ہماری توبہ، آئندہ بھی ہم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوگی۔ ایک پوری بارات کو جس میں دلہا بھی شامل تھا بلاوجہ پکڑ کر کوڑوں سے پٹوا دیا گیا۔ ریل گاڑیوں پر آزادانہ سفر کی مخالفت کر دی گئی۔ عورتوں کی کھلے منہ بے حرمتی کی گئی۔ ایک گلی مقرر کر دی گئی جس میں ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزرنا پڑتا تھا اوپر گورا فوج کا سپاہی بندوق تھام کر کھڑا رہتا تھا اور اگر رینگنے والا شخص ذرا دم لیتا تو سپاہی بندوق کا کندھا اس کی پشت پر مارتا تھا شہر کے بعض معزز اور سربرآوردہ لوگوں کے مکانوں پر مارشل لاء کے احکام کے اشتہار چسپاں کر دیئے جاتے تھے اور حکم تھا کہ اگر کسی نے اس اشتہار کو پھاڑ دیا تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا چنانچہ صاحب خانہ کو محض اپنی عزت وناموس کی حفاظت کے لئے دن بھر اپنے مکان سے باہر کھڑے رہنے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ دیال سنگھ کالج کی بیرونی دیوار پر کسی نامعلوم شخص نے ایک اشتہار لگا دیا جس کا مضمون فوجی حکام کے نزدیک قابل اعتراض تھا اس جرم کی پاداش میں کالج کے پرنسپل کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکم صادر ہوا کہ جونہی کوئی انگریز نظر آئے مقامی

---

[74] زندہ رود ص 245

باشندوں کا فرض ہے کہ فوراً تانگہ سے اتر کر کھڑے ہو جائیں اور جھک کر سلام کریں۔ایک پچیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے کے اندر مئی کے مہینے میں پچیس آدمیوں کو بند کر دیا گیا جہاں وہ ہفتہ بھر مقید رہے اور انہیں بول و براز کے لئے بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی اور ملزموں کو پھانسی اور عمر قید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور سزا ملتی تھی۔قصور میں ستائیس آدمیوں کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کی سزا ملی۔نظام آباد میں چار کو پھانسی اور آٹھ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔امرت سر میں چونتیس کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کو سزا ملی اسی طرح لاہور اور امرت سر ایسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبات تک میں سزاؤں کی وہ بھرمار ہوئی کہ اس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ایک شخص کو محض اس جرم میں کہ اس نے ایک پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''تم ہمارے بھائی ہو ہم تمہارے بھائی ہیں آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ' حبس دوام کی سزا ملی۔یہ سب کچھ مائیکل' ڈوائر کی آنکھوں کے سامنے اس کی منظوری اور رضامندی سے ہوتا رہا'' [75]

یہ طویل اقتباس فرزند اقبال نے بھی نقل کیا ہے۔ہم یہ نقل کر رہے ہیں تو ہمارے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور ہماری روح لرز رہی ہے آپ پڑھ رہے ہیں تو یقیناً آپ کی روح بھی اس محشر سے دوچار ہوگی مگر ہمارا عظیم شاعر ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنے ''خدا گڑھ'' میں عافیت سے مقیم رہا۔فرزند اقبال نے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا اقتباس نقل کر دیا مگر یہ نہ بتایا کہ ان مظالم پر اس حساس شاعر کا قلم کیوں حرکت میں نہیں آیا۔یہی وہ دور ہے جسے رئیس احمد جعفری نے ہنگامہ خیز دور کہا ہے بہر حال اس دور میں وہ سیاست کو بیکار مشق سمجھتے تھے جب انہوں نے اسی جنرل اوڈائیر کی خدمت میں کہا تھا ''ہنگامہ دغا میں میرا سر قبول ہو' اور جب انہوں نے ''سر'' کا خطاب وصول کیا تو بھی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ہم ان سے کوئی تقاضا بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ غالباً ان کے نزدیک جلیانوالہ باغ میں انسانوں کو بھوننا اور اس کے بعد اہل پنجاب کی اور خود اہل لاہور کی انتہا درجہ کی تذلیل پر کچھ کہنا بھی بیکار مشق میں شامل تھا۔یقیناً اس دور میں وہ انگریز کے منظور نظر حضرات میں شامل تھے۔کاش انہوں نے انگریز سے دوخواست کر دی ہوتی کہ کم از کم ایک گلی سے پیٹ کے بل رینگ کر گزرنے والی

---

[75] اقبال کے آخری دو سال ص 103-100 ' زندہ رود ص 246

نامعقول تذلیل روک دی جائے بہر حال یہ دور گزر گیا اور 1926ء میں وہ اس ہنگامہ خیز سیاست میں نہیں آئے جس میں ابنائے وطن کے مصائب پر کچھ کہا جاتا اس سیاست میں قدم رکھا جس میں کوئی خاندار نہیں تھا اسمبلی کی ممبری حاصل کرنے کا معاملہ تھا اور یہ معاملہ تحصیل جاہ کا ذریعہ تھا علامہ صاحب اس سے پہلے اس ممبری کو ''موہومی دنیاوی فائدہ'' سمجھتے تھے۔ چنانچہ 1923ء میں انہیں احباب مجبور کرتے رہے کہ وہ الیکشن میں بطور امیدوار سامنے آئیں لیکن چونکہ اسی حلقہ سے ان کے دوست میاں عبدالعزیز بیرسٹر بھی امیدوار تھے اس لئے انہوں نے دوستوں کے اصرار کے باوجود انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا انہوں نے اسی امر کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خط میں محمد نیاز الدین خان کو لکھا تھا۔

''میں الیکشن کے ہنگامہ میں نہ پڑوں گا لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن ان کے آچکے ہیں مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلہ میں نہیں کرنا چاہتا ان سے دیرینہ تعلقات ہیں اگرچہ مقابلہ کے بعد انتخاب ہوجانا قریباً یقینی ہے تاہم یہ بات میرے نزدیک مروت کے خلاف ہے کہ ایک ''موہومی دنیاوی فائدے'' کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کردوں'' [76]

مگر 1926ء میں وہ اسی موہومی دنیوی فائدہ'' کے لئے کیوں میدان عمل میں آگئے؟ اب میاں عبدالعزیز صاحب نے علامہ صاحب کے مقابلہ میں دستبرداری کا اعلان کردیا یہ اعلان 15 جولائی 1926ء کو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوا اس کے جواب میں حضرت علامہ نے 20 جولائی 1926ء کے زمیندار میں اپنا جواب شائع کرایا انہوں نے میاں عبدالعزیز صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے میدان انتخاب میں اترنے کی وجہ بھی بیان کردی انہوں نے فرمایا۔

''مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا محض اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لئے دوسرا دائرہ کار منتخب کرلیا تھا لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کررہی ہیں کہ اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کردوں شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لئے زیادہ مفید ہوسکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل ونہار گزر رہے ہیں'' [77]

---

[76] مکاتیب اقبال بنام محمد نیاز الدین خان ص 46 خط محررہ 20 جولائی 1923ء

گویا انہوں نے قوم کی مصیبتیں دور کرنے کے خیال سے میدان انتخاب میں قدم رکھا وہ سیاست جواب تک ''بیکار مشق اور حصول جاہ یا موہومی دنیاوی فائدہ'' کا ذریعہ تھی اب معلوم ہوا کہ قوم کی مصیبتیں دور کرنے کے لئے ''دوسرے لوگوں'' پر چھوڑے رکھنا غلط تھا۔ بہر حال علامہ میدان انتخاب میں اُترے اُن کے پرعظمت مقام کا خیال رکھتے ہوئے آپ کے مقابلہ میں صرف ایک غیر معروف بیرسٹر ملک محمد دین رہ گئے میاں عبدالعزیز بارایٹ لاء اور ملک محمد حسین صدر بلدیہ نے اپنے کاغذات واپس لے لئے ملک محمد دین ارائیں فیملی کے تھے انہوں نے اقبال کے خلاف انتخابی مہم شروع کی تو اُن کا بڑا حملہ یہ تھا کہ اقبال ''وہابی العقیدہ'' ہیں انہوں نے سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دیئے ہیں اس کے مقابلہ میں ملک محمد دین اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ ''حزب الاحناف'' نام کی سنی تنظیم ان کے ساتھ ہے بہر حال مقابلہ ہوا لاہور شہر کے تمام مشاہیر اقبال کے ساتھ تھے بقول جاوید اقبال ''مذہبی حلقوں میں شیعہ رہنما سید علی حائریؒ خواجگان نارووال، احمدیان قادیان اور احمدیان لاہور نے بھی اقبال کی تائید وحمایت میں اعلان جاری کئے۔ انجمن اسلامیہ میاں میر اور اہل حدیث بھی اقبال کے ساتھ تھے'' [78]

6 دسمبر 1926ء کو سرکاری طور پر الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا اس زمانہ میں حلقہ کے کل ووٹروں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی جن میں سے ساڑھے آٹھ ہزار ووٹ پول ہوئے اقبال کو پانچ ہزار چھ سو پچھتر ووٹ ملے اور ملک محمد دین کو دو ہزار چھ سو اٹھانوے ووٹ ملے ملک محمد دین کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ زمیندار نے اداریتی نوٹ میں لکھا ''جن مسلمانوں نے ملک محمد دین کے حق میں اپنے ووٹ دیئے ان میں دو ہزار تو وہ ناخواندہ ارائیں تھے جو اقبال کی علمی قابلیت سے ناواقف محض تھے باقی چار پانچ سو پرچیاں غالباً ان حضرات نے ڈالیں جنہیں ''بریلوی حنفیت'' کا ہیضہ تھا اور جو ایک ضال ومضل اخبار اور حزب الاحناف کے اسلام فروشانہ پراپیگنڈے سے متاثر ہو گئے'' [79]

---

[77] بحوالہ گفتار اقبال از محمد رفیق افضل ص 14 [78] زندہ رود ص 299

[79] ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد ص 76

حضرت علامہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر کونسل میں پہنچ گئے کونسل یا اسمبلی کی رکنیت کا پہلا مرحلہ حلف وفاداری ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے 3 جنوری 1927ء کو مسٹر C.M.King, CSI.CIE کی صدارت میں تاج برطانیہ کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ (80)

یہ حلف اٹھانے والے ہم تم نہیں حضرت علامہ اقبال تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمیشہ ان کی زبان ان کے دل کی ترجمان رہی اور پھر حلف اٹھاتے ہوئے تو وہ کبھی ایسی بات نہیں کر سکتے تھے جس پر ان کا دل ان کی زبان سے ہم آہنگ نہ ہو پس یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ وہ 1927ء میں بھی تاج برطانیہ کے وفادار تھے اور اُن کے دل پر اس دور کی سیاسی ہنگامہ خیزیوں کا کوئی اثر نہ تھا وہ اپنے طور پر پوری دیانتداری سے قوم کی خدمت کر رہے تھے۔ 19 جولائی 1927ء کو انہوں نے کونسل ہال میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

''تازہ فسادات لاہور میں ہندو اور مسلمان دونوں وفود کی صورت میں کئی دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے اور ہر دو وفود نے مخالف مذہب فریق کے تحقیقاتی افسروں کی شکایت کی اس قسم کے ایک وفد میں بطور ممبر میں بھی شریک تھا (آوازیں شیم، شیم) یہ شرم کی کوئی بات نہیں ہمیں واقعات کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنا ہے۔ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ صورت حالات اس قدر نازک ہو چکی ہے کہ آپ کو معلوم ہے؟ ڈپٹی کمشنر نے ہمیں کیا جواب دیا؟ اس نے کہا اور میرے خیال میں اس نے جو کچھ کہا اس میں وہ حق بجانب بھی تھا اس نے کہا ''اصلاحات کی سکیم کے نفاذ سے پہلے پولیس میں 120 برٹش آفیسر تھے اور اب صرف 68 ہیں ہمارے برٹش افسروں کی تعداد کافی نہیں ہے اور دونوں فرقے یوروپین افسر مانگتے ہیں۔ بدقسمتی سے مرے دوست نانک چند نے کہا ہے کہ حکومت نے رنگ ونسل کا امتیاز اڑا دیا ہے اور اس طرح وہ آسامیاں جو پہلے برٹش افسروں کو ملتی تھیں اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے حصہ میں آ گئی ہیں لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بڑی سخت غلطی کی ہے اور اگر اب پھر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا (آوازیں نہیں، نہیں، نہیں) میں یہ کہہ رہا ہوں تو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر کے کہہ رہا ہوں'' (81)

(80) آفیشل رپورٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل ج 10-A ص 4

اس تقریر کا خود مسلمان زعماء نے سختی سے نوٹس لیا مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اردو اخبار ''ہمدرد'' میں اس پر قسط وار تبصرہ کیا۔ 16 اگست 1927ء کی قسط کا عنوان تھا ''طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ'' ''ہمدرد'' 19 اگست کی قسط کا عنوان تھا ''شاعر اسلام۔ اقبال'' ان اقساط میں جو کچھ کہا گیا اس کے چند اقتباس یہ ہیں۔ ''دیکھئے شمع وشاعر'' کا مصنف کس طرح ''لندن ٹائمز'' اور اسکے مؤکلوں کا آلہ کار بن رہا ہے، کہنا پڑتا ہے کہ بہتر ہو کہ سارے ہندوستان کو تو سوراج دے دیا جائے مگر ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالکم کے پنجاب کو سر مائیکل اوڈائیر، کرنل فرینک جانسن، کرنل و برائین اور مسٹر اسمتھ کو پھر ان پر حکومت کرنے کے لئے بلا لیا جائے'' (82)

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تقریر پڑھ کر میری نیند غائب ہوگئی اور میرے قلب کو اس قدر دھچکا لگا کہ میں بیان نہیں کر سکتا'' (83)

''اقبال کو نہ جانے کیا سوجھی کہ کونسل کو چل دیئے اور جمہور سے رائے حاصل کرنے کے لئے در بدر پھرے اور اپنے مد مقابل کو بالآخر ہرا کے ملک معظم اور اس کے ورثاء کی وفاداری کا حلف اٹھا کر پنجاب کونسل میں شریک ہوئے ہمیں اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ خدا نے جس شخص کو ''شمع وشاعر'' اور ''اسرار ورموز'' کے لکھنے کی عجیب وغریب قدرت عطا فرمائی تھی۔ وہ پنجاب کونسل میں جا کر محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق ساگر چند) کی طرح یہ مطالبہ کرے گا کہ جو چند بڑے بڑے عہدے اس وقت تک ہندوستانیوں کو دیئے گئے ہیں وہ بھی ان سے چھین لئے جائیں اور انگریزوں کو دے دیئے جائیں'' ''تعجب ہے آج اقبال لالہ جی کے خوف سے اوگلوی صاحب کی گود میں گھسا جاتا ہے'' (84)

علامہ اقبال کی متذکرہ تقریر کا فرزند اقبال نے بھی حوالہ دیا ہے اور اس پر اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر ان سے کوئی جواب نہیں بن سکا اُن کے ذہن پر دو بوجھ ہیں ایک انہیں اپنے والد صاحب کا دفاع کر کے ثابت کرنا ہے کہ وہ آزادی ہند کے مجاہد اعظم تھے دوسری طرف وہ دیکھ رہے ہیں کہ والد صاحب تو سر کا خطاب وصول کر کے اور تاج برطانیہ کی وفاداری کا حلف اٹھا کر اسمبلی ہال میں

(81) ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے ار طارق ص 69-68 (82) مضامین محمد علی جوہر حصہ دوم مرتبہ محمد سرور ص 430 (83) ایضاً ص 424 (84) ایضاً ص 440

کھڑے ہندوستانی افسروں کی بجائے انگریز افسروں کی انصاف پسندی کے باعث ان کی تعداد زیادہ کرنے کا مطالبہ کرر ہے ہیں۔فرزند اقبال کو ادھر ادھر کی عذر تراشیاں کرنے کی بجائے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دینا چاہئے کہ ان کے والد پوری دیانتداری سے سمجھتے تھے کہ ہندوستانی افسروں کی بجائے برطانوی افسر زیادہ انصاف پر مبنی طرز عمل رکھتے تھے۔

اصل میں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں انگریزوں نے مسلمانوں کے ذہن میں بٹھا دیا تھا کہ ہندو صدیوں کی غلامی کا بدلہ لینے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں اگر کبھی انگریز درمیان سے ہٹ گیا تو وہ مسلمانوں کو کچا چبا جائیں گے اس لئے مسلمانوں کو انگریز حکومت کا وفادار رہنا چاہئے اور یہی بات مسلمانوں کی سیاسی پارٹی مسلم لیگ کا مقصد وجود تھی انگریزوں نے مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلایا تھا کہ اگر افسروں کی بھرتی کا معیار مقابلے کا امتحان رکھا جائے تو ہندو زیادہ پڑھے لکھے اور زیادہ قابل ہیں اس لئے تمام پوسٹوں پر وہی قابض ہو جائیں گے اس لئے مسلمانوں سے مقابلہ کے امتحانوں کی بھی مخالفت کرائی گئی اور کوٹہ سسٹم کا تصور ان کے ذہن میں بٹھا دیا گیا آج بھی ہم میرٹ کے دشمن ہیں تو اس کی بنیادیں میں ہمارے ذہنوں میں انگریزوں نے ہی رکھی تھیں۔اقبال کی اس تقریر کا پس منظر جاوید اقبال نے بھی یہی بتایا کہ سردار اجل سنگھ نے مقابلہ کے امتحان کے انعقاد کی قرارداد پیش کی تھی اور اقبال نے جواب میں جو تقریر کی تھی اس میں یہ جملے بھی آ گئے تھے۔

1932ء

گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے علامہ اقبال انگلینڈ تشریف لے گئے تو نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی طرف سے گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور برطانیہ کے بعض زعماء کو بلایا گیا تھا اور علامہ اقبال کے لئے استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا اقبال نے اپنی مختصر تقریر میں واضح کیا کہ ''مسلمانوں میں جرأت ہے اور انہوں نے برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ پر خلوص اور وفاشعاری کے تعلقات استوار رکھے ہیں'' [85]

---

[85] زندہ رود ص 492

نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی بنیاد مفار قوہرسن (Farquharson) نے رکھی تھی اور اس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا'' دنیا بھر کے مسلمانوں کو برطانیہ سے قریب کرنا علامہ اقبال شروع سے ہی اس لیگ کی کوشش کے معترف تھے [86]

1933ء

1929ء میں امان اللہ خان شاہ افغانستان کے خلاف بغاوت ہوئی انہیں ملک بدر کر دیا گیا اور بچہ سقہ ملک پر قابض ہوگیا جنرل نادر خان افغانستان کی طرف سے فرانس میں سفیر تھے برطانیہ نے انہیں بلا کر افغانستان میں داخل کرا دیا اور ہتھیار فراہم کئے ان ہتھیاروں کی مدد سے نادر خان نے کابل فتح کر لیا اور 16 اکتوبر 1929ء کو افغانستان کے بادشاہ بن گئے جنرل نادر شاہ کے علامہ اقبال سے قریبی تعلقات تھے 15 نومبر 1933ء کو نادر شاہ قتل ہو گئے اور ان کے فرزند ظاہر شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا علامہ اقبال نے نادر شاہ کو شہید قرار دیا اور اپنے خطوط میں ان کے دو اوصاف کا خصوصی طور پر ذکر کیا ایک یہ کہ'' نادر شاہ دیندار اور خدا پرست بادشاہ تھے اور کابل میں ان کے متعلق ایسی حکایات مشہور ہیں کہ ان کو سن کر صدیقؓ اور فاروقؓ یاد آ جاتے ہیں'' [87]

دوسرے یہ کہ نادر شاہ کے حکومت برطانیہ کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات تھے I Found him quite friendly toward england [88]

1935ء

1934ء میں علامہ پر بیماری کا حملہ ہوا اور وکالت کا کام تقریباً ختم ہوگیا مئی 1935ء میں والدہ جاوید فوت ہوگئیں اور علامہ کی پریشانیاں بڑھ گئیں ذہنی، جسمانی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے کہ گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی طرف سے یہ اپیل شائع ہوئی جس میں سلور جوبلی فنڈ کے لئے چندہ جمع کرانے کو کہا گیا۔

---

[86] اقبال ریویو مجلہ اقبال اکادمی شمارہ جولائی تا اکتوبر 1977ء ص 94

[87] خط اقبال بنام راغب حسن محررہ 12 نومبر 1933ء مشمولہ جہان دیگر ص 59

[88] اقبال کا خط تھامسن کے نام محررہ 18 نومبر 1933ء بحوالہ'' اقبال کے سیاسی نظریات چوراہے پر'' ص 76

''6 مئی 1935ء کو ان تمام ممالک کے لوگوں کی طرف سے جو ہنر میجسٹی شاہ انگلستان کو اپنا حکمران تسلیم کرتے ہیں اعلیٰ حضرت ملک معظم کی تخت نشینی کی پچیسویں سالگرہ شکرگزاری اور مسرت کے ساتھ منائی جائے گی پنجاب نے بار بار تاج کے ساتھ اپنی روایتی وفاداری کا ثبوت مہیا کیا ہے اور جنگ عظیم کے دوران میں اس نے آدمیوں اور روپیہ سے جو امداد دی تھی اس کی یاد ابھی تک دلوں میں تازہ ہے'' 89

اس اپیل کے جواب میں چندہ دہندگان نے اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دیا چندہ دہندگان کی فہرست میں نمبر 6 پر علامہ اقبال کا اسم گرامی ہے اور رقم کے خانہ میں سو-/100 روپے درج ہیں مطلب یہ کہ مالی پریشانیوں کے اس دور میں بھی حضرت علامہ نے اپیل پر جیسے تیسے سو روپے جمع کرا کے فہرست میں اپنا نام لکھانا ضروری سمجھا۔

اس طرح کے سیدھے سادے انگریز دوست اقبال پر بھی سنا ہے انگریزوں کو پوری طرح اعتماد نہیں تھا فرزند اقبال نے حفیظ رومانی صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے۔

''اقبال کی شاعری کے متعلق ابتداء ہی سے انگریزی حکومت کی خفیہ رپورٹوں کا سلسلہ جاری تھا اور معائنہ کی غرض سے ان کی نظموں ''تصویر درد'' اور ''شمع و شاعر'' کے انگریزی ترجمے پریس برانچ اور خفیہ پولیس پنجاب کی ہدایات کے تحت ہوئے تھے حکومت پنجاب کے اس خفیہ ریکارڈ کی تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون ''علامہ اقبال کی شاعری۔ حکومت کی خفیہ رپورٹوں کے آئینے میں'' از حفیظ رومانی نوائے وقت اشاعت خصوصی بیاد اقبال شمارہ 21 اپریل 1983ء'' (زندہ رود ص 676)

ویسے بانگ درا میں آپ بھی ''تصویر درد'' اور ''شمع و شاعر'' دونوں نظمیں پڑھ لیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھرتے ہوں۔ تاہم فرزند اقبال جناب ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال کی زبانی آپ بھی سن لیں کہ یہ خفیہ رپورٹیں کس طرح مرتب ہوتی تھیں فرزند اقبال لکھتے ہیں۔

''اسی سال (1926ء میں) اقبال کے اصرار پر چودھری محمد حسین نے پنجاب سول

89 کتاب ''مصور یادگار'' شہنشاہ جارج پنجم ایڈورڈ ہشتم شائع کردہ فیروز سنز 119 سرکلر روڈ لاہور

سیکرٹریٹ میں ملازمت کرلی۔ وہ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے اقبال ابتداء سے ہی چودھری محمد حسین پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور انہیں ایک مخلص مسلمان اور اپنا مخلص دوست سمجھتے تھے چودھری محمد حسین بھی نہ صرف اقبال کے باعمل نیاز مند تھے بلکہ ان کی ذات سے بے پناہ محبت کرتے تھے ملازمت اختیار کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد انہیں صوبہ کی انگریزی حکومت نے ڈیوٹی سونپی کہ اقبال یا ان کی ملاقاتیوں کے ساتھ گفتگو کی خفیہ رپورٹ حکومت تک پہنچاتے رہیں چودھری محمد حسین سخت شش و پنج میں مبتلا ہوئے اور نوکری چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا لیکن چونکہ وہ اقبال کے اصرار پر ملازم ہوئے تھے۔ اس لئے اقبال کے استفسار پر انہیں ساری حقیقت بیان کردی اقبال نے انہیں ملازمت جاری رکھنے اور حکومت کی سونپی ہوئی ڈیوٹی بجالانے پر مجبور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری محمد حسین نے ملازمت ترک نہ کی حکومت کے لئے خفیہ رپورٹ وہ اور اقبال دونوں اکٹھے بیٹھ کر ہی مرتب کیا کرتے اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک یونہی جاری رہا'' [90]

چودھری محمد حسین جیسے ''مخلص مسلمان'' اور ''باعمل نیازمند'' کو اپنی ڈیوٹی کو غلط طریقہ سے سرانجام دینے کا مشورہ دینا اور اس کام میں اس کی معاونت کرنا علامہ اقبال کی سطح کے آدمی کے لئے جائز تھا یا ناجائز؟ اس پر فتویٰ صادر کرنا تو علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین کا کام ہے۔ ہمارے نزدیک انتہائی پست سطح کے لوگ بھی شاید ایسی حرکت کو اپنے کردار پر داغ سمجھیں گے ہمارا خیال ہے اقبال اس حرکت کے مرتکب نہیں ہوئے ہونگے۔ اس روایت کے متعلق ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے بتایا ہے کہ یہ بات بعد میں مجھے خود چودھری محمد حسین نے بتائی تھی [91]

چودھری محمد حسین کی یہ بات ہی اگر مشکوک سمجھ لی جائے تو ہمارے ممدوح کے کردار پر کم از کم یہ داغ تو نہیں رہتا مگر فرزند اقبال کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے والدگرامی کو انگریزوں کا کٹر دشمن اور جنگ آزادی کا عظیم مجاہد ثابت کرنے بیٹھے ہیں تو یہ اعتراض وارد ہو جاتا ہے کہ وہ سفاک اور سنگدل انگریز جو ذرا ذرا سی حرکت پر سینکڑوں ہندوستانیوں کو بھون دیتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر کو جیلوں میں بند رکھتا ہے وہ اس سب سے کٹر دشمن کو کیوں کھلی چھوٹ دیتا ہے کہ آرام سے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہے اور نہ صرف یہ کہ جیل میں نہیں ڈالتا اسے سر کے

---

[90] ''زندہ رود'' ص 294-293 [91] ایضاً ص 676

خطاب سے بھی نوازتا ہے اور اس کی اتنی ناز برداری کرتا ہے کہ اُس کے کہنے پر ایک ایسے شخص کو شمس العلماء کا خطاب عطا کر دیتا ہے جس کے علمی فضائل کا کوئی ٹھوس ثبوت اس کی تصنیف کی صورت میں موجود نہیں شاید ان مشکلات کا یہی حل تھا کہ لکھ دیا جائے کہ علامہ اقبال کے متعلق بھی خفیہ رپورٹیں لکھی جاری تھیں مگر چونکہ ان پر چودھری محمد حسین کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور یہ رپورٹیں اقبال چودھری صاحب سے مل کر لکھ دیتے تھے اس لئے یہ رپورٹ ''سب اچھا'' کی رپورٹ ہوتی تھی۔ اور اسی کا اثر تھا کہ اقبال قید و بند کی صعوبات سے بچے رہے۔ ہم اس دلیل پر مطمئن نہیں ہوئے کیونکہ انگریز حکمران بڑے دانا، ہوشیار اور تیز فہم تھے وہ اس چکر سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے اور پھر اقبال کے اگر دوست بہت تھے تو دشمن بھی کچھ کم نہ تھے وہ انگریزوں تک ایسی خبریں پہنچانے اور اصل راز کھول دینے میں کبھی تاخیر نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی کوئی سرگرمی بھی انگریز حکمرانوں کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی نہیں تھی وہ شاعر تھے بہت بڑے شاعر تھے اور بس، انگریز بھی شاید انہیں وہی کچھ سمجھتا تھا جتنا کچھ خود جاوید اقبال نے ''صحیفہ'' کے اقبال نمبر حصہ اوّل ص 140 کے حوالہ سے خود اقبال کی زبان سے بیان کرایا ہے جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''مولانا محمد علی جوہر لاہور پہنچے اور اقبال سے ملنے کے لئے انارکلی والے مکان میں گئے اقبال بیٹھک میں دھسہ اوڑھے بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے تھے مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی مولانا محمد علی نے انہیں دیکھتے ہی طنزاً کہا'' ظالم ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کے کش لگاتا رہتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں'' اقبال نے برجستہ جواب دیا'' مولانا میں تو قوم کا قوال ہوں اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر ہوحق میں تہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے'' [92]

ہم یہ طویل مقالہ اسی بات پر ختم کرتے ہیں اب آپ کی مرضی ہے کہ اقبال کو ''قوال'' کہیں یا ایسا ''مجاہد آزادی'' جو انگریز حکمرانوں کے نزدیک ''اچھا آدمی'' تھا۔

☑

[92] ایضاً ص 247

اقبال اور حصول معاش

ہمارے ہاں ایک بڑے آدمی کے ساتھ یونہی کچھ تصورات وابستہ کرلئے جاتے ہیں ہم سمجھتے ہیں جیسے وہ انسان ضروریات سے بلند ہے اُسے کسی طرح کی کوئی حاجت ستاتی نہیں وہ اگر حصول معاش کے لئے کہیں ملازمت کرتا ہے تو ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ اس دنیا کا آدمی ہے اس کی اپنی ضروریات ہیں س کے لواحقین کی ضروریات ہیں اور جب تک وہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کرے گا یا کسی طرح کے وسائل تلاش نہیں کرئے گا وہ زندہ نہیں رَہ سکے گا۔ہم اپنے آئیڈیل کو ان تمام حاجات سے بے نیاز دیکھنا چاہتے ہیں۔اسی دھن میں فرزند اقبال جناب ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے والد بزرگوار کو انگریزوں کی ملازمت سے متنفر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسا کرنا انہوں نے اِس لئے بھی ضروری سمجھا کہ انہیں علامہ اقبال کو جنگ آزادی کا ہیرو بھی ثابت کرنا تھا فرزند اقبال رقم طراز ہیں۔

''اقبال کی زندگی کا سرسری مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی انگریزوں کی ملازمت کرنے کے لئے تیار نہ تھے انگلستان سے واپس آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے لیکن کچھ مدت کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا'' [1]

استعفیٰ کیوں دیا؟ اس سوال کو بھی بے جواب نہیں چھوڑا گیا۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے استعفیٰ دینے کی وجہ پوچھی تو علامہ اقبال نے فرمایا۔

''میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں

---

[1] زندہ رود ج3 ص118

علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا سا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے اس دن سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ دل میں ٹھان لی ہے کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا'' ❷

ذرا غور سے دیکھئے اس جواب سے تو کہیں بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ ملازمت سے نفرت کی وجہ انگریز تھے یہاں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام نہیں ہوتا دوسری یہ کہ اس میں ذلت ہوتی ہے اور پرنسپل اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے وہ کسی کلرک سے بات کر رہا ہو۔

مگر اسی ''استعفیٰ'' پر یہی سوال ان کا ملازم علی بخش بھی کرتا ہے اسے حضرت علامہ کچھ اور جواب دیتے ہیں وہ بھی دیکھ لیجئے ''علی بخش انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکل ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا اب میں بالکل آزاد ہوں جو چاہے کروں جو چاہے کہوں'' ❸

ہم کم فہم لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو جواب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو دینا چاہئے تھا وہ علامہ صاحب نے علی بخش کو دیا علی بخش کی بلا جانے کہ علامہ صاحب کیا باتیں کہنا چاہتے ہیں اور جو کہنا چاہتے ہیں وہ انگریز کی نوکری میں کیوں نہیں کہی جا سکتیں یہ چیزیں تو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سمجھ سکتے تھے اس طرح ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو جو جواب دیا گیا ہے وہ علی بخش کو دینا چاہئے تھا۔ بہر حال علی بخش کو دیا جانے والا جواب یہ ظاہر کرتا ہے کہ علامہ صاحب جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ انگریز کی ملازمت میں نہیں کہہ سکتے تھے اس لئے انہوں نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔ اقبال سرکاری ملازمت کرتے رہے۔

ان کی سرکاری ملازمت کے کچھ حصہ کا ریکارڈ ایک نظر دیکھ لیجئے۔

1۔ 13 مئی 1899ء تقرر بحیثیت میکلوڈ پنجاب عریبک ریڈر یہ آسامی تین سال کے لئے

❷ آثار اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید حیدر آباد دکن ص 22,23 ❸ زندہ رود ج 3 ص 119

مشتہر ہوا کرتی تھی۔

2۔ 28اپریل 1899ء تا23نومبر 1899ء پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر عارضی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں، عریبک ریڈر کی ملازمت کے ساتھ یہ تقریباً سات ماہ کی ملازمت جاری رہی۔

3۔ 4جنوری 1901ء تا31جنوری 1901ء لالہ جیارام کی جگہ چندروز تک اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی حیثیت سے کام کیا۔

4۔ 16اکتوبر 1902ء سے 31مارچ 1903ء تک اسسٹنٹ پروفیسر انگلش کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں عارضی آسامی پر کام کیا۔

5۔ یکم اپریل 1903ء سے 31 مئی 1903 اورینٹل کالج لاہور میں ملازمت کی۔

6۔ 3جون 1903ء سے اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کام کیا [4]

اقبال کا تعلیمی ریکارڈ کچھ اس قسم کا ہے کہ اقبال بحیثیت طالب علم بی اے میں انگریزی اور فلسفہ کے مضامین تو گورنمنٹ کالج میں پڑھتے اور عربی زبان وادب اورینٹل کالج میں پڑھتے تدریس کے سلسلہ میں اس وقت دونوں کالجوں میں اشتراک عمل تھا بتایا گیا ہے کہ اقبال نے 1897ء میں بی اے عربی اور انگریزی میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور تمغے پائے علامہ اقبال کے دوست کلاس فیلو اور بعد میں ہندوستانی سیاست کے ایک اہم کردار بن کر نمودار ہونے والے سر فضل حسین کے فرزند عظیم حسین نے اپنے والد پر جو کتاب لکھی ہے اس میں وہ تحریر کرتے ہیں۔

''1897ء میں بی اے کے امتحان میں کل 105 طالب علم کامیاب ہوئے تھے جن میں سے صرف چار نے فسٹ ڈویژن حاصل کی تھی اقبال اور ان کے کلاس فیلو فضل حسین سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے تھے مسلمان طالب علموں میں اقبال اوّل آئے تھے اور فضل حسین دوم'' [5]

اقبال نے 1899ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا اور تھرڈ ڈویژن لی لیکن چونکہ یونیورسٹی بھر میں

---

[4] ملازمت کے یہ ریکارڈ پوری تفصیل سے ''اقبال ایک تحقیقی مطالعہ کے صفحات 55 تا64 پر آ گئے ہیں

[5] A Political Biography P 112

صرف وہی پاس ہوئے تھے اس لئے تھرڈ ڈویژن لینے کے باوجود پنجاب بھر میں اوّل بھی وہی رہے اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا ❻

اقبال نے ساتھ کے ساتھ لاء کالج کی کلاسوں میں بھی داخلہ لے لیا تھا لیکن ایف ای ایل میں ''جورس پروڈنس'' کے پرچہ میں فیل ہو گئے تھے اب انہوں نے کلاسیں اٹنڈ نہیں کیں اور 1900ء میں درخواست دی کہ اُنہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے لیکن وہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ اور انہوں نے قانون کا امتحان دینے کا خیال ترک کر دیا۔ اقبال نے حصول معاش کی تگ و دو میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا مقابلہ کا امتحان دیا کہتے ہیں انہوں نے یہ امتحان پاس کر لیا مگر ایسے امتحانوں کے لئے انگریز نے کچھ عجیب لکیریں کھینچ رکھی ہیں اور ہم آج بھی ان ہی لکیروں کو پیٹ رہے ہیں ہوتا یہ ہے کہ پہلے تحریری امتحان ہوتا ہے۔ طالب علم بیچارہ شب و روز محنت کر کے پرچے دیتا رہتا ہے اتنی کھکھیڑ پہلے برداشت کی جاتی ہے جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے تو اس کا میڈیکل ہوتا ہے اس میں اگر کوئی نقص نکلتا ہے تو اسے فیل کر دیا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا پہلے کیوں نہیں کرایا جاتا کہ اگر جسمانی طور پر طالب علم میں کوئی نقص ہے تو اُسے ناکارہ قرار دے دیا جائے تاکہ وہ تحریری امتحان کی مشکلات سے بچ جائے مگر ایسا نہیں کیا جاتا کیوں؟ اس کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا بس پیچھے سے ہوتا آ رہا ہے اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا اس نے باقی امتحان تو پاس کر لیا مگر میڈیکل بورڈ نے طبی نقطہ نگاہ سے ان کی دائیں آنکھ کی بینائی میں کمزوری پائی اور انہیں ان فٹ قرار دے کر اسسٹنٹ کمشنری کا دروازہ ان پر بند کر دیا۔ ❼

اقبال کی دائیں آنکھ میں یہ نقص بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا ڈاکٹر کہتے تھے دائیں آنکھ سے خون لیا گیا اقبال کے اپنے بیان کے مطابق ان کی والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ دو سال کی عمر میں انہیں جونکیں لگوائی گئی تھیں ❽

بہر حال اقبال کو یہ ملازمت نہ مل سکی فرزند اقبال لکھتے ہیں۔

''اقبال کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شریک ہونے سے تو یہی ظاہر ہوتا

---

❻ زندہ رود ج 1 ص 77 ❼ ذکر اقبال از عبد المجید سالک ص 23 ❽ ملفوظات اقبال از ابواللیث صدیقی ص 154

ہے کہ شروع میں ان کا اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یوروپ جانے کا ارادہ نہ تھا مگر انہیں سرکاری ملازمت نہ مل سکی اس طرح قانون کے امتحان میں بھی ناکامی ہوئی اور ان کے لئے صرف تدریس کا مشغلہ رہ گیا جو بجائے خود کوئی معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا'' (9)

دیکھا آپ نے یہاں کہیں بھی وہ بات نہیں آئی کہ انہیں انگریز کی ملازمت سے نفرت تھی یا ''ان کے دل میں کچھ ایسی باتیں تھیں جنہیں وہ انگریز کی ملازمت میں کھل کر نہیں کہہ سکتے تھے بتایا گیا ہے تو صرف یہ کہ ان کیلئے صرف تدریس کا شعبہ رہ گیا تھا جو معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا۔

علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد، اقبال سے تقریباً اٹھارہ سال بڑے تھے اقبال کے والد شیخ نور محمد تصوف میں ڈوب گئے تھے اس لئے گھر کا سارا بوجھ شیخ عطا محمد کے کندھوں پر تھا شیخ عطا محمد مضبوط جسم کے بالا قامت آدمی تھے اقبال نے اپنی مشہور نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں اپنے برادر بزرگ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بلند قامتی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

وہ جواں قامت میں ہے جو صورت سرو بلند

شیخ عطا محمد کی یہی بلند قامتی ان کے فوج میں بھرتی ہونے میں ترجیحاً کام آئی وہ رسالے میں بھرتی ہوئے کچھ عرصہ بعد انہیں تھامپسن انجینئرنگ سکول رڑکی میں تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا امتحان پاس کر کے وہ فوج کے شعبہ بارک ماسٹری میں تعینات ہوئے ساری عمر سرکاری ملازمت کی اقبال کو علمی لحاظ سے پروان چڑھانے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یوروپ بھیجنے میں انہوں نے اعانت کی (10)

بہر حال اقبال یوروپ گئے وہاں جا کر انہوں نے قانون کی تعلیم کا شوق پورا کیا اور بار ایٹ لاء کیا اور پی ایچ ڈی بھی کیا اب کیا صورت حال تھی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''یوروپ سے واپسی کے بعد اقبال کے لئے سب سے اہم مسئلہ فراہمی روزگار تھا انہوں نے

---

(9) زندہ رود ج 1 ص 105 (10) ایضاً ص 20 ڈاکٹر جاوید اقبال دوسری جگہ لکھتے ہیں'' خاندان میں صرف شیخ عطا محمد ہی کمانے والے تھے شیخ نور محمد اپنا کاروبار قریب قریب ترک کر چکے تھے اور اگر وہ جاری بھی رہا تو وقت گزرنے کے ساتھ کوئی معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا پس مالی اعتبار سے اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے اقبال شیخ عطا محمد کے دست نگر تھے کیونکہ اقبال کو اگر شیخ عطا محمد کی اعانت میسر نہ آتی تو ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا (زندہ رود ج 1 ص 72,73)

اپنی تعلیم کی تکمیل بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی مالی امداد سے کی تھی اور اب شیخ عطا محمد کی فوج سے ریٹائر منٹ میں چند سال رہ گئے تھے علاوہ اس کے ان کی اپنی عیال داری بھی تھی تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کے باپ تھے نیز والدین کے بڑھاپے کا سہارا بھی وہی تھے'' (11)

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال چاہتے تھے کہ بطور وکیل پریکٹس کریں مگر بطور وکیل کاروبار جمانے کے لئے بھی پیسہ درکار تھا یہ کام بھی شیخ عطا محمد نے حسب استطاعت کر دیا دفتر کے لئے کرائے پر مکان لے دیا ایک منشی کا انتظام کیا اور قانون کی کچھ ضروری کتابیں خرید کر دیں ادھر ان کے لئے گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر کے لئے بھی جاب نکل آئی اقبال نے کچھ عرصہ یہ ملازمت کی پھر یا تو انہیں ملازمت کرنا تھی اور یا پریکٹس جب ایسا معاملہ آپڑا تو کیا ہوا علامہ کے یار کمار مرزا جلال الدین بار ایٹ لاء لکھتے ہیں۔

''ہم سب نے یہی رائے دی کہ سرکاری ملازمت میں اوّل تو قوت عمل کے سلب ہونے کا احتمال ہے دوسرے محکمہ تعلیم میں وسعت کے امکانات بہت محدود ہیں چنانچہ اگر سرکاری ملازمت پر ہی نگاہ ہو تو وکالت ہی کیوں نہ رکھی جائے جس میں ترقی کے جملہ مدارج ہیں جج کا عہدہ بھی ہے اس پر انہوں نے کالج سے تعلقات منقطع کر لیئے اور وکالت پر اکتفاء کی'' (12)

یہاں بھی کالج کی نوکری چھوڑنے پر وہ علی بخش کو کہی جانے والی بات کہیں نہیں آئی ''قوت عمل کے سلب ہونے کی بات ان معانی میں ہے کہ لگی بندھی تنخواہ کے باعث آدمی مزید آمدنی پیدا کرنے کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرتا وکالت کو محکمہ تعلیم پر ترجیح دینے کا یہ سبب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''وکالت میں ترقی کے امکانات ہیں ججی کا عہدہ بھی ہے'' گویا اس وقت صرف معاشی حالات سنوارنا پیش نظر تھا اور اس سلسلہ میں انہیں وکالت کا پیشہ بہتر نظر آتا تھا کہ اس میں محنت اور قابلیت سے زیادہ آمدنی کے امکانات تھے چنانچہ انہوں نے 1909ء میں عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط میں لکھا تھا۔

''حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں مختلف امور پر مالی نقطہ نظر سے غور کروں اور یہ نقطہ نظر وہ ہے جس سے چند برس پیشتر مجھے دلی کراہت تھی میں نے طے کر لیا ہے کہ خدائی امداد پر بھروسا کرتے

(11) زندہ رود ج 2 ص 7 (12) ملفوظات اقبال مرتبہ ابواللیث صدیقی ص 86

ہوئے اپنے قانونی پیشہ کو جاری رکھوں گا'' [13]

اس فیصلہ کے بعد بھی یہ بات نہیں تھی کہ سرکاری ملازمت سے وہ اس لئے متنفر تھے کہ وہ ''کچھ باتیں'' کہنا چاہتے تھے جنہیں وہ ملازمت کی پابندیوں کے باعث نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ صرف یہ بات تھی کہ تدریس کی ملازمت میں انہیں اتنی آمدنی نہیں مل سکتی تھی جس سے ان کے مالی امور درست ہو سکتے چنانچہ 1917ء میں جب علامہ کو معلوم ہوا کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کے لئے ان کا نام بھی پیش ہوا ہے تو انہوں نے اپنے آپ کو اس ملازمت کا مستحق ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگایا چنانچہ 19 فروری 1917ء کو اپنے مہربان اور شاعر دوست گرآمی کو لکھتے ہیں ''حیدرآباد کی ججی پر میرے تقرر کے لئے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حیدری صاحب کو لکھنے سے فائدہ کی توقع ہے تو ضرور لکھئے بلکہ جہاں کہیں آپ کے خیال میں ضروری ہو لکھ ڈالئے اس خط کو چاک کر ڈالئے'' [14]

خط کا آخری جملہ ایک بار پھر پڑھیے ''اس خط کو چاک کر ڈالیئے'' یہ ایک چیختی ہوئی التجا ہے اس زخم خوردہ انا کی جسے حالات نے مجبور بھی کر دیا ہے اور جو اپنی نمائشی خودداری کا بھرم بھی رکھنا چاہتی ہے ہمیں گرآمی صاحب پر افسوس ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے دوست کی التجا کی پروانہ کی اور خط چاک نہ کیا ہمیں ان لوگوں پر مزید افسوس ہو رہا ہے جنہوں نے اس انتہائی پرائیویٹ خط کو شائع کر دیا اور پھر اس ایک جملہ کو حذف بھی نہ کیا ہم اس پر پُر زور احتجاج کرتے ہیں مگر ہمارا آج کا احتجاج کیا کرے گا کہ خود پرستاران اقبال کی طرف سے یہ چیز منظر عام پر لا دی گئی ہے۔ بہرحال ہم یہ بتا رہے تھے کہ وہ بات جو علی بخش کو بقول جاوید اقبال علامہ صاحب نے کہی تھی وہ بات کہیں بھی نہیں آ رہی اقبال ملازمت سے متنفر نہیں تھے صرف ایسی ملازمت کی تلاش میں تھے جس میں آمدنی معقول ہو۔ اسی ملازمت کے حصول کے لئے 15 اپریل 1917ء کو سر کشن پرشاد حیدآباد کو خط میں اپنا استحقاق جتاتے ہوئے لکھا ''میں نے اس فن (فلسفہ وغیرہ) میں ہندوستان اور یوروپ کے اعلیٰ ترین امتحان کیمبرج (انگلستان) میونخ (جرمنی) یونیورسٹیوں سے پاس کئے ہیں'' [15]

ان ہی مہاراجہ کشن پرشاد صاحب کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''اگر حیدرآباد میں میر مجلسی

[13] "Iqbal" by Atiyah Faizi P 52 [14] ''اقبال ایک تحقیقی مطالعہ'' ص 68 [15] ایضاً ص 75

عدالت العالیہ (یعنی ججی) کی آسامی خالی ہے تو میں اسے قانون کی پروفیسری اور پرائیویٹ پریکٹس پر ترجیح دونگا۔ آپ حیدری صاحب کی توجہ اس طرف دلائیں'' [16]

مولانا عبدالسلام ندوی مداحین اقبال میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''حیدرآباد کی ہائی کورٹ کی ججی کی طرف بے شبہ اقبال کا شدید میلان پایا جاتا تھا'' [17]

علامہ کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ 1918ء میں علامہ کو اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ہیگ کی جگہ عارضی ملازمت مل گئی [18]

تو آپ نے اس ملازمت سے عارضی فائدہ اٹھانے سے گریز نہ کیا۔ یہ عارضی ملازمت تھی ختم ہوگئی اقبال پھر پیشہ وکالت میں منہمک ہوگئے آپ دیکھ چکے ہیں کہ علامہ اقبال نے تدریس پر وکالت کو ترجیح اس لئے دی تھی کہ اس میں زیادہ آمدنی متوقع تھی نیز اس میں جج کا عہدہ مل جانے کا امکان بھی تھا جج کا عہدہ حاصل کرنے کا ایک موقع حیدرآباد دکن میں بھی آیا تھا اور علامہ اقبال کے شدید میلان کے باوجود وہ انہیں نہیں مل سکا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انگریز کی ملازمت نہیں تھی ایک مسلمان ریاست کی ملازمت تھی مگر جن حالات میں اقبال سانس لے رہا تھا ان حالات میں حصول معاش مقدم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ریاست الور کے ہندو مہاراجہ کی ملازمت کرنے پر بھی تیار تھے مگر اس ملازمت میں تنخواہ معقول نہیں تھی اس لئے اس سے ہاتھ اٹھالیے۔ فرزند اقبال لکھتے ہیں۔

''اسی سال (1913ء میں) سر سید علی امام نے انہیں بتایا تھا کہ مہاراجہ الور کو ایک قابل پرائیویٹ سیکریٹری کی ضرورت ہے اور وہ اس سلسلہ میں مہاراجہ سے اقبال کا ذکر کر چکے ہیں اقبال منشی طاہرالدین اور علی بخش کے ہمراہ الور پہنچے مہمان خانہ شاہی میں ٹھہرائے گئے مہاراجہ سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ تنخواہ چھ سو روپے ہوگی اقبال کے خیال میں تنخواہ قلیل تھی اس لئے خاموشی سے لاہور واپس آگئے'' [19]

اس طرح کی تفصیل خود علامہ اقبال نے بھی اپنے خط مرقومہ یکم اکتوبر 1913ء بنام مہاراجہ

---

[16] ایضاً ص 81 [17] ایضاً ص 93 بحوالہ ''اقبال کامل'' از مولانا عبدالسلام ندوی [18] ایضاً ص 83

[19] زندہ رود ج 2 ص 36

کشن پرشاد میں بیان کی ہے لکھتے ہیں۔

''مہاراجہ بہادر الور کے طرز گفتار سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ملازمت میں لینے کے خواہش مند ہیں مگر پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ اتنی تھی کہ میں اسے قبول نہ کرسکتا تھا اس کے علاوہ غالباً ان پرزور ڈالا گیا ہے کہ اس جگہ کے لئے کسی ہندو کی تقرری مناسب ہے اور شاید یہ درست بھی ہو'' [20]

انہی مہاراجہ صاحب کو 26 اکتوبر 1913ء کو لکھے گئے ایک اور خط میں کہتے ہیں ''الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لئے تو اس قدر رقم کافی بلکہ اس سے زیادہ ہے لیکن چونکہ میرے ذمہ اوروں کی ضروریات پوری کرنا بھی ہے اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے بڑے بھائی جان جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا اب پنشن پا گئے ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمہ ہیں اور ہونے چاہئیں خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں'' [21]

اس خط میں اقبال نے اپنی ذمہ داریوں کی گرانباری کا تفصیلی ذکر بھی کر دیا ہے ایک ایسا شخص جس پر اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہو اور جسے اپنی ذمہ داریوں کا پوری طرح احساس بھی ہو اُس کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملازمت سے متنفر تھا انگریز کی ملازمت سے زیادہ ذہنی اذیت سے دوچار کرنے والی ملازمت تو کسی ریاست کے مہاراجہ کا پرائیویٹ سیکرٹری بن کر رہنا تھا مگر علامہ صاحب اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس پر بھی تیار تھے پھر حیدرآباد کی ججی کی خواہش رکھنے کے سلسلہ میں یہ عذر پیش کرنا بھی غیر معقول ہے کہ وہ مسلمانوں کی ریاست کی ملازمت تھی۔ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہندوؤں کی ریاست میں مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری بننے پر بھی تیار تھے۔ مسلمانوں کی ریاست حیدرآباد کا کیا حال تھا اس کے متعلق خود ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں ''یہ درست ہے کہ حیدرآباد عام ریاستوں سے مختلف ایک خاصی وسیع مملکت تھی اور دیگر ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کے مقابلہ میں نظام کی حیثیت بڑی مہتمم بالشان اور مطلق العنان تھی لیکن بعض خاص امور میں نظام انگریز

---

[21] ''صحیفہ'' اقبال نمبر حصہ اول ص 101 [20] ایضاً ص 110-109

ریذیڈنٹ کے مشورے یا اشارے کے بغیر کچھ نہ کرسکتا تھا‘‘ [22]

دوسرے لفظوں میں جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں ریاست کی ملازمت اصل میں انگریز کی ہی بالواسطہ ملازمت تھی اور علامہ صاحب کو اس سے کوئی تنفر نہیں تھا وہ تو اس کے حصول کے لئے بے قرار تھے ہماری اس بات کی تائید اور شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ علامہ صاحب اپنی معاشی مجبوریوں کے باعث انگریز حکومت کے براہ راست ملازم ہونے کے بھی خواہشمند تھے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

1925ء میں پنجاب ہائی کورٹ میں ایک مسلم جج کے تقرر کا مسئلہ پیدا ہوا سر شادی لعل چیف جسٹس تھا۔ صوبہ بھر کے مسلم اخباروں، انجمنوں، وکیلوں اور تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ اقبال کو ان کی قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے مگر سر شادی لعل نے ان کے متعلق یہ ریمارک دیئے کہ ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں قانون دان کی حیثیت سے نہیں چنانچہ اقبال جج نہ بن سکے اور اسامی کو پُر کرنے کے لئے سر شادی لعل کی خواہش کے مطابق یو پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا‘‘ [23]

پروفیسری کی نسبت ججی میں بے انتہا پابندیاں ہوتی ہیں مگر حصول معاش کی خاطر حضرت علامہ کو یہ سب کچھ گوارا تھا یہ تو سر شادی لعل کی ذاتی عداوت تھی جس کے باعث وہ مستحق ہوتے ہوئے بھی اس ملازمت سے محروم رہے شادی لعل اپنی اس تعصب آمیز حرکت کے باعث اقبال کو اس منصب سے محروم کردینے کو اپنا کارنامہ سمجھتا تھا چنانچہ ویدمہتہ اپنے والد اور سر شادی لعل کے دوست سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’ایک شام سر شادی لعل بابو جی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، مجھے مبارک دو بھائی آج میں نے دو پنجابی مسلمانوں کی بطخ پکا دی (یعنی انہیں ختم کردیا ہے) کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہائی کورٹ میں ایک مسلم جج کی آسامی خالی تھی ہز ایکسی لینسی گورنر نے مجھے بلوایا اور پوچھا کہ سر محمد اقبال اور خان بہادر شاہ نواز (سر شفیع کے داماد) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے‘‘ خالی اسامی کے لئے یہی دو نام ان کے زیر غور

---

[22] زندہ رُود ج 2 ص 85 [23] زندہ رود ج 2 ص 153 بحوالہ روزنامہ زمیندار 1925-10-9، روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل ص 114

تھے میں نے جواب دیا اقبال کو کون نہیں جانتا وہ تو ہمارا سب سے بڑا اردو شاعر ہے اور اسی طرح ہر کوئی جس کا تعلق حکومت سے ہے شاہ نواز اور اس کے کام بحیثیت رکن پنجاب لیجسلیٹو کونسل سے پوری طرح واقف ہے ان دو میں سے کوئی ایک بینچ کے لئے مناسب رہے گا لیکن یوار ایکسی لینسی آپ دونوں سے انٹرویو کیوں نہیں کر لیتے پھر ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ ان دونوں میں کونسا بینچ کے لئے مناسب ہوگا اس کے بعد میں اقبال کے پاس گیا اور اسے اطلاع دی کہ گورنر ججی کے لئے انٹرویو کرنے والے ہیں اور اس کا (اقبال کا) سب سے بڑا حریف شاہ نواز ہے میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا اقبال تم جب گورنر سے ملو تو انہیں ضرور بتانا کہ شاہ نواز کس قسم کا آدمی ہے یعنی وہ طوائفوں اور خانگیوں سے میل جول رکھتا ہے اقبال سے فارغ ہو کر میں شاہ نواز کے پاس گیا اسے بھی یہی مشورہ دیا گورنر کو ضرور بتانا کہ اقبال فاحشہ عورتوں سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے لئے اشعار بھی لکھتا ہے جب ان کے انٹرویو ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اچھالا گورنر نے بعد میں مجھ سے کہا تو بہ یہ دونوں کتنے بیہودہ آدمی ہیں سو آج میں نے گورنر سے اپنی پسند کے الٰہ آباد سے تعلق رکھنے والے ایک اچھے اور فرمانبردار مسلمان کا تقرر ججی کے لئے کروایا ہے بابو جی نے اپنی سوٹی زمین پر پٹختے ہوئے کہا 'تم نے بہت بڑی غلطی کی شادی لعل اقبال اور شاہ نواز دونوں مشہور اور قابل شخصیتیں ہیں اگر تم ایک کا تقرر کروا دیتے تو وہ تمام عمر تمہارا احسان مند رہتا اور یوں ایک معروف پنجابی شخصیت تمہاری جیب میں ہوتی شادی لعل بولے میری جیب میں الٰہ آباد کا جج جو ہے مجھے اور کیا چاہئے'' [24]

ڈاکٹر جاوید اقبال ہندوستان کے نابینا ادیب وید مہتہ کی Profiles کے عنوان سے نیو یارکر میں بالاقساط چھپنے والی ان یادداشتوں میں متذکرہ صدر واقعہ کو شادی لعل کی غلط بیانی پر محمول کرتے ہیں ان کا خیال ہے اقبال اور میاں شاہ نواز بہترین دوست تھے اور آخر دم تک ان کی پر خلوص دوستی قائم رہی اس لئے ان میں سے کسی نے بھی گورنر کے سامنے وہ باتیں نہیں کہی ہونگی جو شادی لعل نے کہی تھیں بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو ہم تو صرف یہ بتا رہے تھے کہ حضرت علامہ کی خواہش تھی کہ انہیں انگریزی کی ججی کی ملازمت مل جائے اور سر شادی لعل کے تعصب کے باعث ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی

[24] زندہ رود ج 2 ص 156-155 بحوالہ نیو یارکر (انگریزی) 23 جولائی 1979ء ص 44

اس سال 1925ء میں علامہ معاشی حالات سے اس درجہ مجبور ہو گئے کہ انہوں نے ریاست کشمیر میں ایک ملازمت کے حصول کے لئے ایک انگریز افسر مسٹر تھامپسن سے مدد کی درخواست کی اور انہیں لکھا۔

''میں آپ کو یہ خط ایک ایسے معاملہ کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس کا فوری تعلق میری اپنی ذات سے ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ایسے وقت میں میری مدد کریں گے جبکہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے قلم کی ایک جنبش مجھے ان تمام مشکلات سے نجات دلا سکتی ہے اس وجہ سے آپ کی فیاضی اور ہمدردی پر یقین رکھتے ہوئے میں آپ کی سرپرستی کا خواہاں ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے کشمیر کی سٹیٹ کونسل میں کوئی جگہ دلوا سکیں۔ اگر آپ مجھے تھوڑا سا سہارا دے سکیں تو یہ میرے لئے روحانی اور مادی طور پر ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگا اور میں آپ کے لطف و کرم کا ہمیشہ ممنون رہوں گا'' [25]

مگر اس درخواست کا کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ اس زمانہ میں حکومت ہند کی پالیسی یہ تھی کہ ریاستوں میں ملازمتوں کے لئے اس وقت تک سفارش نہ کی جائے جب تک اسے ایسا کرنے کے لئے خصوصی طور پر کہا نہ گیا ہو پس تھامپسن اقبال کے لئے کچھ نہ کر سکتا تھا اس نے صرف یہی جواب دیا کہ اگر عہدوں کے تعین کے لئے حکومت ہند کا مشورہ طلب کیا گیا تو وہ اقبال کی درخواست کا خیال رکھے گا'' [26]

اس کے بعد علامہ اقبال کو سیاست میں گھسیٹ لیا گیا مگر وہ سیدھے سادے آئیڈیلسٹ تھے لوگوں کی طرح سیاست کو تجارت نہیں بنا سکتے تھے اس لئے مالی حالات اور بھی خراب ہوتے گئے ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے بعد تو ان کی جو تھوڑی بہت پریکٹس تھی وہ بھی تباہ ہو گئی اور انہیں مالی نقصان اٹھانا پڑا جاوید اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''راقم کی یادداشت کے مطابق غالباً ان ہی ایام میں ایک مرتبہ اقبال اور سردار بیگم کا آپس میں خرچ کے معاملہ میں جھگڑا بھی ہوا شام کا وقت تھا راقم خدا جانے کس غرض سے اقبال کے کمرے میں داخل ہوا دیکھا کہ سردار بیگم (جاوید کی والدہ) بیٹھی رو رہی ہیں اور ان سے نہایت تلخ لہجے میں کہہ رہی

[25] زندہ رود ج 3 ص 110-109 [26] ایضاً ص 110

ہیں کہ میں اس گھر میں سارا دن غلاموں کی طرح کام کرتی ہوں لیکن ایسا کب تک چلے گا راقم کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی بہر حال سردار بیگم کے مطالبات جائز تھے وہ چاہتی تھیں اقبال یا تو کوئی ملازمت حاصل کریں یا دلجمعی سے وکالت کریں تا کہ مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو'' (27)

اقبال اگر اپنی مقبولیت کو کھل کر کیش کرانا چاہتے تو اپنے مداحوں سے کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے رقم حاصل کر سکتے تھے مگر اس راہ میں ان کی شخصیت حائل تھی وہ اپنی خودداری کا بھرم بھی قائم رکھنا چاہتے تھے ایک زمانہ میں ان کا یہ خیال تھا کہ کسی کی خدمات سرانجام دیئے بغیر اس سے کچھ لینا ان کو زیب نہیں دیتا چنانچہ جب انہیں مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کے ''شایان شان'' وظیفے کی پیش کش کی تو انہوں نے انہیں لکھا تھا۔

''جو عنائیت آپ اقبال کے حال پر فرماتے ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو دوست پروری اور غریب نوازی آپ کے گھرانے کا خاصہ ہے کیوں نہ ہو جس درخت کی شاخ ہو اس کے سائے سے ہندوستان بھر مستفید ہو چکا ہے۔ میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دل صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے کہ آپ کی جانب سے بوئے کسے'' آتی ہے۔ آپ کی فیاضی کہ زمان ومکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے، مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے مگر یہ بات مروت اور دیانت سے دور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرہ کے ہو، خدا کو منظور ہوا تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اقبال جو ہمیشہ سے معنوی طور پر آپ کے ساتھ رہا ہے صوری طور پر بھی آپ کے ہمراہ ہوگا۔ آپ نے جس وسعت قلب سے اقبال کو یاد فرمایا مروت کی تاریخ میں یادگار رہنے کے قابل ہے'' (28)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے تو لکھا ہے کہ اقبال نے نہایت خوبصورتی سے مہاراجہ کشن پرشاد کی پیش کش کو ٹال دیا لیکن ہمارے خیال میں حضرت علامہ کا یہ جواب حسن طلب کی حسین ترین مثال ہے اور یقیناً مہاراجہ کشن پرشاد جیسا سخنور اور سخن فہم خط میں لکھے ہوئے الفاظ کو بھی سمجھ گیا ہوگا اور بین السطور کو

(27) ایضاً ص 247 (28) زندہ رود ج 2 ص 36

بھی سمجھ گیا ہوگا ایک مخلص آدمی یہ جواب پڑھ کر کسی صورت میں بھی پتھر نہیں ہوسکتا اس نے یقیناً اقبال کی خودداری کا بھرم رکھا ہوگا مگر کسی انتہائی خفیہ طریقہ سے معاونت جاری رکھی ہوگی۔ اقبال کے اس کے ساتھ عمر بھر نیاز مندانہ تعلقات رہے ان تعلقات میں مادی تعاون ضرور شامل رہا ہوگا مگر اس کا اشتہار خود مہاراجہ نے بھی پسند نہ کیا ہوگا یہاں گرامی کے نام لکھے ہوئے خط کا آخری جملہ پھر ذہن میں لایئے ''خط کو چاک کر ڈالئے'' گرامی نے تو معلوم نہیں کیوں اس التجا پر عمل نہیں کیا مگر مہاراجہ کشن پرشاد ایسے کم ظرف نہیں تھے وہ یقیناً بغیر التجا کے بھی ایسے خط چاک کرتے رہے ہونگے خیر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک خوددار انسان کی طرح اقبال خدمات انجام دیئے بغیر کچھ حاصل کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

آئیڈیلزم بھی عجیب چیز ہے اس کے سہارے آدمی خوابوں کے گلاب زاروں میں سفر کرتا ہوا کہکشاؤں تک پہنچ جاتا ہے مگر زندگی بڑی تلخ چیز ہے یہ اسے حقائق کے انگاروں پر لا کھڑا کرتی ہے یوں آدمی چاہتا کچھ اور ہے اور اُسے کرنا کچھ اور پڑتا ہے اقبال کہتا ہے۔

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈھی سلطاں کی درگاہ

مگر ''مرد درویش'' کی ٹانگوں سے اوپر اور سینے کے نیچے ایک خوفناک حقیقت کی طرح پیٹ کا دوزخ پیوست ہوتا ہے۔ جس کو بھوک ستاتی ہے تو تمام حواس کی طرح دماغ بھی معطل ہوجاتا ہے اُس وقت ساری بلند خیالیاں خاک میں مل جاتی ہیں پھر جب اس مرد درویش کے ساتھ لواحقین اور وابستگان کی قطار بھی ہو تو کون ہے جو اپنے فرائض سے منہ موڑ کر رزق کا کوئی دروازہ تلاش نہ کرے اقبال وکالت کرتے تھے' مختلف امتحانات کے پیپر سیٹ کرتے تھے اور مارکنگ کرتے تھے لیکن ان کی اپنی خواہش یہ تھی کہ پرانے شاعروں کی طرح کسی سلطاں کی درگاہ سے وابستہ ہوجائیں اس سلسلہ میں ان کی نگاہیں بار بار ریاست حیدر آباد دکن کے نواب کی طرف اٹھتی تھیں فرزند اقبال لکھتے ہیں۔

''اقبال بھی پیشہ وکالت میں جو تگ ودو کرنا پڑتی ہے اس سے بیزار تھے اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں فکر معاش سے نجات حاصل کرکے اپنے لٹریری مقاصد کی تکمیل کے لئے فرصت کے آرزو

مند تھے اسی سبب انہیں جب بھی موقع ملتا تھا حیدر آباد کیلئے اپنی خدمات پیش کرتے تھے'' [29]

ایک دفعہ وہ حیدر آباد گئے تھے اور خیال تھا کہ نظام سے شرف ملاقات حاصل ہو گا مگر اذن باریابی جلد نصیب نہ ہوا اور کچھ دن ٹھہر کر واپس آ گئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہاں انہیں اپنے مزاج کے مطابق ملازمت مل جائیگی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''ظاہر ہے اقبال معقول آمدنی کے کسی ایسے ذریعے کی تلاش میں تھے جو کشا کش روزگار سے انہیں کم از کم اتنی مہلت دے کہ وہ اپنی قوت فکر کا رخ اُس عالم کی سمت موڑنے کے قابل ہو سکیں جس کا تعلق تخلیق سے تھا اقبال کی روح کی گہرائیوں میں یہ احساس مضطرب تھا کہ ان کا اصل مقصد شعر کے ذریعے ایک نیا پیغام عالم اسلام تک پہنچانا ہے لیکن بدقسمتی سے برصغیر میں تصنیف و تالیف کا شغل بجائے خود معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ ایسے مقصد کی تحصیل کے لئے کسی نہ کسی مالدار سر پرست کی ضرورت تھی اقبال ''اس گدھے پیٹ'' کی خاطر جو ''لاؤ چارہ لاؤ چارہ'' کا ورد کرتے ہوئے انہیں دم بھر کے لئے بھی مہلت نہ دیتا تھا اپنی تقدیر معطل کرنے پر رضامند نہ تھے اسی بناء پر وہ اپنے مزاج کے موافق کسی ملازمت اختیار کرنے کو خارج از بحث قرار نہ دیتے تھے'' [30]

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں

''سر راس مسعود کو اقبال کی ذہنی اور مالی پریشانیوں کا بخوبی علم تھا اور وہ خاموشی سے ان کی امداد کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے وہ اقبال کی خاطر کسی ایسے مستقل وظیفہ کی فراہمی کے لئے تگ و دو میں مصروف تھے جس سے انہیں مالی پریشانیوں سے نجات مل جائے اور وہ یک سوئی کے ساتھ اپنا تخلیقی کام جاری رکھ سکیں'' [31]

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک انتہائی قریبی اور مخلص دوست کی طرح سر راس مسعود کو خود ہی احساس تھا کہ اقبال کو مالی پریشانیوں سے نجات ملنی چاہئے اور وہ از خود ایسی کوششوں میں مصروف تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ نے خود ہی یہ خواہش کی تھی انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

---

[29] زندہ رود ج 2 ص 84 [30] ایضاً ص 10 [31] زندہ رود ج 3 ص 267

''میری خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کردیں تاکہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک بےنظیر کتاب ہوگی اور ان کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لئے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں جب یہ کہتا ہوں کہ آج دنیائے اسلام میں میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں'' (32)

علامہ صاحب کی درخواست کے مطابق ان کے دوست اور مخلص عقیدت مند سر راس مسعود نے کوششیں شروع کردیں اور بالآخر وہ کوششیں ثمر ور ثابت ہوئیں اور نواب بھوپال نے حضرت علامہ کی پانچ سو روپے ماہوار تاحیات پنشن مقرر کردی سر راس مسعود نے انہیں اس وظیفہ کی اطلاع دی تو اس مرد درویش نے 30 مئی 1935ء کو تحریر کردہ خط میں لکھا۔

''میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ چاروں طرف سے میں آلام ومصائب میں محصور تھا۔ باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں؟ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے بالخصوص آپ کے خاندان کی'' (33)

خطوط کی تاریخ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سر راس مسعود کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی 12 مئی کو علامہ اقبال نے پہلا خط لکھا تھا جس میں وظیفہ یا پنشن کے لئے درخواست کی گئی تھی اب وہ 30 مئی 1935ء کو پنشن کی منظوری پر شکریہ کا خط بھی لکھ رہے ہیں وظیفہ کی منظوری پر خوشی تو ہوتی ہے مگر بعد میں اپنے بھرم کا خیال ستانے لگتا ہے چنانچہ اس پنشن یا وظیفہ کے معاملہ کو پس پردہ رکھنے کے لئے اُسی سال 18 ستمبر کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔

''اخباروں میں اس (پنشن) کا چرچا مناسب نہیں اور اس کی ادائیگی بھی معرفت اعلیٰ حضرت

---

(32) اقبال نامہ مرتبہ اخلاق اثر بھوپالی خط محررہ 1935-5-12 نیز زندہ رود ج3 ص 267

(33) زندہ رود ج3 ص 267 اقتباس میں جہاں ''۔۔۔'' نقطے لگائے گئے ہیں وہاں یہ جملہ تھا ''خدا تعالیٰ ان کی (یعنی نواب بھوپال کی) عمر و دولت میں ترقی دے'' معلوم نہیں جاوید اقبال نے یہ جملہ نقل کرنا کیوں مناسب نہ سمجھا۔

(نواب بھوپال) ہی ہونی چاہئے'' (34)

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس خط کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے انہوں نے علامہ صاحب کا محولہ بالاشکریہ والا خط نقل کر کے لکھا ہے۔

''لیکن سر راس مسعود ابھی مطمئن نہ ہوئے تھے وہ کوشاں تھے کہ بھوپال کے علاوہ حیدرآباد بہاول پور اور سرآغاخان بھی اقبال کے لئے وظیفے مقرر کریں تا کہ وہ قرآن مجید پر عہد حاضر کی روشنی میں اپنے خیالات آسودگی سے قلم بند کر سکیں اس سلسلہ میں اقبال نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے خط مورخہ 11 دسمبر 1935ء میں تحریر کیا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہوتو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے'' (35)

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے علامہ اقبال کے خط کا صرف پہلا حصہ نقل کر دیا ہے اور اپنے محترم والد کی درویشی اور قناعت پسندی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ انہوں نے معاملہ میں بددیانتی کی ہے کیونکہ انہوں نے اس خط کے اگلے حصہ کے وہ الفاظ نقل نہیں کئے جو اس مرد درویش کے حسن طلب کی بہترین مثال ہیں خط کا وہ حصہ ہم نقل کئے دیتے ہیں۔

''اب اگر اس تجویز کو (یعنی آغاخان سے وظیفہ حاصل کرنے کی تجویز کو) ڈراپ کرنا مناسب نہیں تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائی نس (سرآغاخان) یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں۔ بعض پرائیویٹ وجوہ کی بناء پر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو معلوم ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بھی اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس سرآغاخان میری اس تجویز کی

---

(34) اقبال نامہ مکتوب محررہ 18 ستمبر 1935ء ص 367 (35) زندہ رود ج 3 ص 268

نسبت کیا خیال کریں گے۔ آخری فیصلے تک اس بارے میں پریس میں جانا مناسب نہیں ہے''[36]

اوپر ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ سر راس مسعود کی کوشش تھی کہ حیدر آباد اور بہاول پور کے نواب اور سر آغا خان اقبال کے لئے وظیفے مقرر کریں، تا کہ وہ قرآن مجید پر عہد حاضر کی روشنی میں اپنے خیالات آسودگی سے قلم بند کر سکیں۔ بھلا سر آغا خان کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اقبال قرآن پر کتاب لکھیں وہ تو اسمٰعیلی مذہب کے مدار المہام تھے۔ ہو سکتا ہے سر راس مسعود نے ان سے کسی اور انداز میں اور کسی اور مفہوم میں مالی مدد مانگی ہو اس کی تفصیل تو آگے آئے گی بر سبیل تذکرہ یہ دیکھ لیجئے کہ فرزند اقبال تو بات کا بھرم رکھنے کے لئے خط کا وہ حصہ نقل نہیں کرتے جو ہم نے ابھی نقل کیا ہے مگر ایک اور پرستار اقبال جناب محمد احمد خان تو حد کر دیتے ہیں ذرا ان کی گوہر افشانی ملاحظہ فرمایئے وہ لکھتے ہیں۔

''مالی نقطہ نظر سے یہ زمانہ بڑی تکلیف کا تھا۔ اس زمانہ میں نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے دیرینہ تعلقات، دوستی و محبت کے تحت اپنی جیب خاص سے پانسو روپے (-/500) روپے وظیفہ ماہانہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ہز ہائی نس آغا خان نے بھی انہیں وظیفہ دینا چاہا اور دیگر ذرائع سے بھی ان کی مالی امداد کی کوششیں کی گئیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی انہوں نے قبول نہ کیا''

(اقبال کا سیاسی کارنامہ از محمد احمد خان شائع کردہ اقبال اکادمی ص 696 طبع اوّل 1977)

عقیدت بھی کیا کیا کچھ کر دیتی ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ نواب بھوپال سے وظیفہ حاصل کرنے کی خود علامہ صاحب نے خواہش کی تھی اس سلسلہ میں سید راس مسعود کو سلسلہ جنبانی کے لئے لکھا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ قرآن پر بے مثال کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ رہی سر آغا خان کے وظیفہ والی بات تو اُنہیں کب یہ پیش کش ہوئی تھی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا تھا اس کے ساتھ ہی محمد احمد خان صاحب نے ''دیگر ذرائع'' کی بات گھڑ لی مگر ''دیگر ذرائع'' کی وضاحت نہیں کی۔ لطف یہ ہے کہ محمد احمد خان صاحب سر آغا خان کا وظیفہ قبول نہ کرنے کی بات کی اور اقبال نامہ کے اُسی خط کا حوالہ بھی درج کر دیا جس کا ایک ٹکڑا جاوید اقبال نے نقل کیا تھا اور اگلا ٹکڑا ہم نے نقل کر دیا ہے۔ شاید محمد احمد خان صاحب

---

[36] اقبال نامہ مکتوب محررہ 11 ستمبر 1935ء ج 1 ص 374

حوالہ دے کر مطمئن ہو گئے ہوں کہ جب ہم نے حوالہ درج کر کے اپنی بات کو مستند کر دیا ہے تو اصل کتاب دیکھنے کی تکلیف کون کرے گا؟ ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد سر آغا خان والے وظیفہ کی بات کی طرف آیئے۔

علامہ صاحب معلوم نہیں اس بات سے کیوں خائف تھے کہ سر آغا خان سے وظیفہ طلبی کا معاملہ نواب آف بھوپال کے علم میں نہیں آنا چاہئے چنانچہ انہوں نے متذکرہ خط کے بعد ایک اور خط میں سر راس مسعود کو لکھا ''کیا تم نے سر آغا خان والے معاملہ (وظیفہ طلبی) کا اعلیٰ حضرت نواب بھوپال سے ذکر کیا تھا یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی ہے معلوم نہیں اعلیٰ حضرت کیا خیال کریں زیادہ کیا لکھوں'' [37]

ہمارا خیال ہے حضرت علامہ کو ایک تو یہ خدشہ ہوگا کہ اگر نواب آف بھوپال کے علم میں آ گیا کہ اقبال سر آغا خان سے بھی وظیفہ طلب کر رہے ہیں تو وہ انہیں ہر دروازہ کا بھکاری سمجھیں گے اور ان کے دل میں علامہ صاحب کے لئے جو احترام ہے اس میں کمی آ جائے گی دوسرے یہ اندیشہ بھی ہو سکتا ہے کہ نواب صاحب اسمٰعیلی فرقہ کے عقائد سے متنفر ہوں۔ آغا خان اسمٰعیلی فرقہ کے امام تھے اور اسمٰعیلیوں کے عقائد ہمیشہ عام مسلمانوں میں قابل اعتراض رہے ہیں غیر متعلق نہ ہوگا اگر ہم اسمٰعیلیوں کے چند مخصوص عقائد بیان کر دیں۔

اسماعیلی مذہب میں بنیادی عقیدہ اور عقائد کا نقطہ ماسکہ امام کا عقیدہ ہے ان کے نزدیک مستقر امام تو حضرت علی بن ابی طالب ہیں لیکن ہر زمانہ میں قائم امام یا قائم خلیفہ موجود رہتے ہیں آغا خان اسی امامت کے حامل ہیں کیونکہ یہ محمد بن اسمٰعیل کی اولاد سے ہیں ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی اسمٰعیلی فرقہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اصل اسماعیلی دنیا کے مختلف علاقوں کے علاوہ پاکستان میں بھی موجود ہیں یہ اب ''آغا خانی'' کہلاتے ہیں۔ پرنس عبدالکریم ان کے حاضر امام ہیں وہ ان کے نزدیک معصوم عن الخطاء ہیں وہ مامور من اللہ ہیں۔ قرآن کا حقیقی مفہوم وہی جانتے ہیں نماز روزہ ان کے ہاں فرض عبادت سے اب خارج ہے'' [38]

---

[37] مکاتیب اقبال ص 377 [38] ماہنامہ میثاق مئی 1985ء ص 85

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے

''آغا خان کی تصویر سامنے رکھ کر اسماعیلی سجدے کرتے ہیں'' [39]

کہا جا سکتا ہے قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے ڈاکٹر اسرار احمد اسماعیلی مذہب کے مخالف ہیں اس لئے ممکن ہے انہوں نے دیانت سے کام نہ لیا ہو مگر یہی کچھ بلکہ اس سے بہت زیادہ اسماعیلی فرقہ کے محقق ڈاکٹر زاہد علی (سابق پروفیسر عربی، وائس پرنسپل نظام کالج حیدر آباد دکن) کی کتاب سے ہمیں مل جاتا ہے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے

''ہمارے ائمہ معصومین کی شان انبیائے مرسلین کی شان سے بدرجہا بلند ہے دونوں میں مالک اور مملوک کا فرق ہے ائمہ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا بخلاف انبیائے مرسلین کے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں ان انبیائے مرسلین میں موسیٰؑ تو ایک طرف خود آنحضرتؐ تک شامل ہیں'' [40]

ان حضرات کا سارا دارومدار تاویل اور باطنی معانی پر ہے اور یہ باطنی معانی عجیب وغریب ہوتے ہیں ایک حدیث ہے **لا صلوٰۃ اِلّا بوضوء** (وضو کے بغیر نماز نہیں) لیکن اسماعیلی محقق سے اس کے تاویلی اور باطنی معانی سنیئے لکھتے ہیں ''وضو سے مراد حضرت علی ہیں اور صلوٰۃ سے مراد محمد ہیں کیونکہ وضو میں بھی تین حرف ہیں اور علی میں بھی اسی طرح محمد میں بھی چار حرف ہیں اور صلوٰۃ میں بھی چار حرف ہیں اس لئے حدیث کے معنی ہیں۔

مولا علی کی وصایت (وصی ہونے) کے اقرار کے بغیر آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار بے معنی ہے'' [41]

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی عبارت آپ پڑھ آئے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ سر راس مسعود نواب دکن نواب بہاول پور اور سر آغا خان سے اقبال کے سلسلہ میں وظیفہ کی کوشش کر رہے تھے تاکہ حضرت علامہ قرآن پر عہد حاضر کی روشنی میں آسودگی سے اپنے خیالات قلم بند کر سکیں۔ درج ذیل عبارت میں قرآن کے متعلق اسمٰعیلی حضرات کا عقیدہ بھی دیکھ لیجئے ڈاکٹر زاہد علی متذکرہ کتاب کے ''مقدمہ'' میں لکھتے ہیں۔

---

[39] ایضاً ص 70 [40] ''ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام'' از ڈاکٹر زاہد علی ایڈیشن 1954ء ص 366

[41] 41۔ ایضاً ص 424

جس طرح یہود ونصاریٰ نے اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے علیحدہ کتابیں جمع کرلیں مسلمانوں نے بھی اسی طرح کیا۔ رسول خدا نے کلام اللہ جمع کر کے اسے اپنے اصحاب کے سامنے اپنے وصی (حضرت علی) کے سپرد فرمادیا یہ لوگ اس سے بے پروا ہو گئے اور اپنی رائے اور قیاس سے ایک الگ قرآن جمع کیا اس کے بعد خلیفہ ثالث نے شیخین (ابوبکر وعمر) کا جمع کیا ہوا نسخہ جلا ڈالا اور ایک دوسرا نسخہ تیار کرلیا۔ پھر حجاج آیا اور اس نے خلیفہ مذکور کے نسخہ کو لے کر آگ میں جھونک دیا اس کے بعد اس نے جو چاہا نکال دیا اور وہ کتاب تالیف کی جو قرآن کے نام سے موجود ہے'' 42

کسی زمانہ میں علامہ اقبال بھی اسمٰعیلی تحریک سے خائف تھے انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا تھا ''میں نے سنا ہے کہ البانیہ کے مسلمانوں نے وضو اڑا دیا ہے۔ ایران کو بابیت سے اندیشہ ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اسمٰعیلی تحریک کہیں پھر زندہ نہ ہو جائے'' 43

اب اُسی 'اسمٰعیلی تحریک'' کے موجودہ سربراہ سر آغا خان سے وہ وظیفہ کے طلب گار تھے ممکن ہے یہ بات نواب آف بھوپال کو ناگوار ہوتی اس لئے نئی تجویز پیش کرتے ہیں کہ مجوزہ وظیفہ حضرت علامہ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کے نام جاری کردیا جائے علامہ صاحب نے اسی زمانہ میں قادیانیوں کے خلاف اپنا طویل بیان جاری کیا اور احمدیوں کو ملت اسلام سے خارج قرار دیا اس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی ایک بیان جاری کیا تھا اور اس میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا ''احمدی'' کہلانے والے لوگ اسمٰعیلیوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں؟ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے لکھا۔

''اسماعیلی' اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل نہیں کیئے جاسکتے میرے لئے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ آپ نے (پنڈت نہرو نے) سر آغا خان پر کیوں حملہ کیا'' 44

ہمارے پاس یہ معلومات نہیں کہ سر آغا خان نے وہ وظیفہ منظور کیا یا نہیں جس کی خواہش نے

42 ''ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام'' کا مقدمہ از ڈاکٹر زاہد علی 43 اقبال نامہ ج 1 ص 144

44 مضمون علامہ اقبال 22 جنوری 1936ء

علامہ صاحب کے اسماعیلیوں کے لئے اور سر آغا خان کے لئے رویوں اور نظریوں میں لچک پیدا کر دی تھی عین ممکن ہے حضرت علامہ کی اُن درخواستوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو جن میں علامہ اپنی خودداری کا بھرم رکھنے کے لئے اخفاء کی بات کرتے تھے بہر حال ہم اس معاملہ میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ علامہ اقبال جس طرح کی شاعری کر رہے تھے اس سے آغا خان کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اسماعیلی تو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ آبادی کی کثرت سے ہم رنگی اختیار کرو اور اندر ہی اندر اپنا کام کرتے رہو وہ تو ہندوؤں کے دیوتاؤں کے ساتھ بھی عقیدت کا اظہار کر لیتے تھے جیسا کہ ہم اسماعیلیوں کے محقق ڈاکٹر زاہد علی کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں۔ وہ تو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ موجودہ قرآن حکیم بھی (معاذ اللہ) محرف ہے۔ انہیں اقبال کے پیغام سے کسی طرح کی وابستگی نہیں ہو سکتی ہاں یہ ہے کہ اُن دنوں سر آغا خان مسلمانوں کی سیاست میں پوری طرح دخیل تھے۔ دوسرے اُن کے پاس دولت بے قیاس تھی اس لئے مسلمانوں کے ایک مقبول شاعر کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے کے لئے کچھ رقم صرف کرنا اُن کے نزدیک مفید حکمت عملی ہو سکتی تھی اسماعیلیوں کے امام بہت زیادہ دولت مند ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ہر سال ان کے عقیدت مند سونے میں تولتے ہیں اور یہ سونا امام کے ہی سپرد کر دیتے ہیں۔

اقبال نے کسی زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا تھا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ کسی کی خدمات سرانجام دیئے بغیر اس سے رقم لوں مگر معلوم ہوتا ہے اب عمر کے اس حصہ میں آ کر انہیں احساس ہو گیا تھا کہ دولت مند لوگوں سے مالی تعاون حاصل کرنا کچھ زیادہ معیوب نہیں ہاں یہ ہے کہ خود دست سوال دراز نہ کیا جائے۔ سر راس مسعود جیسے مخلص دوستوں کے ذریعے کوشش کی جائے سر راس مسعود بہت بڑے آدمی تھے ان کی بڑائی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ سرسید کے پوتے تھے ہندوستان کے روساء بلکہ خود انگریزوں کے لئے بھی یہ نسبت بڑی محترم تھی ہم نہیں سمجھتے کہ اتنے بڑے آدمی کی کوششیں رائیگاں گئی ہونگی تاہم یہ تفاصیل دستیاب نہیں۔

1934ء میں ہی علامہ بیماریوں کے ہاتھوں انتہائی بے بس ہو گئے ان کی پریکٹس جو پہلے بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی اب ختم ہو گئی تھی۔ ان ہی دنوں سر فضل حسین نے اپنے اور اقبال کے مشترکہ دوست میاں امیر الدین کو ایک خط میں لکھا۔

''اقبال کا کیا حال ہے کچھ عرصہ ہوا میں نے سنا تھا کہ وہ علیل ہیں اور مالی مشکلات سے دوچار ہیں مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ مجھے بصیغہ راز اطلاع دیں کہ صحیح پوزیشن کیا ہے۔ میں کالج کے ایام سے ان کا بڑا مداح رہا ہوں اور ایک بار پھر ان کی امداد کی کوشش کرنا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہو سکے کہ صحت اور مالی اعتبار سے وہ کس حال میں ہیں اور اگر وہ واقعی پریکٹس کر رہے ہیں تو فی الحال اُس سے آمدنی کی کیا صورت ہے'' (فضل حسین۔ ایک سیاسی بائیوگرافی ص320)

اس خط کے جواب میں میاں امیر الدین نے لکھا

''اقبال علالت کے باعث ایک مدت سے وکالت ترک کر چکے ہیں ان کی صحت اور مالی حالت دونوں خراب ہیں اور ان کی آواز سرعت کے ساتھ بیٹھتی چلی جارہی ہے'' (فضل حسین۔ ایک سیاسی بائیوگرافی ص320)

بلاشبہ کسی زمانہ میں اقبال اور فضل حسین صرف کلاس فیلو ہی نہیں بہت گہرے دوست بھی تھے اس خط تک تو ہمیں تفصیل ملتی ہے میاں امیر الدین کا جواب بھی آپ نے دیکھ لیا آگے ہمیں کچھ خبر نہیں جس صاحب حیثیت دوست سر فضل حسین نے ''بصیغہ راز'' معلومات طلب کی تھیں اور مطلوبہ معلومات انہیں میاں امیر الدین نے فراہم کر دی تھیں۔

علامہ کے مالی حالات کی خرابی اور ان کی روز افزوں علالت کی خبر پا کر سر فضل حسین نے کیا کیا؟ امداد کی یا نہیں؟ اس بات سے ہم بے خبر ہیں ممکن ہے یہ امداد بصیغہ راز ہوئی ہو یا یہ کہ سر فضل حسین کی طرف سے پیش کش ہوئی ہو اور چونکہ سیاسی اختلافات کے باعث دونوں دوست ایک دوسرے سے دور ہو چکے تھے اس لئے اقبال کی طرف سے یہ پیش کش ٹھکرا دی گئی ہو' یہ باتیں سامنے نہیں آئی ہیں۔

آخری عمر میں علامہ مرحوم کے مالی حالات جس طرح کے تھے وہ تو میاں امیر الدین کے بیان سے عیاں ہے انکم ٹیکس کے گوشواروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ معاملات منشی طاہر الدین نمٹاتے ہونگے۔ یقیناً اس دور میں کتابوں کی رائلٹی بھی ملنے لگی تھی مگر اس کی کوئی تفصیل اس وقت میرے سامنے نہیں میرے خیال میں وہ بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں ہوگی زندہ رود ج2 میں ڈاکٹر صفدر محمود

کی فراہم کردہ تفصیل کے مطابق 22-1921ء میں ''اسرار ورموز'' کی پہلی دفعہ ائلٹی موصول ہوئی جو 32روپے تھی اسی سے بعد میں شائع ہونے والی کتابوں کی رائلٹی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اقبال کے شعری مجموعوں میں سے صرف ''ارمغان حجاز'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی باقی کتب ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ جہاں تک پریکٹس کا تعلق ہے بیماری کے باعث اُسے تو ختم ہونا ہی تھا اور وہ ختم ہوگئی تھی اور کہاں سے آمدنی ہوتی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دوران ان کے گھر کے اخراجات زیادہ ہو گئے ایک تو بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے مسز ڈورس ایک جرمن خاتون کی خدمات حاصل کی گئی تھیں دوسرے بقول ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال گھر میں علی بخش کے علاوہ رحمان اور دیوان علی بھی کام کرنے لگے تھے۔عبدالمجید نام کا ایک خانساماں بھی رکھ لیا گیا تھا منشی طاہر الدین بھی تھے موٹر کار بھی خریدی جا چکی تھی اس کا شوفر بھی تھا ظاہر ہے یہ سب لوگ بھی مفت کام نہیں کرتے تھے آمدنی موقوف ہو جائے تو آدمی خرچ بڑھاتا نہیں گھٹاتا ہے مگر یہاں صورت حال الٹی نظر آتی ہے ہمارا خیال ہے یہ اخراجات اُن وظائف سے پورے ہوتے ہونگے جو اقبال کے عقید تمندوں نے ان کے لئے بصیغہ راز مقرر کرر کھے ہونگے۔

جو لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اقبال کی قلندری بے نیاز عطائے سکندری تھی وہ ان کی ایک مختصر سی نظم کا بھی حوالہ دیتے ہیں یہ نظم چار اشعار کی ہے اوران کے آخری شعری مجموعہ ''ارمغان حجاز'' کی آخری تین نظموں میں سے ہے علامہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اس نظم کا عنوان ہے ''سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد کے نام'' اور نیچے یہ جملہ لکھا ہوا ہے

''یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر'' [45]

یہ چیک موصول ہوا تو حضرت علامہ نے یہی نظم لکھ کر یہ چیک واپس کر دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر حضرت علامہ خودی کے پاس دار نہ ہوتے اور ان میں قلندرانہ جلال نہ ہوتا تو اتنی بڑی رقم کا چیک اس پائے استحقار سے نہ ٹھکراتے اور یوں واپس نہ کرتے۔ بلاشبہ جن لوگوں نے اقبال کو صرف ان کے شعری مجموعوں میں دیکھا ہے وہ یہ اشعار پڑھ کر سر دھنتے ہیں اور کہتے ہیں جو قلندر اس مقام پر پہنچا ہوا ہے کہ اگر خدا بھی اس پر انعامات کی بارش یہ کہہ کر برسائے کہ یہ میری خدائی کی زکوٰۃ ہے تو اس کی غیرت نقر قبول کرنے سے انکار کر دے وہ کسی نواب کی طرف سے بھیجا ہوا ایک ہزار کا چیک کیسے قبول کر سکتا تھا۔ مگر جن لوگوں نے اقبال کو ایک انسان کی طرح دیکھا ہے اور اُسے اُس کی تمام تحریروں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس انکار کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد سے علامہ اقبال اپنے 1910ء کے سفر حیدر آباد میں ملے تھے اور ان کی قدر افزائی سے بہت زیادہ ممنون ہوئے تھے انہوں نے سر اکبر حیدری اور ان کی رفیقہ حیات لئیقہ بیگم کا ذکر بڑی احسان مندی سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہی کے ہاں قیام رہا اور یہ قیام بڑا پر لطف تھا پھر سر اکبر حیدری سے علامہ اقبال کی ملاقات ہوئی مگر اس ملاقات کے ذکر سے پہلے جاوید اقبال صاحب کی یہ بات پڑھ لیجئے وہ لکھتے ہیں۔

''اقبال بھی پیشہ وکالت میں جو تگ و دو کرنی پڑتی ہے اس سے میں بیزار تھے اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں فکر معاش سے نجات حاصل کر کے اپنے لٹریری مقاصد کی تکمیل کے لئے فرصت کے آرزومند تھے اسی سبب انہیں جب بھی موقع ملتا تھا حیدر آباد کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے تھے مثلاً اپنے خط محررہ 28 دسمبر 1926ء بنام مہاراجہ کشن پرشاد میں تحریر کرتے ہیں۔

''اگر سرکار کے اثر و رسوخ کی وجہ سے چیمبر آف پرنسز ہندوستانی رؤساء اور سرکار انگریزی

---

[45] زندہ رود ج 3 ص 335

کے تعلقات کے مسئلہ کو اپنا سوال بنالے تو حیرت انگیز نتائج کے پیدا ہونے کی توقع ہے رائل کمیشن ہندوستان میں عن قریب آنے والی ہے اس مسئلہ کی چھان بین کے لئے بین الاقوامی قانون جاننے والوں کی ایک جماعت تیار کرنی چاہئے جو کمیشن کے سامنے شہادت دینے والوں کو اس مسئلہ کے مالہٗ وماعلیہ میں پورے طور پر تیار کرے اگر اس مسئلہ میں اقبال کی ضرورت ہو تو وہ بھی اپنی بساط کے مطابق حاضر ہے انشاء اللہ سرکار والا اسے خدمت میں قاصر نہ پائیں گے مگر یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے اس کی طرف فوری توجہ ہونی چاہئے اور اس کے حل کا طریق بھی وہی ہے جو میں نے عرض کیا''[46]

اقبال کا خیال تھا حیدر آباد کو اس کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ ڈومینین سٹیٹس کا درجہ دیا جانا چاہئے تا کہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو وہ سمجھتے تھے کہ اگر حکومت برطانیہ کے پاس یہ کیس پہنچایا جائے اور اس کی صحیح طریقہ سے وکالت کی جائے تو حیدر آباد کو یہ پوزیشن حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں مہاراجہ کشن پرشاد غالباً یہ مسئلہ نظام کے گوش گزار نہ کر سکے اس لئے اقبال نے حیدر آباد کی ملازمت کے لئے اپنی جو گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ناکام رہی یہی تجویز 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران حضرت علامہ نے سر اکبر حیدری کے سامنے پیش کی مگر سر اکبر حیدری نے اسے مسترد کر دیا اور کہا اس اقدام پر ہندو ریاستیں ایجی ٹیشن کریں گی اور ممکن ہے دوسری ریاستیں بھی ایسی ہی مطالبات پیش کر دیں اس طرح انگریز حکومت سمجھے کہ نظام نے نیا مسئلہ کھڑا کر کے اُسے مشکل میں ڈالنے کی کوشش کی ہے اور وہ تجویز کو تو کیا منظور کرے گی الٹا نظام حیدر آباد سے ناراض ہو جائے گی غیر جانبداری سے تجویز کا جائزہ لیا جائے تو سر اکبر حیدری کی دلیل درست تھی اور اقبال کی تجویز ناقابل عمل تھی مگر معلوم نہیں اقبال کیوں اس پر مصر تھے انہوں نے اس پر جھگڑنا شروع کر دیا اس سے سر اکبر حیدری اور اقبال میں ناراضگی پیدا ہو گئی۔ سر فضل حسین کے فرزند عظیم حسین نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں سر فضل حسین نے علامہ اقبال کو نامزد کرایا تھا مگر وہ کانفرنس کے دوران سر اکبر حیدری سے جھگڑ پڑے[47]

---

[46] ایضاً ج2 ص85

ان تمہیدی کلمات کے بعد اب اُس یوم اقبال کی طرف آیئے جس کے سلسلہ میں سر اکبر حیدری کی طرف سے ایک ہزار کا چیک ارسال کیا گیا تھا دسمبر 1937ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام حیات اقبال ہی میں یوم اقبال منانے کا پروگرام بنایا گیا اس موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات نے 5 دسمبر 1937ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں ہندوستانیوں کو بالعموم اور پنجابیوں کو بالخصوص یوم اقبال کی تقریب کو ایک ''مقدس مذہبی فریضہ'' سمجھ کر اس میں شرکت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے یہ بیج بھی لگا دی کہ ''اس سلسلہ میں میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے وہاں کے باشندوں کو چاہئے کہ وہ شاعر اعظم کی خدمت میں ایک ایک تھیلی نذر کریں اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی کو چاہئے کہ امپیریل بینک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے اقبال کے نیاز مندوں اور ان کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہ راست بینک کو ارسال کریں جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی''[48]

اُس زمانہ میں کسی شاعر کی زندگی میں اس طرح کا دن منانے کی روایت نہ تھی مگر اقبال نے خود ''یوم اقبال'' منانے کی تجویز کی منظوری دی تھی اس لئے اسے عجیب سمجھا گیا تاہم اقبال مطمئن تھے بعد میں انہوں نے اپنے ایک خط میں اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا

''وہ تقریب جسے یوم اقبال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں میرے لئے صرف یہ خیال باعث طمانیت قلب ہے کہ جس زمین میں میں نے اپنا بیج پھینکا تھا وہ زمین شور نہیں''[49]

اس تجویز پر سر سکندر حیات نے جو اخباری بیان جاری کیا اس کی کیا ضرورت تھی وہ صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور اُس وقت ہوا کا رخ دیکھ کر پنجاب مسلم لیگ پر قبضہ کرنے لئے پر تول رہے تھے اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اقبال کا وجود تھا یا تو وہ اقبال پر احسان جتا کر اُسے اپنا منت کیش کرنا چاہتے تھے اور یا وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اقبال صرف ایک شاعر ہے اور اس شاعر کو رقم

---

[47] اے پولیٹیکل بائیوگرافی ص319 [48] اقبال کے آخری دو سال از عاشق حسین بٹالوی ص542-541

[49] مکتوب بنام ڈاکٹر سید عبداللطیف مشمولہ سرگزشت اقبال از عبدالسلام خورشید ص528

اکٹھی کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچانے کی سوجھی ہے بہر حال علامہ اقبال نے یہی سمجھا کہ وہ میری احتیاج کا مذاق اڑا کر یوم اقبال کو محض میرے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کی ترکیب سمجھ رہا ہے سر سکندر کے اخباری بیان کا جواب بڑے معقول طریقہ سے دیا پہلے تو انہوں نے وزیر اعلیٰ کا شکریہ ادا کیا پھر انہوں نے کہا کہ میری حاجات کی بجائے قوم کی حاجات زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اس لئے اگر یوم اقبال کے حوالہ سے افراد ملت کوئی فنڈ جمع کرتے ہیں تو مجھے دینے کے لئے نہیں لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک شعبہ قائم کیا جائے جس کے اراکین اسلامی علوم کی جدید طریقوں کے مطابق تحقیق کریں اور یہ کہ اس شعبہ کے لئے جو فنڈ قائم کیا جائے گا اس کے لئے وہ خود ایک سو روپیہ کا چندہ حاضر کرتے ہیں۔

بہر حال سر سکندر کا بیان مجموعی طور پر ایک طنز سمجھا گیا ان ہی حالات میں سر اکبر حیدری کی طرف سے ایک ہزار کا چیک موصول ہوا چونکہ علامہ اقبال اور سر اکبر حیدری میں شکر رنجی بھی موجود تھی اس لئے حضرت علامہ نے چیک کو سر سکندر کی طنز کا ایک عملی حصہ سمجھا اور چیک واپس کر دیا ہماری اس بات کی تائید فرزند اقبال کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''شروع شروع میں سر فضل حسین یا سر عبدالقادر کی طرح سر اکبر حیدری سے بھی اقبال کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے لیکن گول میز کانفرنسوں کے دوران سیاسی اختلافات کی بناء پر ان تعلقات نے محض رسمی صورت اختیار کر لی تھی بہر حال اقبال کے نقطہ نگاہ سے اس تکلیف دہ واقعہ نے تعلقات کی رسمی عمارت کو بھی منہدم کر دیا'' [50]

''اس تکلیف دہ واقعہ'' کی تفصیل اس سے پہلے ڈاکٹر جاوید اقبال ان الفاظ میں لکھ چکے ہیں۔

''10 جنوری 1938ء کو نظام حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سر اکبر حیدری نے غالباً سر سکندر حیات کے گزشتہ بیان سے متاثر ہو کر ایک ہزار روپے کا چیک اقبال کو ارسال کیا اور ساتھ تحریر کیا کہ یہ رقم شاہی توشہ خانہ سے جس کا انتظام ان کے ذمہ ہے بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے اس پر اقبال سخت برہم ہوئے چیک لوٹا دیا گیا اور سر اکبر حیدری کے نام والے اشعار بھی لکھے'' [51]

آگے چل کر لکھا ہے

---

[51] [50] زندہ رود ج 3 ص 353

''نظر حیدر آبادی کی تحقیق کے مطابق اس حادثہ کے پس منظر میں شاہی توشہ خانے کے ایک ہندو منتظم کی نااہلی اور غلط کاری کے سوا کچھ نہ تھا جس نے عمداً یا ناواقفیت کی بناء پر چیک کے ساتھ دفتری زبان میں ایک خشک اور سپاٹ سا مراسلہ بھی سر اکبر حیدری کی جانب سے اقبال کی خدمت میں روانہ کر دیا'' [52]

یعنی اس میں سر اکبر حیدری کا قصور بھی نہیں تھا یہ ساری کارستانی ایک ہندو ملازم کی تھی اور ایک ہزار کا چیک واپس کرنے کی وجہ وہ مراسلہ تھا اگر وہ نہ ہوتا تو شاید علامہ اقبال اسے قبول فرما لیتے۔

بہر حال یہ پہلا یوم اقبال بڑی شان و شوکت سے منایا گیا اس یوم اقبال میں قرآنی فکر کے داعی علامہ اسلم جیراجپوری اور علامہ غلام احمد پرویز بھی شامل ہوئے تھے علامہ اسلم جیراجپوری نے اس پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ان کی کتاب ''نوادرات'' شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام میں شامل ہے اس وقت مذکورہ کتاب میرے سامنے نہیں تاہم مجھے یاد ہے علامہ اسلم جیراجپوری نے کچھ اس طرح کا ایک جملہ لکھا تھا کہ اس عظیم فکری و روحانی اجتماع کو مادی سہارا اس وقت ملا جب سر شاہنواز کی طرف سے اعلان ہوا کہ علامہ اقبال کی عظیم ملی خدمات کے پیش نظر ان کے فرزند جاوید اقبال کے نام سر شاہنواز نے دس مربع اراضی منتقل کرادی ہے۔ جاوید اقبال نے بھی سر شاہنواز کی اس نوازش کا ذکر کیا ہے مگر یوم اقبال کے حوالے سے نہیں، انہوں نے یونہی بر سبیل تذکرہ لکھا ہے۔

''اس زمانہ میں (اقبال کے آخری ایام میں) میاں شاہ نواز نے اقبال سے دیرینہ تعلقات کی بناء پر اور ایک چچا کی حیثیت سے راقم کو اپنی اراضی میں سے دس مربع بھی عطا کئے جن کی قیمت روپوں کی صورت میں ان کی وفات کے کئی برس بعد بیگم شاہ نواز نے راقم کے انکار کے باوجود اسے عطا کر دی'' [53]

یہاں ہم آپ کو اقبال کا وہ خط یاد نہیں دلائینگے جو انہوں نے سر کشن پرشاد کو لکھا تھا اور جس میں کہا تھا کہ خدمت سرانجام دیئے بغیر کچھ لینا مروت اور دیانت سے بعید سمجھتا ہوں۔

آخر میں ہم پروفیسری کی ملازمت سے استعفے کے اُس واقعہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول

---

[52] زندہ رود ج 3 ص 353 [53] زندہ رود ج 3 ص 340

کراتے ہیں جس پر علی بخش نے ملازمت چھوڑنے کا سبب پوچھا تھا اور مبینہ طور پر حضرت علامہ نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو کچھ اور جواب دیا تھا لیکن علی بخش کو کچھ اور کہا تھا۔ اس استعفیٰ کے سلسلہ میں ایک اور تحریر بھی قابلِ توجہ ہے شیخ عبدالماجد لکھتے ہیں۔

''مصنف ذکر اقبال (مولانا سالک) کا یہ ارشاد کہ علامہ نے کالج سے خود استعفیٰ دیا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ علامہ کی یہ ملازمت عارضی تھی جو مسٹر سانڈرز کے ملازمت پر آجانے سے از خود ختم ہوگئی پھر ایک سال دو ماہ اور بیس دن کی ملازمت کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ علامہ جو کچھ کہنا چاہیں نہ کہہ سکیں کیونکہ 1917ء میں دوبارہ ملازمت کے بندھن میں گرفتار ہونے کی خواہش کرتے ہیں اور یہ بھی کہ جج کے لئے پروفیسر کی نسبت اظہار خیال پر زیادہ پابندی ہوتی ہے'' [54]

اقبال ہو یا کوئی اور کسی بھی ملازمت کی جکڑ بندیوں کو پسند نہیں کرتا مگر حالات مجبور کر دیتے ہیں اور آدمی اپنے لئے یا اپنے لواحقین کے لئے یہ جوا اپنی گردن میں ڈالے رکھتا ہے۔ علامہ نے 1909ء میں ہی عطیہ کو لکھا تھا ''میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا میری خواہش یہ ہے کہ جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ جاؤں اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں صرف اسی چیز نے مجھے روک رکھا ہے'' [55]

ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اقبال کی قلندری کا چرچا کرنے کی بجائے یہ واضح کرنا چاہئے کہ وہ کس کس طریقہ سے اپنی اور اپنے لواحقین کی معاشی ضروریات بھی پوری کرتے رہے اور اپنا علمی و ادبی کام بھی کرتے رہے وہ اگرچہ یہ خواہش کرتے رہے کہ کسی مسلمان ریاست کا نواب انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لے لیکن ہم سمجھتے ہیں اچھا ہوا کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی ایک مسلمان ریاستی نواب کی محدود ذہنیت ان کی صلاحیتیں تباہ کر دیتی۔

[54] تبصرہ از شیخ عبدالماجد طبع ثانی 1993 ص 385 [55] ''اقبال'' (انگریزی) از عطیہ بیگم فیضی ص 36

اقبال نگاروں کی غلط بیانیاں

اقبالؔ کو چونکہ اب ایک پورے نظام فکر کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اس لئے میں نے اقبال نگار کی اصطلاح اسی وسیع تناظر میں استعمال کی ہے اس سے میری مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے اقبال کی زندگی یا اس کے افکار پر لکھا ہے یہ بڑا وسیع موضوع ہے اس پر لکھنا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اقبال پر لکھنے والے بہت سے لوگ وہ ہیں جنہوں نے اقبال کو اپنی خواہش حصول شہرت کی تسکین کا ذریعہ سمجھ کر ادھر اُدھر سے کچھ چیزیں جمع کر کے چھاپ دی ہیں اور قاری کو بھول بھلیاں میں ڈال دیتے ہیں یا اسے ''گم راہ'' کر دیتے ہیں میرے پاس ''اقبالیات'' پر لکھا ہوا پورا ذخیرہ نہیں اس لئے میں نے صرف آئندہ لکھنے والوں کے لئے بنیادیں فراہم کر دی ہیں اس کے ساتھ ہی اپنے قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ جو کچھ آپ نے اس موضوع پر پڑھا ہے ضروری نہیں کہ وہ سب سچ ہو اکثر بڑے بڑے نامور دانستہ یا نادانستہ آپ کو غلط مواد مہیا کرتے ہیں اور آپ کی سوچ کو غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی صاحب سے لکھنے میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی بعد میں لکھنے والوں نے مکھی پر مکھی مارنے کے شغل میں وہی بات نقل کر دی اور پھر اسی غلطی کو دہرانے والوں کی لائین لگ گئی۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔ جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' کے باب ''تدریس و تحقیق'' میں لکھا ہے

''اقبال 13 مئی 1899ء کو اورینٹل کالج میں ''میکلوڈ عریبک ریڈر'' کی حیثیت میں متعین ہوئے چار سال کے عرصہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل تراجم و تالیفات مرتب کیں'' ان تالیفات کا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے نمبر 1 کے تحت لکھا ہے ''نظریہ توحید مطلق پیش کردہ شیخ عبدالکریم الجیلی'' (انگریزی) یہ پہلی تحریر انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ تھا جس میں الجیلی کی تصنیف ''انسان کامل''

پر بحث کی گئی تھی'' ❶

یہ اقبال کا پہلا مقالہ تھا جو انگریزی میں لکھا گیا تھا اور Indian Antiquary ماہ ستمبر 1900ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تحریر بہت عرصہ تک اقبال نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہی حالانکہ ''انڈین اینٹی کیوری'' کی فائیل مشہور لائبریریوں ''پنجاب پبلک لائبریری'' ''پنجاب یونیورسٹی لائبریری'' وغیرہ میں محفوظ چلی آتی تھی۔ شاید اس وقت یہ بحث نہ چھڑی ہو کہ اقبال کی پہلی مطبوعہ تحریر کونسی تھی بہر حال یہ مضمون اقبال نگاروں کے لئے نامعلوم رہا۔ جب بعد میں اقبال کی فارسی کتاب ''اسرار خودی'' کو انگریزی میں نکلسن نے شائع کیا تو اس پر ڈکنسن جیسے کچھ تبصرہ نگاروں نے لکھا کہ اقبال نے ''انسان کامل'' کا تصور نیٹشے کے "Superman" سے لیا ہے اقبال نے اس کی تردید کرتے ہوئے 26 جنوری 1921ء کو نکلسن کو وضاحتی مکتوب لکھا جس میں بتایا گیا کہ اقبال نے نٹیشے سے یہ تصور نہیں لیا یہ تو مرد مومن کا قرآنی تصور ہے اور مسلمان صوفیاء میں بھی عام ہے اسی سلسلہ میں انہوں نے عبدالکریم الجیلی کے ''انسان کامل'' کا حوالہ دیا اور اپنے 1900ء میں لکھے ہوئے مقالہ کی بھی بات کی مگر صراحت نہیں کی اقبال پر کتابیں لکھی جاتی رہیں مگر اقبال نگار بھی اس مضمون کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ 1954ء میں سہ ماہی رسالہ ''اقبال'' لاہور میں دو اقبال نگاروں عبدالغنی اور نورالٰہی خواجہ نے Bibliography of Iqbal شائع کرائی ❷

اس میں اس مقالہ کا ذکر ہوا اور اس کا عنوان یہ لکھا گیا

"Doctorine of absolute unity as explained by Abdul Karim Al-Jilli" حالانکہ اصل عنوان یہ تھا۔

The Doctorine of the absolute unity as expounded by Abdul Karim Al-Jilli آپ دیکھ رہے ہیں ایک تو عبدالغنی اور خواجہ نورالٰہی نے دو جگہ لفظ The چھوڑ دیا ہے دوسرے Expounded کی جگہ Explained لکھ دیا ہے 1955ء میں قاری احمد میاں اختر کی کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' منظر عام پر آئی اُنہوں نے عبدالغنی اور خواجہ

❶ ''زندہ رُود'' (حیات اقبال کا تشکیلی دور) ص 87 ❷ ''سہ ماہی اقبال'' جولائی تا ستمبر 1954ء

نور الٰہی کی غلطی ہو بہو دہرادی۔ قاضی صاحب کی اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1965ء میں اور تیسرا ایڈیشن 1977ء میں شائع ہوا مگر ان میں بھی غلطی کی اصلاح نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب نے ''انڈین اینٹی کیوری'' رسالہ کا حوالہ تو لکھ دیا ہے مگر شمارہ نمبر اور مہینہ کا ذکر نہیں کیا اس کا مطلب ہے انہوں نے ماخذ دیکھنے کی تکلیف نہیں کی عبدالغنی اور خواجہ نور الٰہی کی نقل کر دی۔ اس کے بعد ایک اور صاحب خواجہ عبدالوحید نے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام ہے "A Bibliograpy of Iqbal" انہوں نے بھی اقبال کے متذکرہ مقالہ کا عنوان اسی طرح درج کیا ہے جیسے عبدالغنی و خواجہ نور الٰہی نے لکھا تھا اور قاضی احمد میاں اختر کی کتاب میں تھا خواجہ عبدالوحید پر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اصل ماخذ ''انڈین اینٹی کیوری'' کا حوالہ دیتے ہوئے شمارہ نمبر اور مہینہ بھی درج کیا ہے مگر وہی غلطیاں دہرائی گئی ہیں۔ برصغیر کے لوگ مدت مدید تک انگریزوں کے غلام رہے اس لئے وہ یوروپ کی ذہنی غلامی کا شکار ہیں ہمارے ہاں مستشرقین کو عظیم اور بے مثال سکالر سمجھا جاتا ہے خواہ ان کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ان ہی لوگوں میں ڈاکٹر این میری شمل بھی ہیں ان کا مطالعہ اقبال ہمارے چند مصنفین تک محدود ہے انہوں نے 1963ء میں اقبال کی ''بال جبریل'' کا ترجمہ کیا انہوں نے بھی نطشے کے حوالہ سے اقبال کا دفاع کرتے ہوئے لکھا کہ اقبال تو الجیلی کے ''انسان کامل'' کو موضوع بناتے ہوئے 1900ء میں مقالہ لکھ چکا تھا اور اس وقت وہ نیٹشے سے واقف بھی نہیں تھا انہوں نے بھی اس مقالہ کا نام اُسی طرح لکھا ہے جس طرح عبدالغنی اور خواجہ نور الٰہی لکھ چکے تھے [3]

حالانکہ 1962ء میں ڈاکٹر وحید قریشی مقالہ کا صحیح عنوان لکھ چکے تھے [4]

مگر این میری شمل نے شاید یہ وضاحت نہیں دیکھی۔ ایک اور مشہور ''محقق'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تھے انہوں نے 1962ء میں ایک مضمون ''اقبال اور ینٹل کالج میں'' لکھا اس میں اقبال کے مقالہ کا عنوان تو درست لکھا مگر ایک اور بھیانک غلطی کر دی انہوں نے ''الجیلی'' کا لفظ پڑھ کر یہ سمجھا کہ یہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی بات ہو رہی ہے حالانکہ ہر کتاب میں ''عبدالکریم الجیلی'' لکھا ہوا ہے اور جو آدمی مسلمانوں کے ''متصوفانہ علم کلام'' کا معمولی مطالعہ بھی رکھتا ہے۔

---

[3] Gabreil's wing-Bibliography [4] سرمایہ فکر و نظر جلد اوّل 1962ء

وہ عبدالکریم الجیلی سے بخوبی واقف ہے مگر ہمارے یہ اقبال نگار محقق لکھتے ہیں۔

''شیخ محمد اقبال ایم اے نے نظریہ توحید مطلق پیش کردہ شیخ عبدالقادر جیلانی

(The Doctorine of the Absolute unity as expunded by

Al-Jilli) (نامی کتاب) مرتب کی'' [5]

غالباً ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے کہیں اسی طرح پڑھا جیسے انہوں نے لکھا ہے اس میں ''الجیلی'' کے ساتھ عبدالکریم لکھا ہوا نہیں تھا الجیلی سے وہ واقف نہیں تھے انہوں نے اسی پر قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور اسے شیخ عبدالقادر الجیلانی بنا دیا۔ ایک اور ''محقق اقبال نگار'' ہیں محمد حنیف شاہد انہوں نے ''مفکر پاکستان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو 1982ء میں شائع ہوئی انہوں نے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار والی بات من وعن دہرا دی اسی طرح ''الجیلی'' کو شیخ عبدالقادر جیلانی لکھ دیا ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو مغالطہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس نام سے کوئی کتاب مرتب کی تھی محمد حنیف شاہد صاحب نے بھی لکھا ہے ''اقبال نے یہ کتاب 1900ء تک مکمل کر لی تھی'' [6]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو تو شاید ان کی غلطی سے کسی بھلے آدمی نے آگاہ کر دیا اور انہوں نے متذکرہ بالا مضمون کے تقریباً بیس سال بعد ''اقبال کا تعلق اورنٹیل کالج سے'' کے عنوان سے تفصیلی مضمون لکھا جس میں اپنی تمام غلطیوں کی اصلاح کر دی یہ مضمون اُن کی کتاب اقبال ایک مطالعہ میں شامل ہے [7]

مگر یہ نہ بتایا کہ انہوں نے پہلے فلاں سن میں اس موضوع پر لکھتے ہوئے ٹھوکریں کھائی تھیں۔ معلوم نہیں محمد حنیف شاہد صاحب کو یہ خبر پہنچی یا نہیں۔

ہمارے کچھ اقبال نگار وہ ہیں جو روا روی میں بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اقبال کی زندگی کے واقعات کا مطلق علم نہیں مگر یہ ان ہی لوگوں کو معلوم ہو سکتا ہے جو اقبال کی زندگی کے متعلق صحیح معلومات رکھتے ہوں جو قاری زیادہ نہیں جانتے وہ ''بڑے نام'' دیکھتے ہیں اور تحریر

---

[5] سہ ماہی ''اقبال'' لاہور اپریل 1962ء [6] ''مفکر پاکستان'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1982ء ص 82

[7] ''اقبال ایک مطالعہ'' ص 27

سے مسحور ہو کر غلط معلومات ذخیرہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اس سلسلہ کی ایک مثال دیکھ لیجئے۔ جاوید اور منیرہ کی والدہ کی وفات کے بعد اقبال کی خواہش تھی کہ کوئی محترم خاتون ان کی اتالیق کے طور پر مل جائے اُن کی یہ خواہش مشہور کتاب ''گنج ہائے گرانمایہ'' کے مصنف رشید احمد صدیقی نے اس طرح پوری کی کہ ایک جرمن خاتون ڈورس صاحبہ کو بھیج دیا علامہ اقبال نے اس انتظام کی اطلاع سید راس مسعود کو ان الفاظ میں دی تھی۔

''جاوید کی عمر اس وقت تقریباً 13 سال ہے اور منیرہ کی قریباً سات سال ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں اس لئے میں نے مذکورہ انتظام کیا ہے'' 8

یہ محترمہ جولائی 1937ء میں اقبال کی وفات سے تقریباً نو ماہ پہلے علی گڑھ سے اقبال کے گھرانے آئیں اور پھر جیسے اس گھرانے کی ایک فرد بن گئیں وہ اقبال کی وفات کے بعد بھی تقریباً پچیس سال تک اس گھر میں رہیں انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی "Iqbal, as I knew him" اقبال اکیڈیمی کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد منور صاحب اس کتابچہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اس کتابچہ میں شامل مواد کئی کتب پر بھاری ہے۔ میں نے اقبال کی گھریلو زندگی کے بارے میں یہ کتابچہ رقم فرمانے پر اقبال اکیڈیمی کی طرف سے دس ہزار روپیہ انعام پیش کرتے ہوئے محترمہ سے کہا' آپ جاوید اقبال اور منیرہ بانو ہی کی آمی نہیں ہم سب کی آمی ہیں آپ نے ہمارے پیرومرشد (یعنی اقبال) کو کئی تفکرات سے چھٹکارا دلایا خصوصاً بچوں کی تربیت کے باب میں۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید حضرت علامہ ''ضرب کلیم'' پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' اور ارمغان حجاز مکمل نہ کر پاتے۔ اس اعتبار سے اے محترمہ ڈورس صاحبہ آپ کا احسان فقط پاکستانی مسلمانوں پر نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ پر ہے'' 9

اقبال اکیڈیمی کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر محمد منور صاحب کو یہ علم نہیں کہ ''ضرب کلیم'' 1936، میں ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ستمبر 1936ء میں شائع ہوئیں اور محترمہ ڈورس

---

8 ''اقبال نامہ'' حصہ اوّل ص 384 مکتوب محررہ 8 جون 1937ء 9 نوائے وقت لاہور اقبال نمبر 21 اپریل 1986ء

صاحبہ قریباً سال بھر بعد یعنی جولائی 1937ء میں تشریف لائیں۔ اقبال نگاروں میں سے بعض نے اقبال کے کچھ اشعار کو اپنے مطلب کا مفہوم پہنانے کی بھی کوشش کی ہے اور بڑی چالاکی سے اقبال کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کا تردد کیا ہے مثال کے طور پر آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقبال لاکھ اختلاف کے باوجود مارکس کے پیش کردہ معاشی نظام سے بڑی حدتک متفق تھا اس نے کارل مارکس کے متعلق کہا تھا۔

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب

یعنی مارکس وہ کلیم تھا جس پر موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی طرح تجلی نازل نہیں ہوئی وہ ایسا مسیحؑ تھا جسے مصلوب نہیں کیا گیا وہ پیغمبر تو نہیں تھا لیکن اس کی بغل میں پیغمبروں جیسی انقلاب آفریں کتاب ضرور تھی)

جماعت اسلامی کے ایک ادیب تھے سید اسعد گیلانی انہوں نے اقبال کی ایک اور نظم جو ''ضرب کلیم'' میں شامل ہے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اقبال نے مارکس کی کتاب سرمایہ ''داس کیپٹل'' (Das Capital) کی تردید کی اور مارکس پر طنز کرتے ہوئے لکھا۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش، مریز و کج دار کی نمائش

حالانکہ ''ضرب کلیم'' کی اس مختصر نظم کا عنوان ہے ''کارل مارکس کی آواز'' یعنی کارل مارکس سرمایہ دارانہ نظام کے معیشت دانوں پر طنز کر کے کہہ رہا ہے نہ یہ کہ اقبال مارکس کی کتاب پر طنز کر رہا ہے مارکس کی کتاب کو تو وہ پیغمبرانہ طرز کی انقلاب آفریں کتاب قرار دے چکا ہے سید اسعد گیلانی مرحوم ایک اچھے ادیب تھے اُن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اقبال کی نظم کا مفہوم نہیں سمجھ سکے میرے نزدیک وہ دانستہ اپنی سوشلزم دشمنی کے اظہار کے لئے اقبال کے شعر کو اپنی مرضی کا مفہوم پہنا کر جھوٹی دلیل تراش رہے تھے۔ سید اسعد گیلانی مرحوم کی حدتک چلیئے ہم ایک لمحہ کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ انہیں سمجھنے میں غلطی ہوگئی اور انہوں نے دانستہ علمی بددیانتی کا ارتکاب نہیں کیا مگر ڈاکٹر سید عبداللہ کے متعلق تو

میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اقبال کی اس نظم کا اصل مفہوم نہیں سمجھے ہوں گے مگر میں دیکھ کر حیران ہوا کہ انہوں نے مرحوم پیر کرم شاہ صاحب کے ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کے مشہور ''سوشلزم نمبر'' میں یہی حرکت کی یہی شعر لکھا اور فرمایا کہ اقبال نے مارکس پر سخت طنز کرتے ہوئے یہ شعر لکھا تھا۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کرتا چلوں ۔نواب امیر محمد خان آف کالاباغ سابق گورنر مغربی پاکستان کے سالے ملک شیر محمد خان بڑے صاحب مطالعہ علم دوست آدمی تھے ان کی سیاست تو ان کی اپنی تھی میرے وہ علمی دوست تھے اور میری علمیت کے قدردان تھے اکثر گاڑی بھیج کر مجھے کالاباغ بلا لیتے اور دو تین روز ہماری علمی محفلیں بجی رہتیں ۔ ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کا سوشلزم نمبر میں نے دیکھا تو ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس علمی بددیانتی کا ذکر کیا انہوں نے یوسف سلیم چشتی کی لکھی ہوئی ''شرح ضرب کلیم'' نکالی اور مذکورہ نظم کی تشریح دیکھی ۔چشتی صاحب نے بھی میرے بیان کردہ مفہوم کی تائید کی تھی پھر انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کو خط لکھا کچھ روز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا جواب آ گیا انہوں نے لکھا تھا'' آپ نے ٹھیک لکھا ہے علامہ اقبال کی نظم کا وہی مفہوم ہے کہ یہ'' کارل مارکس کی آواز'' ہے اور مارکس سرمایہ دارانہ معیشت کے علمبردار ماہرین پر طنز کر رہا ہے'' آگے ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا ''مجھ سے غلطی ہوگئی آئندہ اگر اس موضوع پر لکھنا ہوا تو میں اس غلطی کا ازالہ کردوں گا'' ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا' کتنے غلط اندیش ہوتے ہیں یہ' بڑے ناموں والے لوگ'' ڈاکٹر سید عبداللہ سے اگر نادانستہ غلطی ہوئی اور وہ سچ مچ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے تو ان کا فرض تھا کہ وہ' ضیائے حرم' کے اگلے شمارہ میں اعتراف کرتے کہ وہ پہلے جو بات کہہ بیٹھے تھے وہ غلط تھی اور صحیح بات یہ ہے مگر وہ اپنے خط میں طرح دے گئے۔

اس طرح کی باتوں کو ہم ''تحریف معنوی'' کہہ سکتے ہیں مگر اقبال کی تحریروں میں تحریف لفظی بھی ہوتی رہی خاص طور پر ان کے خطوط میں یہ تلبیس ہوئی بلکہ ایسا بھی ہوا کہ کسی نے یونہی کوئی خط لکھ کر اقبال سے منسوب کر دیا اور وہ اقبال کے خطوط میں شامل کر دیا گیا۔اسی طرح کی ایک تحریر مولانا محمد علی جوہر کے متعلق ہے ۔یہ تحریر اُس خط میں ہے جو عباس علی خان لمعہ کے نام ایک خط میں وارد ہوئی ہے مولانا جوہر کی وفات پر لکھا گیا ہے

''محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی مداح نہیں تھا۔ لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انہوں نے ثبوت دیا بہت احترام کرتا ہوں'' ⑩

علامہ اقبال کے عقیدت مندان خاص ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سید عبدالواحد معینی کی رائے میں عباس علی خان لمعہ کے نام اقبال کے خطوط جعلی ہیں ⑪

علامہ اقبال کے خاندان میں ان کے کچھ قریبی رشتہ دار احمدیت (میرزائیت) کے متعلق نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد تو باقاعدہ احمدی تھے اور آخر دم تک احمدی ہی رہے علامہ اقبال نے انہیں اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کیا تھا ان کی وصیت کے مطابق میاں امیر الدین، چودھری محمد حسین اور اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد اقبال کے بچوں کے گارڈین تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تقریباً دس ماہ پہلے سر راس مسعود کو بھوپال کے پتے پر خط لکھا اس خط میں تحریر تھا'' شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کردوں'' ⑫

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے یہ خط براہ راست لیڈی سر راس مسعود سے حاصل کر کے اسے ''اقبال نامہ'' میں شامل کیا تھا ''اقبال نامہ'' 1945ء میں شائع ہوا تھا ⑬

اس خط کے جواب میں سر راس مسعود نے لکھا میں تو خود لاہور سے دور رہتا ہوں اور گارڈین شپ سے معذوری ظاہر کردی ایک نظر اس ''اقبال نامہ'' مطبوعہ 1945ء کا احوال دیکھ لیجئے لکھا گیا ہے۔ ''چودھری محمد حسین احمدیت کے شدید مخالف تھے جس وقت 1945ء میں ''اقبال نامہ'' چھپا۔ چودھری محمد حسین پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ اور پیپر کنٹرولر تھے کتاب کے پبلشر شیخ محمد اشرف صاحب تاجر کتب کشمیری بازار لاہور تھے شیخ محمد اشرف اور سید نذیر نیازی صاحب کے بیان کے مطابق چودھری محمد حسین صاحب نے مکاتیب کے بعض مقامات پر جو انہیں ناپسند تھے قطع و برید سے کام لیا خاص طور پر

---

⑩ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل خط محررہ یکم فروری 1931ء بنام عباس علی خان لمعہ ص 268

⑪ ''نیرنگ خیال تاثیر نمبر'' 1970ء ص 74 اور ''نقش اقبال'' از عبدالواحد معینی ص 184

⑫ ''اقبال نامہ'' مطبوعہ 1945 ص 386 ⑬ ''تبصرہ برزندہ رُود'' ص 49

10 جون 1937ء والا خط (جس میں شیخ اعجاز احمد کو نہایت صالح بتا کر عیال داری کے باعث گارڈین شپ سے الگ کرنے کی بات ہے) شائع شدہ کتب سے حذف کرا دیا گیا کیونکہ شیخ اعجاز احمد کا نہایت صالح آدمی'' چودھری صاحب کی سیاست کو گوارا نہیں تھا لیکن اس اقدام کے وقت چند کتب فروخت بھی ہو چکی تھیں چنانچہ بعض لائبریریوں میں فروخت شدہ نسخہ موجود ہے مثلاً دیکھئے لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، قائداعظم لائبریری وغیرہ'' (14)

ریٹائرڈ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال ایک اور کہانی سناتے ہیں وہ لکھتے ہیں'' (بعد میں) وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کے خط مورخہ 10 جون 1937ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہے دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں

''شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے علاوہ وہ خود عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے دور رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا''

مگر سر راس مسعود نے لاہور سے دور ہونے کے سبب یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے اقبال کو وصیت نامہ میں تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑی'' (15)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس خط کے لئے ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ کتابیات کے سلسلہ میں حوالہ لکھتے ہیں'' اقبال نامہ'' مرتبہ'' اخلاق اثر'' بھوپال صفحات 77,76'' یہ حوالہ لکھ کر آگے لکھتے ہیں یہ خط'' اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل صفحات 386,387 پر بھی موجود ہے لیکن اس میں یہ فقرے'' مگر افسوس ہے کہ دینی عقائد کی رو سے وہ قادیانی ہے تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں'' حذف کئے گئے ہیں (16)

ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال صاحب نے عجیب تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ عام طور پر جو'' اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ پھیلایا گیا ہے اس سے تو یہ پورا خط ہی حذف کر دیا

(14) ''مظلوم اقبال'' ص 333 تا 339 بحوالہ تبصرہ ص 50 (15) ''زندہ رُود'' ص 571-570 (16) ایضاً ص 701

گیا اور جس اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ کا وہ حوالہ دے رہے ہیں وہ تو چند گنے چنے نسخے ہیں جو چودھری محمد حسین کے اقدام سے پہلے فروخت ہو چکے تھے، جاوید اقبال صاحب نے ایک جسٹس کی طرح نہیں بلکہ ایک حیلہ جو وکیل کی طرح یہ پینترا بدلا ہے کہ شیخ عطاء اللہ والے اقبال نامہ میں قادیانی عقیدہ رکھنے اور مسلمان بچوں کا گارڈین ہونے کی بات حذف کردی گئی ہے بھلا شیخ عطاء اللہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ جملے حذف کر دیتا اور اگر اصل خط میں یہ جملے ہوتے تو قادیانی دشمن چودھری محمد حسین کو کیا پڑی تھی کہ پورا خط ہی حذف کر دیتا۔ اصل میں خط کا جو متن جاوید اقبال نے نقل کیا ہے اس میں متذکرہ جملے صاف طور پر الحاقی ہیں ان کا سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں جملے بڑے بے جوڑ سے ہیں علامہ اقبال سرراس مسعود سے پوچھتے ہیں آیا قادیانی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں پھر سوال کو بے جواب چھوڑ کر شیخ اعجاز احمد کے لاہور سے دور رہنے کی بات شروع کر دیتے ہیں یہ کیا انداز بیان ہے ادھر جواب میں سرراس مسعود بھی اس سوال پر کچھ نہیں کہتے اپنے لاہور سے دور ہونے پر معذوری ظاہر کر دیتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ اقبال تو گارڈین مقرر کرنے کے معاملہ میں بڑے آزاد خیال واقع ہوئے تھے شیخ اعجاز احمد اقبال کے وصیت نامہ مرتب کرنے کے بعد قادیانی نہیں ہوئے تھے وہ تو بہت پہلے سے قادیانی تھے اگر اقبال قادیانی کو مسلمان بچوں کا گارڈین مقرر ہونا غلط خیال کرتے تو وہ انہیں مقرر ہی کیوں کرتے؟ پھر یہ کہ سرراس مسود کے انکار کے بعد ان ہی شیخ اعجاز احمد ہی کو کیوں رہنے دیتے؟ علامہ اقبال نے شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کا بھی اقرار کیا اس سے بھی ظاہر ہے کہ گارڈین کی تبدیلی کا خیال محض شیخ اعجاز احمد کی عیال داری اور لاہور سے دوری تھا مذہب کی کوئی بات ہی نہیں تھی کیونکہ اقبال تو عیسائی خاتون ڈورس کو بھی گارڈین مقرر کرنے پر آمادہ تھے ڈورس کا اپنا بیان ہے۔

''وفات سے کچھ عرصہ پیشتر علامہ نے مجھے کہا میں چاہتا ہوں کہ میاں امیر الدین کے ساتھ تمہیں اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کروں'' [17]

اصل میں خط میں الحاقی جملے ''اخلاق اثر'' صاحب کی کارستانی ہے شیخ عطاء اللہ نے تو خط کی نقل براہ راست لیڈی راس مسعود سے حاصل کی تھی اب چالیس سال بعد اخلاق اثر کو یہ خط کہاں سے

[17] "Iqbal as I knew him" Page 48

مل گیا اخلاق اثر صاحب کے اس خط کو دیکھ کر شیخ اعجاز احمد نے بذات خود بھوپال سے اصل خط یا فوٹو کاپی حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ بھی دستیاب نہ تھا (18)

''تبصرہ'' کے مصنف کے بیان کے مطابق مشہور ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ ذکاء اے۔ملک نے اخلاق اثر کے پیش کردہ خط کو پرکھا تو سراسر جعلی تھا اس کی تفصیلی رپورٹ ہفتہ وار مہارت 8 اپریل 1994ء میں شائع ہوگئی ہے (19)

کچھ ایسے لوگ جن کا اقبال سے کچھ تعلق رہا اقبال کی وفات کے بعد انہوں نے بھی خوب خوب غلط بیانیاں پھیلائیں اس پر بہت سا مواد موجود ہے مگر میں صرف دو تین مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

عطیہ بیگم فیضی اقبال پر اپنی کتاب میں لکھتی ہے

''اقبال نے اپنے کسی خط میں حیدر آباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور مجھ سے تعارفی چٹھی کے طالب ہوئے میں نے اپنے عزیز سر اکبر حیدری (جو اُن دنوں نظام کے فنانس کے معتمد تھے) کے نام تعارفی خط لکھ دیا'' (20)

مگر یہ عطیہ بیگم کی غلط بیانی ہے ''اقبال نامہ'' میں اور عطیہ کی کتاب میں اسی طرح کے کسی خط کا نام ونشان نہیں ملتا۔اقبال نے اپنے سفر حیدر آباد کی روداد بیان کرتے ہوئے محترمہ کو جو خط لکھا اس کے متن سے ہی عطیہ کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے اقبال نے 30 مارچ 1910ء کو عطیہ بیگم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

''اگر میں حیدر آباد میں کچھ عرصہ مزید قیام کر سکتا تو مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نس نظام مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے۔میں وہاں کے سب بڑے آدمیوں سے ملا ہوں اور کئی ایک نے مجھے اپنے یہاں مدعو بھی کیا، میرا حیدر آباد جانا کچھ معنی رکھتا تھا جس کے بارے میں ملاقات پر آپ سے عرض کروں گا۔صرف سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری سے ملنا میری سیاحت کا مقصد نہیں تھا۔شاید آپ انہیں (سر اکبر حیدری کو) جانتی ہوں حیدر آباد میں ملاقات سے پیشتر مجھے ان سے واقفیت کی مسرت

---

(18) ''مظلوم اقبال'' ص339 (19) ''تبصرہ برزندہ رُود'' ص64

(20) Iqbal by Attiya Faizi page 53

حاصل نہ تھی ان کے ہاں میرا قیام نہایت پر لطف رہا'' (21)

عطیہ بیگم فیضی نے خود یہی خط اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس خط میں تو اقبال کہہ رہے ہیں ''شاید آپ انہیں (یعنی سر اکبر حیدری اور ان کی بیگم کو) جانتی ہوں''

سر عبدالقادر علامہ اقبال کے دوست بھی رہے اور پھر تعلقات میں فرق بھی آ گیا گوپال متل کے مطابق ایک ملاقات میں اقبال کے بعض اشعار کی انہوں نے عجیب عجیب وضاحتیں کیں مثلاً اقبال کے ظریفانہ کلام میں ایک قطعہ ہے۔

سُنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

عام سی طنز یہ بات ہے ''اسمبلی ہال'' کے متعلق عام لوگ یہ کہتے تھے کہ یہاں قانون سازی وغیرہ نہیں ہوتی بس سرمایہ دار اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ''نشستند و گفتند و برخاستند'' ہی کا سماں ہوتا ہے اقبال نے اسی تاثر کو شعر کی صورت میں بیان کر دیا ہے مگر سر عبدالقادر نے کہا کہ اقبال الیکشن میں ہار گئے تو انہوں نے ''کونسل ہال'' پر یہ طنز کی۔ حالانکہ اقبال نے ایک ہی دفعہ الیکشن میں حصہ لیا تھا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے اسی طرح تین اور شعروں کی بھی بروایت گوپال متل سر عبدالقادر نے ایسی ہی احمقانہ تشریح کی (22)

انسان کے مر جانے کے بعد اس سے منسوب کر کے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کسی بات کی تائید یا تردید کرنے کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں یہ باتیں واقعی سر عبدالقادر نے کیں یا گوپال متل نے اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی دھن میں ان کے ذمہ لگا دیں ہمارے خیال میں دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ سر عبدالقادر لاکھ ''اقبال دشمن'' ہوں وہ ایسی خامکاری کی باتیں نہیں کر سکتے جن کی تردید کرنے والے اس وقت زندہ لوگ بھی موجود تھے اور اقبال کی زندگی کے واقعات تاریخ کا حصہ بھی بن چکے تھے اقبال کے عقیدت کیش ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے اپنی کتاب ''چند یادیں'' میں

(21) ایضاً ص 55 (22) 'لاہور کا جو ذکر کیا'' از گوپال متل شائع کردہ ''مکتبہ تحریک'' دریا گنج دہلی 1971ء ص 151-153

سر عبدالقادر پر طویل مضمون لکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ سر عبدالقادر بڑے ثقہ اور معتبر آدمی تھے ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ نشان دہی کرتے اصل بات یہی ہے کہ یہ گوپال متل کی گپ بازی ہے۔

ایک صاحب ہیں قاضی عبدالحمید ایم اے پی ایچ ڈی انہوں نے اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اگر چہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے یہ مقالہ بڑا معلومات افزا ہے لیکن اس میں اُن سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں

''مجھے خیال بھی نہ تھا کہ علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ مجھے کچھ دن گزارنے اور ان کی زبانی ان کے خیالات سننے کا موقع ملے گا لیکن قسمت کی یاوری دیکھئے کہ علامہ اقبال جس وقت دوسری گول میز کانفرنس 1934ء میں مسلمانان ہند کے وفد کے صدر کے حیثیت سے لندن جارہے تھے تو میرا ان کا جہاز پر ساتھ ہو گیا'' [23]

علامہ اقبال کو پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی دوسری گول میز کانفرنس میں دعوت دی گئی تھی اور وہ شریک بھی ہوئے مگر دوسری گول میز کانفرنس 1934ء میں نہیں 1931ء میں منعقد ہوئی تھی یہ 27 ستمبر 1931ء سے شروع ہوئی اور یکم دسمبر 1931ء کو اختتام پذیر ہوئی قاضی صاحب نے 1934ء غلط لکھا دوسری بات قاضی صاحب نے یہ غلط لکھی کہ انہوں نے مسلمانان ہند کے وفد کے صدر کی حیثیت سے گول منیر کانفرنس میں شرکت کی یہ بھی صریحاً غلط ہے وہ اس وفد کے صدر نہیں ایک رکن تھے، آگے قاضی صاحب لکھتے ہیں

''علامہ نے لکھنؤ کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہئے'' [24]

اس میں بھی قاضی صاحب سے یہ غلطی سرزد ہو گئی کہ انہوں نے الہٰ آباد کے خطبہ صدارت میں کہی ہوئی بات کو لکھنؤ کا خطبہ صدارت کر دیا۔

ہم نے ان ہی چند باتوں کو لکھ دیا ہے جو طائرانہ نظر میں ہمارے سامنے آئی ہیں اور پھر یہ کہ طائرانہ نظر میں سامنے آنے والی باتوں میں سے بھی ہم نے کچھ صرف ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور

---

[23] رسالہ ''اردو'' اقبال نمبر طبع جدید ص 195 [24] رسالہ ''اردو'' اقبال نمبر طبع جدید ص 195

پر مبنی ہیں''، ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر ہر لکھنے والے کی تحریر چھان پھٹک کی محتاج ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اچھے اچھے ثقہ اور قابل اعتماد سمجھے جانے والے مصنف بھی اپنے جذبات اپنے ممدوح کے منہ میں رکھ کر اپنی بات اس سے منسوب کر دیتے ہیں اس کی ایک مثال دیکھئے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کو بہت ہی معتبر اقبال نگار سمجھا جاتا ہے انہوں نے جنوری 1938ء میں نہرو اقبال ملاقات کا ذکر کیا ہے جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کے میزبان میاں افتخار الدین اور ان کی بیگم بھی تھیں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نہرو اقبال گفتگو کے ضمن میں کہتے ہیں ''ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کی گفتگو جاری تھی کہ یکا یک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے' ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں گے تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے یہ سنتے ہی غصہ میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے' اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں اُن کا معمولی سپاہی ہوں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے'' [25]

اس پر تفصیلی گفتگو تو ہم ''اقبال جناح تعلقات'' کے باب میں کریں گے سر دست یہ دیکھ لیجئے کہ اس وقت اقبال کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اس محفل میں موجود نہ تھا [26]

اور بیگم میاں افتخار الدین جو وہاں موجود تھیں' انہوں نے اس بیان کی تردید کی ہے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں ''اس بارے میں بیگم افتخار الدین تردیدی بیان اخباروں میں شائع کرا چکی ہیں اور راقم کو زبانی بھی بتایا ہے'' [27]

☑

[25] ''اقبال کے آخری دو سال'' از عاشق حسین بٹالوی ص 549 [26] ''زندہ رُود''
[27] ''زندہ رُود'' باب 21 حاشیہ نمبر 77 ص 708

اقبال اور بعض افراد تاریخ

اقبال نے اپنے اشعار میں بعض ایسے افراد کا نام لیا ہے جن سے ان کے تعصّبات یا عقیدتیں وابستہ رہیں کہیں اُنہوں نے اُن افراد سے اپنی وابستگی کا سبب بیان کیا ہے کہیں یونہی ان سے عقیدت کا اظہار کر دیا ہے یہی صورت حال اُن افراد کے ساتھ بھی رہی ہے جن کے متعلق ان کی رائے مخالفانہ تھی۔ شارحین اقبال نے یقیناً ان موضوعات پر کام کیا ہوگا میں اس کام پر کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے بالعموم شارحین کی مدد سے اقبال کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے ویسے بھی میرا انداز نظر عام شارحین سے جدا رہا ہے یہ حضرات اقبال کی عقیدتوں اور نفرتوں میں خود کو بھی ضم کئے رکھتے ہیں اور ذاتی رائے یا تو رکھتے نہیں یا اس کا اظہار نہیں کرتے۔ عام طور پر ان کا انداز یہ رہتا ہے کہ جس شخص سے اقبال کو عقیدت ہے وہ خود کو اس کی عقیدت میں ڈبو کر اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے میں ملانا اور وہ کچھ کہنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں جو شاید اقبال کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ اسی طرح یہ اقبال کی نفرت کو بھی اپنی ذاتی نفرت میں سمو کر اس شخص کو دنیا بھر کی برائیوں کا مجسمہ بنا ڈالتے ہیں جن سے اقبال نے اختلاف کیا تھا۔ شاید تشریح و تبیین کے تقاضے بھی یہی ہوں مگر ایسے معاملات میں میں اُن شارحین کی تقلید سے قاصر رہا ہوں کچھ ایسے افراد کا بھی اقبال نے نام لیا ہے جن سے نفرت یا محبت کا اظہار نہیں کیا گیا میرے نزدیک یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ ان حضرات کا تعارف بھی کرایا جائے مگر شارحین اکثر اس سے گریز کرتے ہیں میں ان تمام افراد پر لکھنا ضرور سمجھتا ہوں مگر سر دست صرف چار پانچ افراد کو ہی میں نے منتخب کیا ہے۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آیئے۔

مازنی

بانگ درا میں اقبال کی جو غزلیں ہیں ان میں کے بعض اشعار مجھے بہت پسند ہیں میرے ان

ہی پسندیدہ اشعار میں ایک سادہ سا شعر مجھے اپنی معنویت میں جذب کر لیتا ہے آپ بھی دیکھ لیجئے

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو

جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

میں نے جب بھی یہ شعر پڑھا ہے میں اس تصور میں ڈوب گیا ہوں اقبال بحری جہاز کے عرشہ پہ کھڑا دیکھ رہا ہے اٹلی کے سبزہ زار اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں سبزہ زار ویسے بھی ایک شاعر کو متاثر کرتے ہیں اور دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ خدا ان زمینوں کی ہریالیاں قائم رکھے مگر اقبال کے پاس ان سرسبز میدانوں کے لئے کچھ اور اسباب احترام بھی ہیں اور وہ یہ کہ سرسبز میدان اُس اٹلی کے ہیں جو مازنی کا وطن ہے اور جب یہ خیال آتا ہے اقبال کے ہاتھ سلام عقیدت کے لئے اٹھ جاتے ہیں مگر یہ مازنی کون تھا؟ ایک مازنی تو اٹلی کا مشہور مفکر اور سیاسیات کا سکالر تھا بعض لوگ اس کا شمار یوروپ کے صف اوّل کے مدبرین میں کرتے ہیں۔ اس مازنی (Mazzini) کے افکار میں بھی اقبال کے لئے ایک وجہ احترام موجود ہے۔ جب ہم اس نقطہ نظر سے سوچتے ہیں تو ہماری نگاہیں اقبال کے سیاسی نظریات کی طرف جاتی ہیں۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقبال جمہوریت مخالف نظریات رکھتا تھا۔ اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم ہے، جمہوریت کا مطلب ہے اکثریت کی حکومت' اقبال غیر منقسم ہندوستان کا ایک مسلمان شاعر تھا جو سیاست کو مذہب کے حوالہ سے دیکھتا تھا اور قومیت کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر کرنے کا علمبردار تھا ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اقبال نے بھی کبھی وطینت اور قومیت کے راگ الاپے تھے اور ''خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا'' سمجھا تھا مگر بہت جلد اس پر سرسید کا جداگانہ قومیت والا ترمیم شدہ نظریہ غالب آ گیا تھا اور وہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' کی وکالت کرنے لگا تھا، اگر وہ جمہوریت کی تائید کرتا تو اس کے خیال میں وہ پورے کا پورا ہندوستان ہندوؤں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوتا جو اس کے لئے ناممکن تھا اُسے اکثریت کا اور اکثریت کی حکومت کا خوف جمہوریت کی مخالفت پر اُکسا رہا تھا جس وقت اس نے یہ غزل لکھی ہوگی یقیناً اُسے جمہوریت سے زیادہ نفرت نہیں ہوگی لیکن اُس کے ذہن میں یہ اندیشہ تو راسخ ہوگا کہ اکثریت اُس کے عقائد پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے

اسی اندیشہ کے تحت اس کے اندر جمہوریت کے لئے محبت جنم نہیں لے سکتی تھی بعد میں جمہوریت کے لئے یہی ناگواری باقاعدہ مخالفت اور دشمنی میں بدل گئی اور اُس نے یہ کہا۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

پھر بڑھتے بڑھتے یہ مخالفت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ اُس نے کھل کر کہہ دیا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صدخر، فکر انسانے نمی آید

(ترجمہ: جمہوریت سے بھاگ اور پختہ کار غلام بن جایعنی ڈکیٹٹر شپ قبول کرلے کیونکہ دوسو گدھوں کے دماغوں سے بھی ایک انسان کے برابر سوچ برآمد نہیں ہوسکتی)

جمہوریت پر یہ تنقید اس کے نزدیک علمی و عقلی تنقید تھی اس وقت ہم اس کے علمی و عقلی جواب کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے نہ ہم اتنی تفصیل میں جا سکتے ہیں کہ اقبال کا نظریہ درست تھا یا غلط اور اس کے اعتراض کا معقول جواب کیا ہوسکتا ہے؟ بہر حال اپنی حد تک اقبال کی تنقید مدلل تھی کہ آخر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور شخص کی رائے ایک عام جاہل اور سیاسی شعور سے عاری شخص کے برابر کیسے ہوسکتی ہے؟ بعض لوگ بلکہ اکثر شارحین اقبال کہتے ہیں کہ اقبالؔ جمہوریت کا قائل بھی ہوگیا تھا وہ اپنے خیال کی تائید میں اقبال کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

وہ حضرات ''سلطانی جمہور'' سے جمہوریت مراد لے لیتے ہیں اور پھر ثابت کرنے لگتے ہیں کہ اقبال جمہوریت کا قائل ہوگیا تھا۔ بلکہ اس کی حمایت کرنے لگا تھا۔ اور پھر اقبال کے کلام میں تضادات کے وسیع موضوع میں جمہوریت کے متعلق بھی اس کے نظریات کو شامل کردیتے ہیں مگر میں کہتا ہوں یہاں ''سلطانی جمہور'' سے مراد کچھ اور ہے' آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقبال معاشی مساوات کی حد تک سوشلزم کو درست سمجھتا تھا، یہ نظم ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو'' ان ہی تاثرات کی نقیب ہے

یہاں سلطانی جمہور سے مراد وہی جمہوریت ہے جسے مارکسزم، لینن ازم میں Proltariate Dictatorship کہتے ہیں ویسے عام جمہوریت کے لئے بھی اقبال نے یہ ترکیب استعمال کی ہے وہ اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ایک مشیر کی زبان سے کہلواتے ہیں

''خیر ہے ''سلطانی جمہور'' کا غوغا کہ شر؟

اس میں عام جمہوریت کے لئے سلطانی جمہور کی ترکیب استعمال ہوئی ہے لیکن جس نظم کی ہم بات کرر ہے ہیں اس کے تمام اشعار بالصراحت بتا رہے ہیں کہ وہاں یہ ترکیب سلطانی جمہور پرولتاری ڈکیٹرشپ کے مفہوم میں ہی استعمال ہوئی ہے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' والے اشعار میں جمہوریت کی تحقیر کی گئی ہے کیونکہ اقبال سرمایہ دارانہ جمہوریت کے حق میں نہیں تھے لیکن جس نظم میں سلطانی جمہور کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور جس کا حوالہ ہم لے رہے ہیں اس میں واضح انداز میں جمہوریت کی سلطانی کو تحسین ہوئی ہے۔

اس بحث میں ہم مزید تفصیل میں نہیں جاسکتے کیونکہ ہمارا موضوع اور ہے، بہرحال جمہوریت کو اقبال اس لئے بھی رد کرتا ہے کہ وہاں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا اقبال کو جمہوریت سے ایک اور بڑا اختلاف بھی ہے اور وہ یہ کہ جمہوریت یا ڈیموکریسی میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کے پاس ہوتا ہے جبکہ اقبال اور دیگر مسلمان مفکرین سیاست کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ کا مالک خدا ہے اور یہ بنیادی اختلاف ہے جمہوریت میں اگر اکثریت اتفاق کر لیتی ہے کہ مثلاً شراب کا استعمال جائز ہے تو اس کے جواز کا قانون بن جائے گا لیکن اقبال اور دیگر مسلمان مفکرین اس صورت میں اکثریت کی رائے کو ٹھکرا دیتے ہیں کیونکہ خدا نے شراب کو ناجائز کہہ دیا ہے پاکستان میں جو آئین رائج ہے اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا حیرت ہے کہ اس وضاحت کے ہوتے ہوئے بھی کہا جاتا ہے یہ آئین جمہوری ہے اور علماء حضرات جمہوریت کی بحالی کا نعرہ لگاتے ہیں اور تقریر میں کہتے رہتے ہیں کہ جمہوریت اسلام ہی نے سکھائی ہے حالانکہ اقبال نے صاف کہہ دیا تھا۔

''اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت نہ ارسٹا کریسی ہے نہ تھیا کریسی، بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف ہے اور قبائح سے منزہ'' [1]

اقبال جمہوریت کے خلاف یہ دلیل بھی رکھتا تھا کہ اس میں اقتدار اعلیٰ خدا کی بجائے عوام کے پاس آجاتا ہے اٹلی کا مدبر وسیاست مازنی بھی جمہوریت کے خلاف ایسی ہی باتیں کہتا تھا۔ یہاں ہم اس کا صرف ایک اقتباس درج کرتے ہیں بات واضح ہو جائے گی مازنی لکھتا ہے

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھا اصول ہے یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی اجتماعیت کا اور اپنی حکومت کا وجود قائم رکھ سکتی ہے لیکن ایک ایسی قوم جس میں وحدت عقائد نہ ہو وہاں اکثریت اقلیت کے عقائد کی پروا نہیں کرتی اور اُسے دبا کر رکھتی ہے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے، وہ ایک انسان ہو یعنی ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں ہو یا ایک سے زیادہ انسان ہوں یعنی جمہوریت کی شکل ہو دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی ایسی چیز رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے غلبہ اور تسلط سے محفوظ رکھ سکے اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور نا قابل تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں خدا کے سوا جس طرح کی بھی حکومت ہو نتائج کی حقیقت ایک سی رہتی ہے خواہ اس کا نام ''بونا پارٹ'' رکھ لیں خواہ ''انقلاب''۔ اگر خدا کو درمیان سے ہٹا دیں تو ہر حکمران اپنے عہد سطوت میں جابر و مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیئے جب حکومت خدا کی نگرانی کے بغیر چلائی جائے اور کاروبار حکومت چلانے میں خدا کے قانون سے صرف نظر کر لیا جائے تو کسی کا کوئی حق مسلم نہیں ہوتا۔ حکومت تو ہے ہی اسی لئے کہ منشائے خداوندی کی ترویج وتنفیذ کرے اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی سے قاصر رہتی ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ اسے بدل ڈالو ایسی حکومت کے برسر اقتدار رہنے کا کوئی جواز نہیں'' [2]

یہ ہیں وہ نظریات جو اقبال کی اپنی سوچ سے ہم آہنگ ہیں ان ہی کے باعث مازنی سے اقبال کو عقیدت تھی اور وہ مازنی کے وطن کے میدانوں کو ہرا رہنے کی دعائیں دیتے ہوئے انہیں سلام محبت

---

[1] ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور طبع اول ص 172 [2] Qtd. by Grrith in Interpreters of man p.46

وعقیدت پیش کر رہا تھا یہاں ایک وضاحت بھی ہو جائے کہ جس مازنی کا ہم نے ذکر کیا ہے اُسے میزینی بھی کہتے ہیں مازنی نام کا اٹلی کا ایک اور ہیرو بھی ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک جس دور میں اقبال نے وطن مازنی کے میدانوں کو ہریالیوں کے دوام کی دعائیں دی تھیں اُس دور میں اقبال وطن پرستی کے جذبات سے معمور تھا اور اُس کے لئے اس دوسرے مازنی کے کردار میں بڑی وجہ کشش تھی۔

تاریخ عالم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں جب استعمار فروغ پارہا تھا اور امپیریلزم دوسرے ملکوں کی گردنوں میں اپنی محکومی اور غلامی کے پٹے ڈال رہا تھا تو اس دور میں اٹلی اور جرمنی بہت پیچھے رہ گئے تھے اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان دونوں ملکوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں اور ایک طرح کی طوائف الملو کی تھی اور اس انتشار کے باعث یہ ملک کمزور ہو رہے تھے برطانیہ اور فرانس سامراج کے نمائندے تھے اور ان کی پوری کوشش تھی کہ یہ انتشار وافتراق قائم رہے اور ریاستیں متحد ہو کر ان کی امامت کو چیلنج نہ کرنے لگیں اور ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر قبضہ جمانے اور ان کے وسائل لوٹنے میں حصہ دار بننے کے خبط میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ان ہی دنوں جینوا کا ایک وکیل میدان عمل میں اترا اس کا نام مازنی تھا اس نے 1831ء میں ''ینگ اٹلی'' کے نام سے ایک خفیہ انقلابی انجمن قائم کی جس کا بنیادی مقصد تھا کہ ایک متحدہ دستور کے تحت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے اٹلی کو ایک مضبوط ومستحکم ملک میں بدلا جائے اور اطالوی قوم کو متحد کر کے ایک محکم قوت بنا دیا جائے اٹلی میں قومی اتحاد کی یہ تحریک 1848ء میں شروع ہوئی اور برابر زور پکڑتی گئی 1849ء میں مازنی کی انجمن اس قابل ہوگئی کہ روم کی ری پبلک کی بنیاد رکھ سکے ایسا ہو بھی گیا مگر یہ انقلاب مستحکم ثابت نہ ہوا اور ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مازنی کو روم چھوڑنا پڑا۔تاہم وہ جہاں بھی گیا اس نے تحریک اٹھائی اور لوگوں کو منظم کرتا رہا بہت جلد مازنی کی ہدایات کے تحت قومی اتحاد کی خاطر مختلف شہروں میں بھرپور اور فعال مظاہرے ہونے لگے اس مرحلہ پر گیری بالڈی بھی مازنی کی مدد کو آ پہنچا اٹلی کا شمالی حصہ آسٹریا کے قبضہ میں تھا گیری بالڈی نے آسٹریا کے خلاف اطالوی بغاوت میں اپنا کردار ادا کیا اور کئی مہمات سر کر لیں ادھر اس نے فرانس کو روم میں داخل ہونے سے روکے رکھا اور سسلی پر قابض ہو کر نیپلز فتح کر لیا آخر کار مازنی اور گیری بالڈی کی مساعی سے اٹلی کا قومی اتحاد شاہ وکٹر ایمینو لی دوم کے تحت انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہو گیا اب اٹلی بھی مضبوط قوت بن گیا اور وہ بھی استعمار کی دوڑ میں شریک ہو گیا اس نے

مشرقی افریقہ کے علاقوں اریٹیریا اور صومالیہ پر قبضہ کرلیا یوں مازنی نے اپنے خوابوں کو اپنی کوششوں سے تعبیر سے ہم آغوش کردیا۔ اقبال بھی ان دنوں وطینت کے جذبوں سے سرشار تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے اپنے وطن ہندوستان میں مذہبی وسیاسی افتراق ختم ہو تمام اہل ہند آپس میں محبت اور پریت کو فروغ دے کر حصول آزادی کے لئے متحد ہو جائیں وہ اُن مذہبی رہنماؤں کا مخالف تھا جو مذہب کے نام پر ہندومسلم اتحاد میں رخنے ڈال رہے تھے وہ مسجد ومندر کو ملا کر ایک نیا شوالہ تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کی فضائیں اختلاف وفتراق کی بس بھری آب وہوا'' سے پاک ہوں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے
کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
غنچوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوانے

3

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کر ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقش دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیر تھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملادیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے

سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اُس سے پانی

اُس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہادیں

4

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس وقت حضرت علامہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور تلقین کرتے تھے کہ

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا

یہ وہ شے ہے جو جنت سے نکلواتی ہے آدم کو

وہ متحدہ قومیت کے علمبردار تھے افتراق پر دردمندانہ آنسو بہاتے تھے اور بڑی اولوالعزمی سے اعلان کرتے تھے

نہ پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو

جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

یہی نعرہ مازنی کا بھی تھا اور چونکہ اس نے اپنی بے مثال جدوجہد سے ''اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑا تھا'' اور اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اس لئے اٹلی کا یہ ہیرو اقبال کو بھی محبوب تھا اور اس نے اس کے حضور میں وطن مازنی کے میدانوں کو سرسبز شاداب رہنے کی دعائیں دی تھیں اور انہیں عقیدت واحترام سے لبریز زبان سے سلام کیا تھا۔ مگر آپ کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہندو مسلم اتحاد کے یہ جذبات اور ایک ملک کے عوام کو اتحاد کی لڑی میں پرونے والے لوگوں کے لئے احترام کے یہ جذبات

---

3 اور 4 اقبال نے اپنے کلام پر بالخصوص بانگ درا میں شامل کلام پر نظر ثانی کی تو کئی اشعار حذف کر دیئے تاہم بعد کے لوگوں نے ان کا حذف کردہ کلام بھی جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ایسی ہی ایک کتاب ''باقیات اقبال'' ہے اس میں ''نیا شوالہ'' اپنی پہلی صورت میں موجود ہے یہ دونوں اشعار بھی اسی میں ہیں ان کے علاوہ اسی نظم کے کچھ اور اشعار بھی ہیں۔

اقبال کے دل و دماغ کا سرمایہ اُس وقت تھے جب وہ حصول تعلیم کے لئے انگلستان جا رہے تھا مگر جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو متحدہ قومیت کے یہ جذبات ختم ہو گئے تھے اب وہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' کہنے والے اقبال نہیں تھا اب وہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' کہنے والا اقبال تھا یہ ذہنی انقلاب اور فکری تغیر کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ ہوسکتا ہے اس کے اور عوامل بھی ہوں مگر شاید ایک عامل یہ بھی تھا کہ اقبال اُن انگریزوں کے دیس میں گیا اور قیام پذیر رہا تھا جن کی حکومت ہندوستان پر تھی اور اُن کے متفقہ سوچ یہ تھی کہ ان کی حکمرانی تبھی قائم رہ سکتی تھی جب وہ ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ رکھیں۔ سر جان میلکم نے لکھا تھا۔

''اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عمل داری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر جماعت کے اندر بھی مختلف ذاتوں اور فرقوں کی صورت میں پھوٹ ہو جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہیں کر سکے گی'' [5]

اور سر جان مینارڈ ممبر ایگزیکٹو کونسل پنجاب نے کہا تھا

''ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہوسکتی نہ برقرار رہ سکتی یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت برطانیہ کے عہد میں ہی شروع ہوئی'' [6]

آگے چل کر سر جان مینارڈ نے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

''یہ درست ہے کہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا ادھر کسی نے گائے ذبح کرنے پر مجنونانہ جوش میں آکر سزائیں دیں لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا ہندو تھے یا مسلمان دونوں ایک ہی عبادت گاہ میں اپنی اپنی عبادت بھی کر لیا کرتے تھے'' [7]

ہندو مسلم اختلاف وافتراق کا بیج انگریزوں نے بویا یہی پودا شجر ثمر دار بنا اور اسی کا پھل چکھ

---

[5] ''کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم'' از میجر باسو ص 147 [6] "Unhappy India" by Lalah Lajpat p. 408 [7] ایضاً

کران دوقوموں میں باہمی نفرت اور عداوت کوفروغ ملا سر جان مینارڈ نے تو اس شجر علم کا ثمر چکھنے کی بات کی ہے اقبال تو انگلستان سے شجر علم کا پھل پیٹ بھر کر اور سیر ہو کر کھانے گیا تھا اس لئے پلٹا تو اس نے مسلمانوں کو الگ قوم کہنے والوں کی بھرپور حمایت شروع کر دی اور انہیں فکری غذا مہیا کرنے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ صلاحتیں وقف کر دیں اب انہیں مازنی سے شاید کوئی دلچسپی نہیں رہی ہوگی۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

بال جبریل میں اقبال کی ایک نظم ہے ''پنجاب کے پیرزادے'' اس کا پہلا شعر ہے۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار

یہاں شیخ مجدد سے مراد شیخ احمد سرہندی ہیں جو مجدد الف ثانی کے نام سے معروف ہیں علامہ اقبال کو ان سے بڑی عقیدت تھی عقیدت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علامہ اقبال عمر کے ایک بڑے حصہ تک وحدت الوجود کے مخالف اور وحدت الشہود کے قائل رہے شیخ احمد سرہندی وحدت الشہود کے بہت بڑے علمبردار تھے پہلے وہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے مگر پھر وحدت الشہود کے مبلغ اعظم بن گئے وہ اس نظریہ کو اپنے ذہنی ارتقاء کی معراج خیال کرتے تھے چنانچہ اپنے ذہنی سفر کے مراحل بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''عنفوان شباب سے بندہ وحدت الوجود کا قائل تھا جب حلقہ نقشبندی میں شامل ہوا تو تھوڑی مدت کے بعد ہی توحید وجودی منکشف ہوگئی اور اس کشف میں غلو پیدا ہوا اس مقام کے علوم ومعارف بکثرت ظاہر فرمائے گئے اور اس مقام کی باریکیوں میں سے شاید ہی کوئی باریکی ہوگی جو منکشف نہ کی گئی ہو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے دقائق ومعارف پوری طرح ظاہر کئے گئے اور تجلی ذات جسے صاحب فصوص (ابن عربی) نے انتہائے عروج قرار دیتے ہوئے اس تجلی کی شان میں فرمایا **وَمَا بعد هٰذا اِلّا عدم المحض** (اور اس کے بعد تو بس عدم محض ہی ہے یعنی کچھ بھی نہیں) مجھے اس تجلی سے بھی مشرف فرمایا گیا'' [8]

[8] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی ج 1 ص 110

یہ وحدت الوجود کی منزل تھی شیخ سرہندی کے مطابق اسی کو ابن عربی انتہائی معراج سمجھتے تھے مگر شیخ سرہندی کے دعویٰ کے مطابق ان کا سفر آگے بھی جاری رہا کہتے ہیں۔

''اس کے کچھ عرصہ بعد اس درویش پر ایک اور نسبت غالب ہوئی اور اس کے غلبہ میں توحید وجودی میں توقف پیدا ہوا لیکن یہ توقف توحید وجودی والوں کے ساتھ حسن ظن کی بناء پر پیدا ہوا ایک مدت تک اس بارے میں متوقف رہا (یعنی متامل رہا کہ آگے جانا ہے یا نہیں) آخر الامر معاملہ توحید وجودی کے انکار تک پہنچا لیکن یہ انکار ارادی نہیں بے اختیارانہ تھا خود تو بندہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مقام سے باہر آئے اس لئے کہ بہت سے مشائخ عظام اسی مقام میں اقامت پذیر تھے بہرحال بندہ مقام ظلیت تک پہنچا اور محسوس ہوا عالم تو ظل (سایہ) ہے یہاں بھی اس امر کی آرزو پیدا ہوئی کہ کاش یہیں قیام رہے کیونکہ یہ درویش کمال وحدت الوجود میں پاتا تھا اور یہاں مقام ظلیت اسی سے کچھ مناسبت رکھتا ہے اچانک کمال نوازش وعنایت اور بندہ نوازی سے اس مقام سے بھی اوپر لے گئے اور مقام عبدیت تک پہنچادیا اس وقت اس مقام کا عروج کمال ظاہر ہوا اور اس کی بلندی واضح ہوئی اور گزشتہ مقامات سے تائب ہوا اور استغفار کیا۔ اگر درویش کو اس انداز سے نہ لے جاتے اور بعض مقامات کی بعض مقامات پر فضیلت نہ دکھاتے تو اس مقام عبدیت میں تنزل جانتا کیونکہ اس درویش کے نزدیک توحید وجودی سے بلندتر کوئی مقام نہ تھا لیکن اللہ ہی حق کو ثابت کرتا ہے اور راہ راست کی طرف ہدایت بخشتا ہے'' [9]

اس وقت وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفے ہمارا موضوع نہیں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اقبال کی شیخ سرہندی سے عقیدت اس دور میں اس وجہ سے تھی کہ دونوں فلسفہ وحدت الوجود کے خلاف تھے شیخ سرہندی بھی جب عبدیت تک پہنچتے ہیں تو وحدت الوجود سے توبہ واستغفار کرتے ہیں اور ذہنی ارتقاء کے اس دور میں علامہ اقبال تو ابن عربی اور ان کے فلسفہ وحدت الوجود سے اس درجہ متنفر ہیں کہ کہہ دیتے ہیں۔

''جہاں تک مجھے علم ہے فصوص (یعنی فصوص الحکم از ابن عربی) میں سوائے الحاد وزندقہ کے اور کچھ نہیں'' [10]

---

[9] ایضاً ص 383 [10] مکتوب اقبال 1916ء

1932ء تک کے شواہد ملتے ہیں کہ اقبال وحدت الشہود کے قائل تھے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

لوئی ماسینوں ایک فرانسیسی مستشرق تھے 1913ء میں انہوں نے منصور حلاج پر تحقیقی کام کیا تھا اور منصور حلاج کی تصنیف ''کتاب الطواسین'' کے عربی متن کو ایک مدلل مقدمہ اور افادیت سے لبریز حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا علامہ اقبال نے اسی کتاب سے متاثر ہو کر منصور حلاج کے متعلق اپنے نظریات بدل لئے تھے اور لوئی ماسینوں سے خط وکتابت شروع کر دی تھی علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے یوروپ گئے تو یکم نومبر 1932ء کو پیرس میں لوئی ماسینوں سے ملاقات کی اس ملاقات کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لوئی ماسینوں نے لکھا تھا۔

''اقبال سے کئی صدیاں پیشتر ہندوستان کے کچھ مسلمان مفکرین نے وحدت الوجود صوفیاء (دبستان ابن عربی) کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ فنائے اخروی کے متعلق ہندوافکار کی تمام کائنات ہے دبستان شہودیہ علی ہمدانی سے شروع ہو کر سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی تک ہے اقبال نے پیرس میں میرے ساتھ ملاقات کے دوران اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ وحدت الوجودی نہیں وحدت الشہودی ہیں'' [11]

شیخ احمد سرہندی کے مزار پر علامہ اقبال اپنے کم عمر بچے جاوید اقبال کو ساتھ لے کر 1934ء میں گئے جاوید اقبال مزار پر حاضری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''چودھری محمد حسین، حکیم طاہرالدین، علی بخش اور راقم ان کے ساتھ تھے ان کے پرانے دوست غلام بھیک نیرنگ انبالے سے سرہند پہنچے اور اقبال کے ساتھ مزار پر حاضری دی راقم کو خوب یاد ہے کہ وہ ان کی انگلی پکڑے ہوئے مزار میں داخل ہوا گنبد کے تیرہ تار مگر پروقار ماحول نے اس پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی اقبال تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور راقم کو بھی پاس بٹھا لیا پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے خاموش اور تاریک فضا میں ان کی رُندھی

[11] بحوالہ ''حکیم الامت علامہ اقبال فرانسیسی متشرق لوئی ماسینوں کی نظر میں'' از محمد اکرم چغتائی مطبوعہ نوائے وقت لاہور 4-11-1982

ہوئی مدھم آواز گونج رہی تھی راقم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راقم کی پیدائش پر اقبال نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر بارگاہ میں حاضری دیں گے دوسری وجہ کے متعلق انہوں نے نذیر نیازی کو اپنے خط مورخہ 29 جون 1934ء میں تحریر کیا' چند روز ہوئے صبح نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا'' ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان (شام کے معروف دروزی رہنما' اتحاد ممالک اسلامیہ اور احیائے اسلام کے بہت بڑے داعی) کے متعلق دیکھا تھا وہ سرہند بھیج دیا ہے' ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے' پیغام دینے والے کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کون ہے اس خواب کی بناء پر وہاں کی حاضری ضروری ہے'' [12]

ان تصریحات سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال شیخ سرہندی کے عقیدت مند تھے اس عقیدت مندی کا ایک سبب توحدت الشہود ہے جس کے علم بردار شیخ سرہندی تھے اور علامہ اقبال بھی اسی فلسفہ سے متاثر تھے (یہ الگ بحث ہے کہ بعد میں علامہ اقبال وحدت الوجود کے بھی قائل ہو گئے تھے) دوسری ایک وجہ علامہ اقبال نے بال جبریل کی اس نظم میں بیان کی ہے جس کے ایک شعر سے ہم نے ساری بحث اٹھائی ہے اب ذرا اس نظم کے مرکزی خیال کے تین اشعار ملاحظہ کیجئے ارشاد ہوتا ہے۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

اس میں اقبال نے اپنے ممدوح کا وہ وصف خاص بھی بیان کر دیا ہے جس کے باعث اقبال کو اس سے عقیدت ہے وہ وصف خاص ہے ''گردن نہ جھکی جس کی جہانگیرِ کے آگے'' یعنی شیخ سرہندی نے

[12] ''زندہ رود ج 3 ص 258

بادشاہ وقت شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا اور اس کی حاکمیت کو للکار دیا بلاشبہ یہ وصف خاص اگر اعلائے کلمہ حق کے لئے ہو تو عقیدت انگیز ہے اور اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے مگر افسوس ہے کہ تاریخ اقبال کی تصدیق اور تائید نہیں کرتی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی بڑے علم و فضل کے مالک تھے اور عبادات و مجاہدات میں بھی سرگرم رہتے تھے تجدید و احیائے شریعت میں بھی کوشاں رہتے تھے دوسرے صوفیاء کی طرح انہوں نے بڑے بڑے دعوے بھی کئے جن میں اپنے علوم رتبت کا چرچا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''میں اللہ تعالیٰ کا مرید بھی ہوں اور اس کا مراد بھی میری ارادت کا سلسلہ بالواسطہ اللہ سے متصل ہے اور میرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کے قائم مقام ہے'' [13]

یہ اور اس طرح کی کئی بلند بانگ دعووں سے معمور باتیں ہیں جو انہوں نے اپنے متعلق کہی ہیں لیکن سب سے زیادہ متنازعہ ان کا بیان کردہ ایک روحانی تجربہ بن گیا جس میں انہوں نے اپنے مدارج کے بلند سے بلند تر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حضرت صدیق اکبر کے مقام سے بھی بلند ہو گئے اس دعویٰ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

''حضرت صدیق اکبر کے مقام کے بالکل مقابل ایک اور مقام ظاہر ہوا جو نہایت نورانی تھا ایسا نورانی مقام کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اور یہ مقام حضرت صدیق اکبر کے مقام سے کچھ بلند تھا جس طرح چبوترے کو زمین سے کچھ بلند بناتے ہیں معلوم ہوا کہ وہ مقام، مقام محبوبیت ہے اور یہ مقام رنگین و منقش تھا میں نے اس کے پرتو سے اپنے آپ کو بھی رنگین و منقش پایا'' [14]

علماء کو شیخ سرہندی کی یہ تعلّی بہت ناگوار گزاری ان کے اسی قسم کے دعوے تھے جن پر شیخ عبدالحق جیسے انتہائی محتاط عالم دین کو بھی شدید اختلاف کا اظہار کرنا پڑا۔ انہوں نے شیخ سرہندی کے دعووں کی تردید میں چند رسالے لکھے [15]

مشہور کتاب خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ بعض علماء نے ان کے قتل کے جواز کا فتویٰ بھی صادر کر دیا خاص طور پر اُن کے اسی روحانی واردہ کو ہدف تنقید بنایا گیا جس میں انہوں نے حضرت

---

[13] مکتوبات امام ربانی مجدالف ثانی ج3 ص1500 [14] ایضاً ج1 ص63 [15] تذکرہ اولیائے کرام ص32

صدیق اکبر سے بلند مرتبہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا ان کی مخالفت کا طوفان اس قدر زور پکڑ گیا کہ شہنشاہ جہانگیر کو مداخلت کرنا پڑی 1619ء میں جب شیخ سرہندی کی عمر 55 سال تھی یہ طوفان اٹھا تو انہیں دربار شاہی میں طلب کیا گیا یہ واقعہ خود جہانگیر نے اپنی ''تزک'' میں تحریر کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

ان ہی ایام میں معلوم ہوا کہ سرہند میں ایک شخص احمد نے مکروفریب کا جال بچھا کر سادہ لوح انسانوں کو ورغلانا شروع کر رکھا ہے اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کیا ہوا ہے جو لوگوں کو طرح طرح کے فریب میں پھانس رہے ہیں اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو جو بیہودہ مکتوب لکھے ہیں انہیں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے ان وجوہات کی بناء پر میں نے اُسے دربار میں طلب کیا اور اس کی اصلاح کے لئے اُسے رائے سنگھ ولن کے حوالے کر دیا کہ اُسے قلعہ گوالیار میں قید کر دے''[16]

شیخ سرہندی کے عقیدت مندوں نے اس واقعہ کے بعد شیخ کی رہائی کے سلسلہ میں اپنی عقیدتوں کی خوب خوب رنگ آمیزی کی ہے اور عجیب عجیب کہانیاں گھڑی ہیں اور یہ تک کہ دیا ہے کہ جہانگیر نے معافی مانگی تھی اور خود بھی شیخ کا مرید ہو گیا تھا اور اپنے فرزند شہزادہ خرم (شاہ جہان) کو بھی مرید کرایا تھا مگر یہ سب کچھ عقیدت مندی کے کرشمے ہیں واقعاتی تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی اگلے برس شیخ کی رہائی کا واقعہ بھی جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے وہ کہتا ہے۔

''میں نے شیخ احمد سرہندی کو جسے بیہودہ گوئی کے سلسلہ میں کچھ عرصہ سے قید کر رکھا تھا طلب کر کے آزاد کر دیا اور خلعت اور ایک ہزار روپیہ عنایت کیا اور اُسے اجازت دی کہ چاہے تو سرہند چلا جائے اور چاہے تو میرے حضور میں رہے یعنی سرکاری ملازمت اختیار کر لے''[17]

آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ اس ساری تفصیل میں ''گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے'' والی بات کی بھنک بھی نہیں ملتی اقبال نے اپنی یہ نظم اس تناظر میں لکھی ہے کہ پنجاب کے پیرزادے حکومت کی خدمت کو اعزاز سمجھتے ہیں اور فقر کی ٹوپی کی جگہ طرہ باندھتے ہیں مگر شیخ سرہندی کی شان ہی اور تھی وہ شیخ سرہندی کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

---

[16] تزک جہانگیری اردو ترجمہ از احمد علی رامپوری ص 360 [17] ایضاً ص 392

عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق
طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار

مگر شاید اقبال کو معلوم نہ ہوسکا کہ جب جہانگیر نے شیخ سرہندی کو واپس سرہند جانے یا ملازمت میں رہنے کے Choice دیئے تو وہ واپس سرہند نہ گئے دربار ہی میں رہے بعض مورخ کہتے ہیں جہانگیر نے خود انہیں آخری وقت تک دربار میں زیرنگرانی رکھا تھا[18]

بہرحال اپنی مرضی سے رہے ہوں یا بادشاہ نے انہیں پابند کرلیا ہو دونوں صورتوں میں یہ حقیقت تو برقرار رہتی ہے کہ وہ خدمت سرکار میں رہے اور وہ جو اقبال نے کہا تھا ''گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے'' یا ''خدمت سرکار'' والی طنز جو پنجاب کے پیرزادوں پر ہوئی اور جس سے شیخ سرہندی کو بے زار قرار دیا گیا یہ دونوں باتیں اقبال کے حسن عقیدت کے شاخسانے تھیں۔تاریخ سے شیخ سرہندی کا یہ کردار ثابت نہیں ہوتا

ساحرالموط

''بانگ درا'' کی طویل نظموں میں ایک طویل نظم ''خضرراہ'' کا ایک بند ہے ''سرمایہ ومحنت'' اس کا ایک شعر ہے۔

ساحرالموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

اقبال نے ایک مشہور تاریخی کردار حسن بن صباح کو ساحرالموط لکھا ہے یہ لفظ ''الموط'' نہیں ''الاموت'' ہے جس کے معنی ہیں ''عقابوں کا نشیمن'' اسی کو الاموت اور الموط لکھا جانے لگا ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ''الاموت'' ہی لکھا جانا چاہئے کیونکہ وہ بڑا بامعنی لفظ ہے اور اُس قلعہ کے لئے تو اتنا موزوں ہے کہ ''اسم بامسمی'' کی تصویر بن جاتا ہے کہتے ہیں دوسرے پرندوں کی طرح تنکا تنکا اکٹھا

[18] حیات مجدداز پروفیسر محمد فرمان ص35

کر کے عقاب آشیانہ نہیں بناتے وہ پہاڑوں میں ہی انتہائی محفوظ جگہ تلاش کر لیتے ہیں جو انہیں موسم کی سختیوں سے بھی بچاتی ہے اور آدمیوں یا دوسرے جانوروں کی زد میں بھی نہیں ہوتی۔ الاموت کا مضبوط و مستحکم اور تقریباً نا قابل تسخیر قلعہ قزوین سے کچھ فاصلہ پر کوہستان میں ایک بلند چوٹی پر واقع تھا اور اس تک پہنچنے کا راستہ بڑا دشوار گزار تھا اس کی جائے وقوع اور راستے کی دشوار گزاری نے اسے بہت زیادہ نا قابل تسخیر بنا دیا تھا۔ مشہور مورخ علامہ جوینی نے اس پہاڑ کی لفظی تصویر کشی کرتے ہوئے اسے ایک اونٹ سے تشبیہ دی ہے جو زمین پر اپنے زانو رکھے اور گردن جھکائے بیٹھا ہو۔ ماضی قریب میں ماہرین آثار قدیمہ اور محققین تاریخ بالخصوص مس سٹارک نے اس کی جو تصویریں بنائی ہیں وہ علامہ جوینی کی بیان کردہ تشبیہ کی تصدیق کرتی ہیں پس اس قلعہ کا نام ''الاموت'' حسن بن صباح نے رکھا ہو یا پہلے سے یہ نام چل رہا ہو بہت ہی موزوں ہے اور اگر یہ نام حسن بن صباح نے رکھا ہے تو اسے زیادہ معنویت مل جاتی ہے کیونکہ حسن بن صباح کے خونخوار دستے فی الواقع عقاب تھے اور یہ قلعہ حقیقی معنوں میں عقابوں کا نشیمن تھا۔

الاموت کے بعد اب آیئے ساحر الاموت یعنی حسن بن صباح کی طرف۔ ''نزاریہ'' فرقہ کی تاریخ کے معاملہ میں سب سے زیادہ باخبر اور معتبر مصنف علامہ جوینی ہیں ان کے بیان کے مطابق حسن کا شجرہ اس طرح چلتا تھا حسن بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن محمد الصباح الحمیری۔ وہ یمن کے قبیلہ حمیر سے تعلق رکھتا تھا اس کا باپ یمن سے کوفہ آیا پھر کوفہ سے قم اور قم سے ''رے'' آ گیا اور یہیں رہائش پذیر ہو گیا حسن بن صباح یہیں ''رے'' میں پیدا ہوا اس طرح وہ عجم کی پیداوار ہے حسن کے آباواجداد اثنا عشری شیعہ تھے حسن نے اثنا عشری عقائد سے انحراف کر کے اسمٰعیلی مذہب اختیار کر لیا۔ 463 ہجری میں سلجوقی ترکوں نے فاطمی خلفاء کے زیر نگیں بہت سا علاقہ فتح کر کے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا اور فاطمین کا اقتدار مصر تک محدود ہو گیا تھا خلیفہ مستنصر کے انتقال کے بعد اسمٰعیلی خلافت بکھر گئی تھی۔ خلیفہ مستنصر کے بڑے بیٹے نزار اور دوسرے بیٹے مستعلی میں تخت نشینی پر اختلاف ونزاع برپا ہوا آخر جنگ ہوئی نزار گرفتار ہو گیا۔ بعد میں نزاریہ اور مستعلویہ دو الگ فرقے وجود میں آ گئے نزاریوں نے اپنا مذہب ایسے اصولوں پر ترتیب دینے کی کوشش کی جن میں مخالفین کے خفیہ قتل کا جواز نکلتا ہو۔ خفیہ قتل

کے لئے دھو کے اور فریب کی کاری گری بھی آتی تھی بہر حال یہ سوچ بھی رواج پاتی گئی اور اس پر عمل بھی ہونے لگا کیونکہ اس پر ثواب کی بشارتیں بھی سنائی جارہی تھیں اور اسے ''جہاد'' کا حصہ قرار دیا جارہا تھا حسن بن صباح نزاری عقائد رکھتا تھا وہ مصر گیا اور کافی عرصہ وہاں رہا مگر پھر اس نے عافیت اس میں سمجھی کہ واپس ایران آجائے اس وقت یہاں ملک شاہ سلجوقی کی حکومت تھی لیکن ملک کا نظم ونسق زیادہ تر اس کے لائق وزیر نظام الملک طوسی کے ہاتھ میں تھا۔ حسن بن صباح نے اپنی قابلیت اور طلاقت لسانی کے بل پر دربار میں اثر ورسوخ بڑھایا اس پر نظام الملک اس سے کھٹک گیا اس نے کئی دفعہ ایسے حالات پیدا کئے کہ حسن بن صباح کو گرفتار کرا لے مگر بعض اسمٰعیلی روساء کی مدد سے حسن محفوظ رہا پھر کسی نہ کسی طرح اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں سے حسن بن صباح قلعہ الاموت پر قابض ہو گیا یہ قلعہ اس کے لئے بڑی محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا۔ اور یہاں سے اس نے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اپنا جال دور دور تک پھیلا دیا۔

کہتے ہیں وہ ظاہری طور پر خود کو شریعت کا پابند رکھتا تھا اور اس نے خلاف شرع افعال پر سخت سزائیں مقرر کر رکھی تھیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلاف شرع اعمال کے ارتکاب پر اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو قتل کرا دیا بعض کا خیال ہے یہ دونوں بیٹے خفیہ مراسلت کے ذریعے نظام الملک طوسی کے بھرے میں آگئے تھے اور باپ کو ٹھکانے لگانے والے تھے کہ دور اندیش باپ کو بھنک پڑ گئی اور اُس نے شرعی فرائض کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر انہیں قتل کرا دیا اس طرح بہت زیادہ پابند شرع ہونے اور انتہائی عادل ہونے کا صداقت نامہ حاصل کر لیا کچھ بھی ہو حسن بن صباح کے نزدیک قتل کوئی بڑا گناہ نہیں تھا اور مخالف کا قتل تو نیکی کا کارنامہ تھا اس نے اپنی تنظیم میں قاتلوں کا ایک گروہ خاص طور پر شامل کر لیا تھا یہ لوگ آج کے خودکش بمباروں کے پیش رو تھے انہیں فدائی کہا جاتا تھا۔ ان فدائیوں کے خنجر ہر وقت حسن کے دشمنوں کو اس کی راہ سے ہٹانے کے لئے مستعد رہتے تھے کچھ فدائی قرامطہ کی باقیات میں سے تھے اور بہت سے نئے لوگوں کو ان قرامطہ ہی نے تربیت دی تھی۔ ان لوگوں نے وہ خونریزیاں کیں کہ پوری دنیا میں اسماعیلی بدنام ہو گئے حسن بن صباح نے بڑے تدبر سے اپنی قوت بڑھائی اور آہستہ آہستہ اردگرد کے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا بہت جلد سلطان ملک شاہ سلجوقی نے اس فتنہ کی ہولناکی محسوس کر لی اور اس کی سرکوبی کی تدبیریں سوچنے لگا سلطان کے حکم پر نظام الملک طوسی نے شاہی فوج کے کچھ دستے قلعہ

الاموت کو سر کرنے کے لئے بھیجے حسن بن صباح نے کچھ فدائی نظام الملک کو قتل کرنے پر مامور کر دیئے نظام الملک قتل ہو گیا اور شاہی فوج کے دستے ناکام لوٹ آئے ملک شاہ سلجوقی نے ایک لشکر جرار قلعہ الاموت پر قبضہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اس لشکر نے حسن بن صباح کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں امکان تھا کہ یہ لشکر بہت جلد تمام قلعے فتح کر لے گا لیکن ناگہانی طور پر ملک شاہ سلجوقی کا انتقال ہو گیا اس سے حسن بن صباح کے مقبول بارگاہ خداوندی ہونے کے خیال کو تقویت مل گئی اسے حسن بن صباح کی غیبی امداد سمجھا گیا شاہی لشکر میں بھی بد دلی پھیل گئی اور لشکر پراگندہ ہو گیا اس کا سارا ساز و سامان حسن بن صباح کے ہاتھ آ گیا ملک شاہ کی وفات کے بعد سلطان سنجر والی سلطنت ہوا۔ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے بعد حسن بن صباح کی طرف متوجہ ہوا۔ کافی عرصہ تک جنگ جاری رہی مگر سلطان کو کسی طرح کی کامیابی نہ ہوئی بلکہ فریقین میں صلح ہو گئی اور صلح بھی ایسی کہ جس سے سلطان کی کمزوری عیاں تھی کیونکہ سلطان نے بہت سے علاقہ کے محاصل میں حسن بن صباح کا حصہ مقرر کر دیا۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ سلطان کو ایک خاص واقعہ پیش آیا تھا جس سے سلطان دب کر صلح کرنے پر مجبور ہو گیا واقعہ یہ تھا کہ ایک روز جب سلطان اپنے خیمہ میں خواب راحت سے بیدار ہوا تو اُسے بستر کے قریب فرش میں ایک خنجر گڑا ہوا ملا اور اس کے بعد سلطان کو حسن بن صباح کی طرف سے یہ پیغام موصول ہوا کہ اگر میرے ساتھیون کو سلطان کی زندگی عزیز نہ ہوتی تو جس ہاتھ نے سخت زمین میں خنجر گاڑا اُن ہاتھوں کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ سلطان کے نرم و نازک سینے میں یہ خنجر اتار دیں سلطان اس واقعہ سے بدحواس ہو گیا اور اُس نے حسن سے صلح کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

کہا جاتا ہے کہ حسن نے اپنی زندگی کے 35 سال قلعہ الاموت میں گزارے مگر وہ اس محفوظ قلعہ میں بھی بہت محتاط رہا 35 سال کی طویل مدت میں وہ قلعہ سے باہر نہ نکلا بلکہ یہ روایت ہے کہ وہ اپنے مکان سے بھی صرف دو مرتبہ باہر آیا اور دو دفعہ ہی اپنے مکان کی چھت پر آیا باقی سارا وقت اس نے اپنی قیام گاہ میں گزارا ظاہراً یہ وقت وہ دینی مشاغل میں گزارتا تھا مگر اصل میں وہ یہیں بیٹھ کر اپنی وسیع سازشوں اور قتل و غارت گری کی تدبیروں کے تانے بانے پھیلاتا رہتا تھا۔

حسن بن صباح اور اس کے قلعہ الاموت کے متعلق مستشرقین نے اور بھی بہت سی حکایات پھیلا رکھی ہیں جو ان کے توسط سے مسلمان مولفین تاریخ نے بھی بیان کردی ہیں ان حکایات میں سب سے زیادہ مشہور حکایت وہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح نے قلعہ الاموت میں ایک نقلی بہشت بنا رکھی تھی جس میں ہر طرح کا سامان عیش فراہم ہوتا تھا جس کے وعدے مسلمانوں کو اگلے جہاں کے فردوس میں دیئے گئے ہیں خوبصورت لہلہاتے باغات، قسم قسم کے پھل، حوریں، غلمان، شراب اور دیگر سامان تعیش۔ کہتے ہیں جب کسی فدائی سے کوئی انتہائی خطرناک کام لینا ہوتا تھا تو اسے بھنگ سے مدہوش کر کے اس بہشت میں پہنچا دیا جاتا تھا جب وہ آنکھیں کھول کر دیکھتا تو خود کو فردوس بریں میں محسوس کرتا حوریں اور غلمان اس کی فرماں پذیری اور ناز برداری کو حاضر ہوتے اور پھر اُسے کہہ دیا جاتا کہ فلاں کام کرو گے تو یہ سب کچھ تمہیں ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے گا اس طرح وہ فدائی سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا یہ کہانی یونہی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ کسی معتبر مسلمان مورخ نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے۔

اصل میں حسن بن صباح اور اس کے جانشین بزرگ امید کے حسن تدبر اور اعلیٰ ترقیاتی منصوبوں سے رود بار مازندران کا وہ علاقہ جو زیادہ تر خشک پہاڑوں اور بنجر چٹانوں پر مشتمل تھا شاداب اور زرخیز قطعہ زمین بن گیا تھا نہروں، تالابوں اور آبپاشی کے دیگر ذرائع سے قسم قسم کے ثمر دار درخت اگائے گئے تھے اور طرح طرح کے اناج کی کاشت ممکن ہوگئی تھی گردونواح کے دیہاتی اور اجڈ گنوار لوگ جب دور بلند و بالا پہاڑیوں پر خوش نما باغات دیکھتے تو اُن کے متعلق من گھڑت کہانیاں بناتے مصنوعی بہشت کی بات ان ہی لوگوں کی گھڑی ہوئی کہانی تھی جسے خوب شہرت ملی۔ معروف یورو پین سیاح مارکو پولو نے اپنے سفر کے دوران ان ہی لوگوں سے یہ کہانی سنی اور اپنے سفرنامے کو دلچسپ بنانے کے لئے اسے بھی لکھ دیا مغربی مصنفین کو کہانی پسند آئی اور انہوں نے اسے حقیقت کا روپ دینا شروع کر دیا اس میں انکے اس تجسس کو بھی تسکین ملتی تھی کہ فدائی کس جذبہ کے تحت اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھے پھرتے تھے۔ تاہم جدید محقق اس کہانی کو قابل التفات نہیں سمجھتے۔ یہ ایک بڑی دل خراش حقیقت ہے کہ ان فدائیوں نے عرصہ دراز تک تاریخ کو اور بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ کو لالہ زار

رکھا۔ [19]

اکثر مورخین نے ان مشاہیر اسلام کی ایک طویل فہرست دی ہے جو نزاری فدائیوں کے خنجروں کا نشانہ بنے ان فہرستوں میں اُن قلیل التعداد خوش بخت لوگوں کے نام بھی شامل ہیں جن کے قتل کا اقدام ہوا مگر وہ کسی وجہ سے بچ گئے خود تاریخ ''جہاں کشا'' کا مصنف بھی ان لوگوں میں موجود ملتا ہے جن کی خوش نصیبی نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی جان بچ گئی ان واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ایسے اقدامات مذہبی یا سیاسی مقاصد کے لئے کئے جاتے اور بہت سوچ سمجھ کر کسی شخص کے قتل کی منصوبہ بندی کی جاتی مثال کے طور پر علامہ فخرالدین رازی جو حسن بن محمد بزرگ امید کے دور میں اپنے شہر ''رے'' میں درس دیا کرتے تھے وہ اپنے درس قرآن وحدیث اور دیگر علوم کی تدریس میں اسمٰعیلیہ اور خاص طور پر نزاریہ کے عقائد کو زیر بحث لاکر ان کے عقائد کی تردید کرتے ان کا ایک شاگرد کئی ماہ سے بڑی عقیدت اور ذوق وشوق سے حاضر رہتا۔ علامہ رازی اس کی عقیدت اور ذوق وشوق کو دیکھ کر اس سے محبت کرتے تھے اور اپنے ارشد تلامذہ میں شمار کرتے تھے ایک روز علامہ رازی اپنی قیام گاہ میں تنہا تھے وہی شاگرد موقع مناسب جان کر آ گیا اور اپنی جیب سے خنجر نکال کر ان کے سینے پر سوار ہو گیا علامہ رازی نے پوچھا ''میرا کون سا جرم ہے کہ تم میرے قتل کے درپے ہو میں تمہیں شاگرد رشید سمجھ کر ہمیشہ محبت آمیز سلوک کرتا رہا'' اس نے کہا ''تم ہمارے امام اور ہمارے مذہب کو اپنے درس میں ہدف تنقید وتنقیص بناتے ہو، چونکہ تم ایک عالم اور مقتدر شخص سمجھے جاتے ہو اس لئے لوگ تم سے اثر پذیر ہوتے ہیں'' علامہ رازی نے اس کی منت سماجت کی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اس فرقہ کے خلاف زبان نہیں کھولیں گے لیکن شاگرد نے کہا ''میں اُس وقت تمہارے وعدوں اور قول وقرار پر اعتبار کروں گا جب تم حکومت الاموت کا وظیفہ خوار بننا قبول کرو گے اس طرح نمک حلالی کرنا تم اپنا فرض خیال کرو گے'' علامہ رازی نے یہ بات منظور کر کے اپنی جان بچائی اور پھر اپنا قول نبھاتے رہے اب اگر کوئی شخص ان سے نزاریہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ طرح دے جاتے اور اگر کوئی اصرار کرتا تو صاف کہہ دیتے ان لوگوں کے پاس وزنی دلائل اور قاطع براہین ہیں اس لئے میں انہیں ہدف تنقید نہیں بنا سکتا۔

---

[19] تاریخ جہاں کشا از علامہ جوینی ذکر حسن بن صباح

حسن بن صباح سے لے کر رکن الدین خورشاہ تک پورے ڈیڑھ سو سال الاموت اور اردگرد کے دیگر قلعوں پر نزاریوں کی حکومت رہی اس دوران بے شمار لوگ قتل ہوئے جن میں فاطمی خلفاء، عباسی خلفاء، علماء اور امراء غرض ہر طبقہ کے لوگ نزاریوں کے خنجروں کا نشانہ بنے ابتداء میں ان کی قاتلانہ سرگرمیاں مذہبی محرکات کے تابع تھیں لیکن بعد میں نزاری فدائیوں نے قتل کو اپنا پیشہ بنالیا اور کوئی بھی انہیں مطلوبہ رقم دے کر ان کے خنجر خرید سکتا تھا۔ اس طرح اپنے مخالفین کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے بہت سے امراء و حکام فدائیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے رہے ایک عرصہ تک نزاری قاتلوں کا خوف بہت سے لوگوں پر لرزہ طاری کرتا رہا کہتے ہیں عباسی خلفاء نے ان کے خوف سے گھروں سے نکلنا موقوف کر دیا تھا آخر میں ہلاکو خان نے آ کر نزاریوں کی حکومت ختم کر دی اور ان کے قلعے تباہ برباد ہو گئے 1930ء میں یوروپین خاتون مس فریا سٹارک نے جا کر دیکھا تو ان قلعوں میں خاک اڑ رہی تھی۔

نزاریوں کے فدائی تاریخ میں حشاشین یا حشیشین کہلاتے ہیں حشیش بھنگ کو کہتے ہیں بھنگ سے پیدا ہونے والا نشہ ایک تو ذہن کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیتا ہے دوسرا اس حالت میں جس کام کی سرانجام دہی کا خیال جب ذہن میں بیٹھ جاتا ہے تو طبیعت میں اس کے کر گزرنے کا جوش وجذبہ پیدا ہوتا ہے اور وقتی طور پر بے خوفی اور شجاعت آ جاتی ہے۔ معتبر روایات کے مطابق نزاری فدائی جب کسی کے قتل کی پوری منصوبہ بندی کر لیتے تو بھنگ سے اپنے اندر جوش وتحرک پیدا کرتے اور اس کا نشہ انہیں انجام کے خوف سے بے نیاز کر دیتا تھا قتل کی منصوبہ بندی میں بڑی ہوش مندی سے فریب اور دھوکہ کا جال بنتے تھے پھر حشیش کے سہارے اپنے اندر خطروں سے ٹکرا جانے کا جوش پیدا کرتے اور وہ کچھ کر ڈالتے جسے کرنے پر وہ مامور ہوئے تھے۔ یہی حشاشین یا حشیشین کے الفاظ ہیں جنہوں نے انگریزی لغت میں ایک لفظ داخل کیا Assassinate جس کے معنی ہیں دھوکے اور فریب سے قتل کر دینا۔ کوئی جھوٹا بہانہ بنا کر یا کسی باریک چال سے کسی کو موت سے دوچار کر دینا۔

اب ذرا اس پس منظر پر نظر ڈالئے جس میں علامہ اقبال نے اپنی طویل نظم ''خضر راہ'' کا ایک بند ''سرمایہ ومحنت'' لکھا اور جس کا ایک شعر ہم نے موضوع بحث کے طور پر لیا ہے، کارل مارکس (Karl Marx) کو علامہ اقبال نے ''کلیم بے تجلی'' اور ''مسیح بے صلیب'' کہا اور پھر یہاں تک کہہ دیا

کہ ''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'' اُسی کارل مارکس نے دنیا میں پہلی دفعہ سائنٹفک انداز میں سرمایہ ومحنت کا بھرپور مطالعہ اپنی شہرہ آفاق کتاب Das capital میں پیش کیا تھا اور ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا وہ مزدور جسے ''کاما'' اور ''کمین'' کہہ کر تاریخ ٹھکراتی چلی آ رہی تھی مارکس نے اُس کے سر پر عظمت کا تاج رکھ دیا تھا اور سوشلزم، کمیونزم کے معاشی نظریات متعارف کرائے تھے دنیا میں ہر جگہ مزدوروں نے اس کی صدائے انقلاب کو گوش ہوش سے سنا تھا اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے تھے برصغیر میں ان نئے نظریات سے متاثر ہونے والوں میں اقبال بھی شامل تھے مارکس اور اس کے ساتھ اینگلز (اینجلز) نے تاریخ کی مادی تعبیر کا فلسفہ بڑی جانداری سے پیش کیا تھا مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مزدور کو اپنی قوت اور صحیح قدر و قیمت سے بے بہرہ رکھنے اور اسے حصول حقوق کی جدوجہد سے باز رکھنے میں بہت بڑا کردار مذہب کا ہے جس نے اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کے بعد ہر آدمی کی تقدیر لکھ دی ہے اس کا رزق بھی لکھ دیا ہے اور وہی جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت کی ٹھوکروں سے دوچار کر دیتا ہے اُسی نے کچھ آدمیوں کو امیر بنا دیا اور باقی لوگوں کو غریب کر دیا اس طرح مذہب نے ہی عوام کو اپنی غربت پر یہ بشارتیں سنا سنا کر مدہوش کر رکھا ہے کہ ''مژدہ ہے ان کے لئے جو غریب ہیں کہ آسمانی بادشاہت ان ہی کے لئے ہے۔'' اس لئے مارکس نے کہا تھا۔

Religious Distress is at the same time the expression of real distress and protest against real distress. Religion is sigh of opressed creature, the heart of heartless world, just as it is the spirit of spiritless situation. It is the opium of the masses.

(ترجمہ: مذہبی کرب بیک وقت حقیقی کرب کا اظہار بھی ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی، مذہب کچلی ہوئی مخلوق کی سسکی ہے گویا یہ بے قلب کائنات کا قلب ہے بالکل اسی طرح یہ بے روح حالات کی روح ہے۔ یہ عوام کے لئے افیون ہے) [20]

---

[20] On Religion by Marx 2 F.Engles P. 38

مارکس نے مذہب کو افیون کے کہا۔ مارکس کے اسی جملہ کو سامراجیوں اور ان کے حاشیہ بردار علم برداران مذہب نے خوب خوب اچھالا مگر ہم سردست اس پر بات نہیں کریں گے ہم صرف مذہب اور افیون کی مماثلت پر بات کریں گے۔ افیون ایک ایسا نشہ ہے جو جب تک قائم رہتا ہے ذہن کو دنیا سے بے تعلق کر دیتا ہے جسم کے دکھوں اور روح کے زخموں سے بے نیاز کر دیتا ہے آدمی سکون محسوس کرنے لگتا ہے اور آدمی اپنی حالت پر خود کو مگن کر لیتا ہے مارکس نے مذہب کو بھی اسی رنگ میں دیکھا ہے اور اپنی جگہ پر اس کی تشبیہ بڑی جامع اور کامل واکمل ہے اقبال نے مارکس کی اس بات کو بھی لیا ہے اور مذہبی گروؤں کے ساتھ سامراجی گرگوں کی حیلہ بازیوں اور ساحرانہ چالوں کو بھی مدنظر رکھا ہے اسے ان تمام چیزوں کے لئے ایک اور نشہ کے ساتھ تشبیہ سوجھی ہے اور وہ ہے بھنگ یعنی حشیش۔ اس تشبیہ میں حسن بن صباح کے تاریخی کردار اور اس کے ساحرانہ فریب کاریوں کی خوں آلود تاریخ نے اسے بڑا سہارا دیا ہے اقبال کے ذہن میں سامراج کے وہ تمام پینترے سلگ رہے تھے جن سے وہ غریب عوام کو باہم لڑا لڑا کر ختم کرتا ہے اس طرح اس کی خونخواری کے مقاصد بھی پورے ہو جاتے ہیں اس کی زر پرستانہ ہوس کی بھی تسکین ہو جاتی ہے وہ انہیں مدہوش رکھ کر لوٹتا اور اپنی جائیدادوں کی فہرستیں وسیع کرتا رہتا ہے۔ کہیں وہ مزدوروں اور غریب عوام کو نسل پرستی پر لگا کر لڑاتا کہیں مذہب اور قومیت کی پینک لگاتا ہے اور انہیں اکساتا ہے کہ وہ اپنا دین، اپنا وطن اور اپنی قوم کی سلطانی بچائیں کہیں اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے ابھارتا ہے کہیں گورے کالے کی تفریق پیدا کر کے عوام کو اپنا لہو بہانے اور دوسروں کو لہو میں تڑپانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس وسیع تناظر کو سامنے رکھئے اور پھر ساحرالاموت اور حشیش کی تمثیل کی بھرپور معنویت دیکھئے تو آپ کو اقبال کو وہ خون آشفتہ دماغ تڑپتا دکھائی دے گا جس نے پہلی جنگ عظیم پر چیخ کر کہا تھا۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

اب ذرا اقبال کا پورا بند پڑھیئے۔

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ بنات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہم جب یہ پورا بند پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے اقبال مارکس کے الفاظ کو خوبصورت اردو شاعری میں ڈھالتا چلا جاتا ہے آخری شعر میں اُس دور کی پوری ترجمانی ہوگئی ہے دنیا میں پہلی دفعہ انسان کے معاشی مسائل پر کسی شخص نے سائنسی انداز مین سوچا تھا اور مزدور کے دست دولت آفریں'' کے بوسے لئے تھے مزدور کی اہمیت اجاگر کی تھی مزدور کو پہلی دفعہ بتایا گیا تھا وہ محض صنعت کار کی مشین کا ایک پرزہ نہیں بلکہ صنعت کا بادشاہ ہے اگر وہ نہ ہو تو خام مال کسی طرح بیش قیمت مصنوعات میں نہیں ڈھل سکتا۔ صنعتی مزدور کے ساتھ کھیت مزدور اور کسان بھی اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہوا مارکس کی بات وقت کی آواز تھی دنیا کے ہر کونے میں قلم کے مزدور یعنی دانش ور بھی اس آواز سے ہم آہنگ ہو کر میدان عمل میں آگئے ہتھوڑا، درانتی اور قلم متحد ہوگئے اور بزم جہاں کے انداز بدل گئے مشرق ومغرب میں مزدور کے دور کا آغاز ہو گیا۔

محمد علی باب

''محمد علی باب'' کے عنوان سے اقبال نے اپنی کتاب ''ضرب کلیم'' میں تین شعروں کی ایک نظم

لکھی ہے۔

تھی خوب حضور علماء باب کی تقریر
بیچارہ غلط پڑھتا ، تھا اعراب سموٰت
اس کی غلطی پر علماء تھے متبسم
بولا تمھیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم نے ''اقبال دشمنی'' کے نام سے غالباً تین جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں ایک مصنف محمد امین زبیری کی کتاب ''خدوخال اقبال'' ص 17 کے حوالہ سے لکھا ہے کہ محمد امین زبیری نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ اشعار محمد علی جناح پر طنز کرتے ہوئے تحریر کئے ہیں اگر واقعی یہ کچھ محمد امین زبیری نے لکھا ہے تو بہت غلط لکھا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت عرصہ تک اقبال اور جناح میں سیاسی مخالفت رہی وہ محمد علی جناح کی مخالفت میں اخباری بیانات دیتے رہے جناح پر ایک طنزیہ قطعہ بھی لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اترے ''مسیح'' بن کے محمد علی جناح

مگر ہم نے ابتداء میں جو تین اشعار لکھے ہیں یہ محمد علی جناح کے متعلق نہیں سید محمد علی محمد باب کے متعلق ہیں اقبال کے مشہور شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس نظم کی شرح میں لکھا ہے۔

''علی محمد باب نے 1844ء میں طہران میں مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا علماء سے مناظرہ کے دوران قرآن کی آیت پڑھتے ہوئے سموٰت'' کے اعراب غلط پڑھے اس کی جہالت پر علماء مسکرائے خفت مٹانے کے لئے اس نے کہا میری امامت کے طفیل قرآنی آیات جو اعراب میں محبوس تھیں آزاد کر دی گئیں''[21]

یہ محمد علی محمد باب کون تھا اور اقبال کے بیان کردہ الزام میں کہاں تک صداقت ہے؟ اس کی

وضاحت کے لئے ہم ذرا تفصیل میں جائیں گے سید محمد علی کا والد سید رضا شیرازی ایک خوشحال تاجر تھا جو باب کی صغر سنی میں فوت ہو گیا تھا والد کی وفات کے بعد یہ بچہ ماموں کی زیر کفالت آ گیا۔

شیعہ فرقہ کی ایک مشہور شاخ فرقہ اسمٰعیلیہ ہے ان ہی اسمٰعیلیوں کی ایک شاخ ''شیخیہ'' کہلاتی تھی عام شیعہ حضرات کے نزدیک یہ فرقہ بہت غلو کرنے والا تھا شیخیہ فرقہ کو شیخ زین الدین احسائی نے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں قائم کیا تھا بعض کے نزدیک شیخ زین الدین احسائی کا فرقہ شیخیہ اسمعیلیوں کی شاخ نہیں اثنا عشری شیعوں کی ہی شاخ تھا [22]

بہر حال شیخ احسائی کے انتقال کے بعد اس فرقہ کے پیشوا سید کاظم رشتی ہو گئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ عام اثنا عشری شیعہ اور فرقہ شیخیہ میں فرق یہ تھا کہ اثنا عشریہ کے نزدیک امام زمان منتظر ہیں یعنی ان کی آمد کا انتظار ہے اور انہیں ابھی آنا ہے جب کہ شیخیہ کے نزدیک امام مہدی یا قائم آل محمد کا زمانہ انتظار ختم ہو چکا اور وہ آ چکے ہیں اب انہیں تلاش کرنا چاہئے۔ سید کاظم رشتی کے انتقال کے بعد ان کا مقرر کردہ کوئی جانشین نہیں تھا اس لئے یہ فرقہ منتشر ہو گیا۔ لیکن ایک دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ شیخیہ بھی امام منتظر کے انتظار میں تھے اور کہتے تھے کہ امام زمان جو مستور یا غائب ہوتا ہے اس کے اور امت کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے زمانہ انتظار میں امام زمان کے احکام اسی واسطہ کے ذریعے امت تک پہنچتے ہیں اس درمیانی واسطہ کا نام ''باب'' رکھا گیا تھا۔ شیخیہ کے خیال میں شیخ احمد اور شیخ کاظم رشتی دونوں ''باب'' تھے سید کاظم رشتی کے بعد شیخی فرقہ کے کچھ لوگوں نے سید علی محمد کو باب تسلیم کر لیا اور کچھ لوگوں نے حاجی کریم خان کرامنی کو باب مان لیا سید علی کو باب تسلیم کرنے والوں کو ہی فرقہ بابیہ کہا جانے لگا۔

سید محمد علی محمد باب کے پیروکاروں میں زیادہ مشہور ملا حسین بشروئی، قرۃ العین اور محمد علی برفروش ہیں بابی جماعت محمد علی برفروش کو جناب قدوس کہتی تھی کہتے ہیں یہ شخص ان تمام بدعات اور خلاف شرع رسموں کا موجد تھا جو فرقہ بابیہ میں راہ پا گئی تھیں سید علی محمد نے باب ہونے کا دعویٰ 1844ء میں کیا تھا ڈاکٹر جے۔ ای ایسلمنٹ کی تحقیق کے مطابق فرقہ شیخیہ کے ایک مشہور عالم ملا حسین بشروئی کے سامنے

---

[21] شرح ''ضرب کلیم'' از یوسف سلیم چشتی ص 133 [22] محمد یوسف بجنوری کی وضاحت مطبوعہ ماہنامہ ''نیاز مانہ'' لاہور۔ ماہ اپریل 2008ء ص 4

23 مئی 1844ء کوغروب آفتاب کے دو گھنٹہ گیارہ منٹ بعد سید علی محمد نے یہ اعلان کیا کہ وہ ''باب'' ہیں تھوڑی سی فکر مندانہ تحقیق وجستجو کے بعد ملا حسین بشروئی کو کامل یقین ہو گیا کہ وہ موعود جس کا فرقہ شیخیہ کو انتظار تھا ظاہر ہو گیا ہے چنانچہ ملا حسین بشروئی نے اپنے بہت سے دوستوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ ابتدائی طور پر سید علی محمد باب کے 18 شاگرد تھے حروف ابجد کے حساب ''ح'' کے آٹھ اور ''ی'' کے دس عدد ہوتے ہیں اس طرح ''ح'' اور ''ی'' کو ملائیں تو لفظ ''حی'' بنتا ہے اس لئے 18 کی اس جماعت کو ''حی'' کہا گیا۔

اس گروہ کے افراد تبلیغ کے لئے اور ''باب'' کی آمد کی خبر پھیلانے کے لئے ایران اور ترکستان کے مختلف علاقوں میں بھیج دیئے گئے سید باب حج کے موقع پر خود مکہ معظمہ آ گیا مسلمانوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ مہدی موعود مکہ میں حج کے موقع پر اپنی مہدویت کا اعلان کریں گے یہی کام سید علی محمد نے دسمبر 1844ء میں حج کے موقع پر کیا اور اعلان کیا کہ جس مہدی کا مسلمانوں کو انتظار تھا وہ میری شکل میں آ گیا ہے وہاں علی محمد باب نے بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی وہاں سے واپس آ کر بوشہر میں تبلیغ شروع کر دی کچھ لوگوں نے دعویٰ تسلیم کر لیا مگر زیادہ تر لوگ مخالف ہو گئے پھر باب نے ''نقطہ اولیٰ'' کا لقب اختیار کیا تو مخالفت میں اور بھی شدت آ گئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جے ای ایسلمنٹ لکھتے ہیں۔

''آپ کے اعلان مہدویت نے شہر میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا کر دیا آپ کے کلام کی زبردست فصاحت و بلاغت اور آپ پر تیزی سے آیات الٰہی کا نزول معجزہ تھا اس کے ساتھ آپ کے کلام کی تاثیر آپ کے غیر معمولی علم و حکمت اور نیز ایک مصلح اعظم کی حیثیت سے آپ کا زبردست استقلال و جرات یہ سب ایسی چیزیں تھیں کہ جنہوں نے آپ کے معتقدوں میں تو ایک زبردست جوش وخروش پیدا کر دیا۔ لیکن قدامت پرست مسلمانوں میں آپ کی مخالفت اور دشمنی کے جذبات بھی بھڑک اٹھے'' [23]

لیکن اس مخالفت کے باوجود بابیت زور پکڑتی گئی۔ ڈاکٹر ایسلمنٹ کے مطابق جنوبی ایران کے حاکم حسین خان نے بابیت کا قلع قمع کرنے کے لئے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس مسلک کے

---

[23] بہاء اللہ اور عصر جدید ص 30

پیروکاروں کو تاخت وتاراج کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی طہران، فارس، مازندان اور دوسرے مقامات پر بہت سے بابی بڑی بے رحمی سے قتل کردیئے گئے کتنے ہی تہ تیغ ہوئے، کتنے دار پر لٹکائے گئے، کتنوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کردیئے گئے، کئی ایک کو زندہ جلادیا گیا مگر یہ مظالم جتنے بڑھتے گئے، بابیت اتنا زور پکڑتی گئی۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے پروفیسر براؤن لکھتے ہیں۔

''امام مہدی کے متعلق شیعوں میں پیش گوئیاں مشہور تھیں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ پوری ہورہی ہیں اوراسی کو باب کی حقانیت کی دلیل سمجھا جانے لگا تھا۔ مثال کے طور پر حضرت جابر کی روایت جوشیعوں میں بہت معتبر سمجھی جاتی ہے اس کے مطابق امام مہدی میں موسیٰؑ کا کمال وجلال عیسیٰؑ کا حلم وجمال اور ایوب کا صبر بے مثال ہوگا۔ اس کے رفقاء اس کے زمانے میں ہی تذلیل کا شکار ہونگے' ان کے کٹے ہوئے سر اُسی طرح تحائف کے طور پر بھیجے جائیں گے جیسے ''ترک'' اور ''ویلم'' کے سر بھیجے جاتے ہیں وہ قتل کئے جائیں گے، وہ خوفزدہ اور بے سکون کئے جائیں گے اور دربدر کئے جائیں گے، زمین ان کے خون سے رنگی جائے گی، ان کی خواتین نالہ وشیون کی چیخیں بلند کرتی رہیں گی یہ بلاشبہ میرے (یعنی حضرت محمد صلعم کے) اولیاء ہونگے'' [24]

خود علی محمد باب کا کیا حشر ہوا اس کی تفصیل ڈاکٹر ایسلمنٹ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے

''جولائی 1850ء بروز جمعہ سید علی محمد باب کو 31 سال کی عمر میں ''تبریز'' کی قدیم فوجی چھاؤنی کے چوک میں دار پر لٹکایا گیا باب کا ایک معتقد خاص آقا محمد علی بھی ان کے ساتھ ہی نذر دار ہوا کیونکہ اس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی تھی کہ اُسے اپنے پیشوا کے ساتھ موت دی جائے'' سزائے موت کا منظر بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے ''دوپہر سے دو گھنٹے پہلے دونوں کی بغلوں میں رسیاں ڈال کر اس طرح لٹکایا گیا کہ محمد علی کا سر اپنے محبوب آقا کے سینے پر تھا سپاہیوں کی ایک رجمنٹ صف بستہ ہوئی اور انہیں گولی چلانے کا حکم ہوا بندوقیں دندنائیں مگر جب دھواں دور ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت باب اوران کا عقیدت مند زندہ ہیں گولیوں کی بوچھاڑ نے فقط اتنا کیا تھا کہ اُن رسیوں کو کاٹ دیا تھا جن سے یہ حضرت لٹکے ہوئے تھے اور دونوں بغیر کسی ضرب کے نیچے گر گئے تھے اور اٹھ کر قریب

---

[24] ترجمہ تاریخ جدید از پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن ص 132

کے کمرہ میں تشریف لے گئے تھے دوپہر کے قریب دونوں کو پھر سولی پر لٹکایا گیا۔ ''ارمنی'' سپاہیوں نے جو اپنی باڑھ کی ناکامی کو حضرت باب کا معجزہ سمجھنے لگے تھے دوبارہ گولی چلانے سے انکار کر دیا اس لئے سپاہیوں کی ایک اور رجمنٹ بلائی گئی جس نے حکم پاکر گولی چلائی اس دفعہ دونوں کے جسم چھلنی ہو گئے مگر دونوں کے چہروں کو کوئی گولی چھو کر بھی نہ گئی'' [25]

پھر دونوں لاشوں کو شہر کے باہر خندق میں پھینک دیا گیا دوسری رات کچھ بابی علی محمد باب کی لاش اٹھا لائے اور روایات کے مطابق سالہا سال اسے ایران میں پوشیدہ مقامات پر رکھا آخر کار زبردست خطرات اور تکلیف جھیل کر یہ لاش کوہ کرمل پر لا کر دفنائی گئی وہاں بڑا خوش منظر روضہ ہے جو ارض مقدس میں ایلیا نبی کی غار کے پاس ہے۔

سید محمد علی محمد باب کو اور اس کی تحریک کے لوگوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا مگر تحریک ختم نہ ہوئی عام روایت یہ ہے کہ سید علی محمد نے خود کو ''باب'' کہا تھا اور آنے والے ''من یظہرہ اللہ'' کی بشارت دی تھی وہ گویا وہی ''دروازہ'' تھے جو آنے والے امام کے لئے نمودار ہوا تھا اس کے بعد بہاء اللہ نے آکر اعلان کیا کہ علی محمد باب نے میری ہی آمد کی بشارت دی تھی اور اسی بہاء اللہ سے بہائی مذہب شروع ہوا جو آج تک ایک تحریک کی طرح سرگرم عمل ہے مگر بعض لوگ کہتے ہیں ''باب کے یہ معنی نہیں کہ سید علی محمد باب ''قائم'' کے لئے دروازہ ہیں بلکہ یہ ان کا آسمانی لقب تھا یعنی باب اللہ، معرفت الٰہی کا دروازہ، یہ ان کے خدائی نمائندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے پہلے مومن ملا حسین بشروئی سے فرمایا'' آپ پہلے آدمی ہیں جو مجھ پر ایمان لائے ہیں۔ میں باب اللہ ہوں اور آپ اس باب کے باب'' ایک اور جگہ کتاب ''قیوم الاسماء'' میں لکھتے ہیں ''اے لوگو میں باب تمہارا امام ہوں جس کا انتظام کیا جاتا تھا'' آپ کی کتب الٰہی میں متعدد دوسرے القابات بھی مرقوم ہیں جیسے ذکر اللہ حضرت اعلیٰ عبدہ الذکر وغیرہ'' [26]

خیر یہ تو تھا اس سوال کا جواب کہ سید محمد علی محمد باب کون تھا اب آیئے اقبال کی اس بات کی طرف کی ''بے چارہ غلط پڑھتا اعراب سموت'' سید باب بڑا عالم فاضل شخص تھا اُسے عربی پر پورا عبور

[25] بہاء اللہ و عصر جدید ص 32,33 [26] مکتوب محمد یوسف بجنوری ''نیاز زمانہ'' لاہور ماہ اپریل 2008 ص 4

حاصل تھااوراس زبان میں اظہار وابلاغ پر ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی لوگوں نے اس کی فصاحت وبلاغت کو ہی اس کا معجزہ قرار دیا تھاڈاکٹر ایسلمنٹ لکھتے ہیں۔

''حضرت باب کا کلام کئی ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے آپ کا بسرعت تمام فی البدیہہ اور بغیر مطالعہ کے مفصل تفسیرات، دقیق بیانات اور فصیح وبلیغ مناجات لکھ دینا ہی آپ کے دعویٰ کی ایک زبردست دلیل سمجھا جاتا تھا'' (27)

ڈاکٹر ایسلمنٹ نے ایک اور بات بھی لکھی ہے جس سے اس روایت کوتقویت ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ خود ہی امام اور سب کچھ تھے ڈاکٹر مذکور لکھتے ہیں۔

''حضرت باب کو یوحنا بپتسمہ دینے والے سے تشبیہ دی گئی ہے مگر ان کا مقام صرف مبشر کا ہی نہیں وہ بذات خود ایک مظہر الٰہی بھی تھے اور انہوں نے ایک مستقل شریعت کی بنیاد رکھی اگر چہ اس کا دور چند سال ہی رہا'' (28)

ایسے شخص کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سموت کے اعراب غلط پڑھتا تھا سراسر زیادتی ہے ہمارا باب کے دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی بہائیت سے کچھ واسطہ ہے ان کے متعلق حضرت علامہ اقبال کے نظریات سے ہم بھی متفق ہیں مگر مخالفت میں اس حد تک چلے جانا کہ اُسے اجبل الجہلا بنا کر پیش کیا جائے ہمارے نزدیک انصاف اور دیانت سے بعید ہے۔اصل میں علامہ اقبال کو یہ غلط فہمی باب کے ہم عصر مورخین کے تعصب آمیز پروپیگنڈے کی وجہ سے لاحق ہوئی یہ تو وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے ''کتاب الطّواسین'' لکھنے والے منصور حلاج کو بھی عربی زبان سے نابلد لکھ دیا ہے انہیں معلوم نہ تھا کہ بعد میں ''کتاب الطّواسین'' چھپ کر منظر عام پر آجائے گی اور لوگ ان مورخین کی باتوں پر خندہ زن ہوں گے اصل میں ابن الخذاری اور نوبری جسے مورخین کا قصور بھی بہت کم ہے بابیت کے معتقدین نے بھی یہ دیکھ کر کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور فصیح وبلیغ قرآن کو ان کو معجزہ تسلیم کیا گیا ہے یہ کہنا ضرور سمجھا کہ سید باب بھی امی تھے اور ان کا کلام معجزہ ہے اس سے مورخین عصر نے یہ قیاس کر لیا کہ چلو فارسی تو باب کی اپنی زبان تھی جب وہ امی تھا تو عربی زبان مین اسے معمولی شدبد بھی نہیں ہوگی اس لئے

---

(27) بہاءاللہ وعصر جدید ص 34 (28) ایضاً ص 35

انہوں نے اپنی طرف سے ایسی باتیں گھڑ لی ہیں اور علامہ اقبال بھی شاید ان ہی روایات پر اعتبار کر بیٹھے اور علی محمد باب پر عامیانہ سی طنز روا سمجھی۔

جہاں تک ''السمٰوٰت'' کے اعراب کا تعلق ہے مناظرہ بازوں کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ فرد مخالف کی زبان سے پھسل جانے والے کسی لفظ کو پکڑ کر تابڑ توڑ حملے کرنے لگتے ہیں اسی پر اپنی جیت کی تالیاں بجانے لگتے ہیں اور فریق مخالف کو خود ہی شکست خوردہ قرار دے کر اکھاڑے کو چھوڑ دیتے ہیں کہتے ہیں علماء کا جتھہ تھا جس کے سامنے باب کو پیش کیا گیا وہ قیدی تھا اور اس جم غفیر کے مخاصمانہ سوالات میں گھر گیا تھا اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا بھی ہو تو قیدی بے ہنگم ہجوم اور اُس کے شور و غوغا سے گھبرا جاتا ہے اور اس سے لفظ کی ادائیگی میں زبان کی لغزش (Slip of Tongue) ممکن ہے مگر یہ جہالت پر دلیل نہیں ہوتی۔ بابیوں میں سے جن لوگوں نے یہ واقعہ تسلیم کیا ہے وہ کہتے ہیں جب سید باب سے اس کے مقام کے متعلق سوال کیا گیا اس نے دعویٰ مہدویت کا موثر انداز میں اعادہ کیا اور بڑی قابلیت سے اپنا دفاع کیا ایک عالم نے کہا تم پر جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں سے کچھ سناؤ باب نے بات اس طرح شروع کی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیْمِ O اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتَ وَالْاَرْضَ یہاں اُس نے سَمٰوٰتَ یعنی ''تا'' کو مفتوح (زبر کے ساتھ) پڑھا جب کہ قرآن حکیم میں خَلَقَ السَّمٰوٰتِ یعنی تا کو مکسور (زیر کے ساتھ) لکھا ہوا ہے علماء نے شور مچا دیا ''یہ کیسا مہدی ہے یہ کیسا مہدی ہے یہ تو قرآن کو بھی غلط پڑھتا ہے اور اسے عربی گرامر سے بھی واقفیت نہیں باب نے کہا اللہ کا کلام گرامر کے قواعد کا پابند نہیں ہوتا قرآن حکیم میں بھی کہیں کہیں ایسی صورت سامنے آجاتی ہے مگر باب کی پوری بات نہیں سنی گئی اور شور مچا دیا گیا۔ حالانکہ باب کی یہ بات بڑی معقول تھی مگر اُسے وضاحت نہیں کرنے دی گئی ہماری اپنی کتابوں میں بھی اس قسم کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہم صرف ایک روایت بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

ابو معاویہ بواسطہ ہشام بن عروہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عروہؓ نے کہا میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آیات کریمہ اِنْ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (20/62) اَلْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ (4/162) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی

وَالصَّابِئُون (5/69) کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا بھانجے یہ لکھنے والوں کا کام ہے انہوں نے لکھنے میں غلطی کر دی'' 29

علامہ جلال الدین سیوطی نے یہی روایت نقل کر کے لکھا ہے

''اس روایت کی اسناد بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہیں'' 30

یعنی سند کے اعتبار سے یہ اتنی صحیح اور محکم روایت ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے جو شرائط عائد کی ہیں یہ روایت ان پر پوری اترتی ہے۔

ہم روایت کی ذرا وضاحت کر دیں، حضرت عروہؓ نے مروجد گرامر کے رو سے اپنے خلجان کا اظہار کیا پہلی آیت میں ان یعنی اِنّ کا عمل هٰذِان پر ہونا چاہئے ہم گرامر کی رو سے اِن هٰذان نہیں کہہ سکتے اِنّ هٰذين کہیں گے، دوسری آیت میں المقيمين الصلوٰة کا عطف اَلْمؤُ فون پر ہے گرامر کی رو سے مُقِيمُون ہونا چاہئے تیسری آیت میں بھی یہی سوال اُٹھتا ہے کہ اَن کا عمل صَابِئوُن پر ہونا چاہئے تھا یعنی ''صَا بِئِين'' آنا چاہئے تھا یہاں گرامر کے اس قاعدہ کا خیال کیوں نہیں رکھا گیا جبکہ یہی آیت مبارکہ سورہ بقرہ پارہ اول میں آئی ہے تو وہاں گرامر کے قاعدہ پر عمل ہوا ہے اور وہاں صَابِئِين لکھا ہوا ہے اگر باب کے سلسلہ میں بیان کردہ واقعہ صحیح ہے تو باب ان ہی باتوں کی وضاحت کرنے والا تھا جسے علماء نے شور و غوغا اور ٹھٹھے میں اڑا دیا۔ رہی قرأت کی بات تو بڑی مشہور روایت ہے کہ قرآن حکیم سات حرفوں یعنی سات قرأتوں پر نازل ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس جس طرح آسانی ہو پڑھ لیا کرو 31

ہمیں ان روایات سے کوئی مطلب نہیں ہم تو صرف علامہ اقبال کو اور ان کے شارحین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ''ایں گناہیت کہ در شہر شما نیز کنند'' (یہ اگر گناہ ہے تو تمہارے شہر میں بھی کیا جاتا ہے)۔ علامہ اقبال کو بجا طور پر باب کے عقائد اور دعاوی سے اختلاف تھا مگر انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس طرح کی کمزور یا من گھڑت بات کو بنیاد بنا کر کسی فاضل شخص کی تضحیک کرتے یہ بات خود اُن کے علو شان کے

---

29 فضائل القرآن لابی عبید، کتاب المصاحف لابن ابی داؤد 30 الاتقان فی بیان علوم القرآن از سیوطی جلد اول

31 صحیح بخاری جلد اول، صحیح مسلم جلد دوم

خلاف ہے حضرت علامہ جیسے آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ انتہائی غیر علمی انداز میں کسی کی علمیت کا مذاق اڑائیں۔ سید محمد علی محمد باب کا ذکر آتا ہے تو ایک اور شخصیت کے تذکرہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہے ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ۔ قرۃ العین کا اصل نام فاطمہ زریں تاج تھا وہ ایک مشہور عالم ابن حاجی ملا صالح کی بیٹی تھی اس کا پورا خاندان علم وفضل میں قابل رشک شہرت رکھتا تھا یہ ایران کا چوٹی کا خاندان سمجھا جاتا تھا قرۃ العین کو تفسیر، حدیث، فقہ اور الٰہیات میں پوری مہارت حاصل تھی وقت کے مشہور عالم دین سید کاظم نے فاطمہ زریں تاج کو قرۃ العین کا لقب دیا اور اس لقب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اس کا نام دب کر رہ گیا۔ فارسی ادب میں اُسے قرۃ العین طاہرہ لکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرۃ العین اس کا نام اور طاہرہ تخلص تھا مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں قرۃ العین کا لقب اُسے سید کاظم نے اور طاہرہ کا لقب اس کے والد نے اُس پاکیزگی فکر وعمل کے باعث دیا تھا اس طرح سے دونوں لقب تھے۔ جنہوں نے اس کے نام کو تقریباً ناپید کر دیا قرۃ العین حسن نسوانی کا دل آویز مرقع تھی بڑی قادر الکلام شاعرہ تھی اس کے لفظوں میں سچائی بھری خوشبو اور ندرت سے لبریز تمکنت تھی اس کی نثر بھی مصنوعیت سے پاک رہتی تھی اور وہ پرکار ادیبہ تھا اس کے ساتھ ہی وہ سحر البیان خطیبہ تھی وہ بولتی تھی تو اس کے پرجلال لہجے میں حسن بیان کے فردوس مہک اٹھتے تھے ایک اور بات جس نے اُسے تاریخ میں منفرد کر دیا اس کی سوچ تھی، اس کا شعور تھا اور حصول مقصد کے لئے اس کی سرفروشانہ جدوجہد تھی اور جان نثارانہ طرز عمل تھا۔

قرۃ العین ایشیاء کی پہلی خاتون تھی جس نے حقوق نسواں کا علم بلند کیا اور خواتین میں اُن کے مقام کا شعور جگانے کے لئے بیداری کی تحریک اٹھائی۔ اس کے چچا ایران کے ''مجتہد'' تھے قرۃ العین کی شادی اپنے چچا کے بیٹے محمد تقی سے ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے کوشش کی کہ اپنے گھر والوں کو اپنے خیالات سے اتفاق کرنے پر آمادہ کرے اس کے والدین تو کسی حد تک اس کے ہمنوا ہو گئے مگر شاید اس کا شوہر اور سسرال اس سے متفق نہ ہو سکے وہ اپنے مقصد کے ساتھ اتنی مخلص تھی کہ اس نے سمجھ لیا متضاد خیالات کے باعث وہ شادی کا بندھن نبھا نہیں سکے گی چنانچہ اُسے طلاق ہو گئی ایک روایت بھی ہے کہ اس طلاق کے بعد وہ محمد علی برفروش کے پاس رہنے لگی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ اپنے والدین

کے گھر رہنے لگی جو صورت بھی ہو اس کی عصمت وعفت کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ بابی مذہب میں کردار اور سیرت کی پاکیزگی پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اُسے تو اس مذہب کی مبلغہ اول کا درجہ حاصل تھا۔ قرۃ العین کی شاعری بھی اپنی طرز کی انوکھی شاعری ہے اس سے پہلے فارسی شاعری شاہد وشراب میں غرق تھی یا تصوف اور بے جان مذہبیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے پہلی دفعہ شاعری کا رخ انسان اور اس کے حقیقی مسائل کی طرف موڑا مگر کہیں بھی اس نے اپنی شاعری کو خشک پروپیگنڈا نہ بننے دیا اس نے اپنی شاعری میں صداقت کے حسن کے ساتھ شعریت کی دلربائی اور دل کشی قائم رکھی۔ غیر متعلق نہ ہوگا اگر ہم یہاں دو چار ایسے شعر درج کر دیں جو اس کی جدت پسندی اور شاعری میں مجتہدانہ شان کی پر جمال بصیرت کے نقیب ہوں۔

ایشیاء میں عورت بالخصوص مسلمان عورت کی ہمیشہ تحقیر وتذلیل کی گئی اس کی تحقیر میں جو تذلیل آمیز ضابطہ اخلاق مرتب کیا گیا وہ ادب میں بھی راہ پا گیا۔ اس کی ایک مثال دیکھئے مگر اس سے پہلے ایک لفظ سمجھ لیجئے فارسی زبان میں ''زدن'' مصدر کے معنی ہیں ''مارنا'' اس مصدر سے ''زند'' فعل مضارع ہے اور ''زن'' فعل امر ہے اس کے معنی ہیں ''مار'' ادھر ''زن'' کے معنی عورت بھی ہیں اب دیکھئے فارسی شاعر کس طرح لفظوں کے کھیل میں عورت کی تذلیل کرتا ہے۔

1

اگر نیک بودے سراحواں زن

زناں را ''مزن'' نام بودے نہ ''زن''

ترجمہ: اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی تو عورت کا نام ''مزن'' (مت مار) ہوتا نہ کہ زن (مار) ہوتا

2

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن

کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

ترجمہ: جمشید نے اپنے ایک صاحب الرائے یعنی عقلمند مصاحب سے کیا اچھی بات کہی کہ

3

مشو ایمن از زن کہہ زن پار ساست

کر خربستہ بہ گرچہ وزد آشناست

ترجمہ: اگر عورت پارسا بھی ہو تو اس کی طرف سے مطمئن نہ ہو کہ گدھے کو باندھ کر رکھنا بہتر ہے چاہے چور دوست بھی ہو۔

قرۃ العین طاہرہ کے لئے خواتین کی یہ تذلیل نا قابل برداشت تھی اُس نے خواتین کی عظمت کا پرچم بلند کیا اور کہا۔

مادر خودرا چناں دشنام دادن سفلگی

آنکہ بردہ رنج پر دردن تر ادر طفلگی

ترجمہ: جس ماں نے بچپن میں تجھے پالنے کی مصیبت اٹھائی اُسے اس طرح گالی دینا کمینگی ہے۔

ایک جگہ خاتون کو دعوت عمل دیتے ہوئے کہتی ہے۔

پیکر ایثار تو ایں چادر تحقیر سوز

صبح کردن ایں شب تاریک رادشو ارنیست

ترجمہ اے پیکر ایثار تحقیر کی اس چادر کو جلا ڈال اس اندھیری رات کو صبح میں بدلنا مشکل تو نہیں

جب قرۃ العین کو علم ہوا کہ ایران میں سید محمد علی محمد باب ''مہدویت'' کے دعویٰ کے ساتھ میدان عمل میں آ گئے ہیں تو اُن کے پاس گئی اور حقوق نسواں کے متعلق ان سے گفتگو کی اُسے معلوم ہو گیا کہ باب کی دعوت اس کے خیالات سے بھی ہم آہنگ ہے اور اس میں اُس کے لئے مزید روشنی بھی ہے تو باب پر ایمان لانے والے ''السابقون آلاوّلوُن'' میں شامل ہو گئی باب کی دعوت کا اصول عمل امن عالم کے لئے کوشاں ہونا تھا قرۃ العین اس کی پرچارک تھی امن عالم کے سلسلہ میں اس کا ایک قیمتی شعر دیکھئے۔

نیست مشکل ایں زمیں را ساختن باغ بہشت

ز آہن شمشیر باید ساختن آلات کشت

ترجمہ: اس زمین کو باغ بہشت بنانا کچھ مشکل نہیں تلواریں توڑ کر اُن سے حاصل شدہ لوہے سے ہل، کدال اور کسی بنا لینے چاہئیں

باب کے پیروکاروں پر ظلم وتشدد کے دروازے کھل گئے گرفتاریاں ہوئیں اور سر کٹنے لگے تو قرۃ العین بھی گرفتار ہو کر شاہ وقت ناصر الدین قاچار کے دربار میں لائی گئی بادشاہ نے دیکھتے ہی اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر کہا ''یہ تو خداوند کریم کا عظیم شاہکار ہے اسے چھوڑ دیا جائے'' پھر قرۃ العین سے مخاطب ہو کر کہا ''خاتون محترم تمہارا مقام بہت اونچا ہے تم ملکہ کے مرتبہ پر فائز کی جاسکتی ہو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ بازاروں اور گلیوں میں علی باب کی مناجاتیں پڑھتی پھرو آؤ کہ قصر شاہی تمہارا منتظر ہے'' قرۃ العین نے برجستہ کہا۔

تو و ملک جاہ سکندری ، من وسم وراہ قلندری

اگر آں نکوست تو درخوری، وگریں بداست مراسزا

ترجمہ: تو ہے اور بادشاہت اور سکندرانہ شان وشوکت، میں ہوں اور قلندرانہ انداز زیست اگر وہ اچھا ہے تو تجھے مبارک اور اگر یہ برا ہے تو یہی میرے سزادار ہے یعنی یہ برا سہی میں اسی پر خوش ہوں۔

شاہی فرمان کے مطابق ہزاروں باب کے پیروکار تہ تیغ کر دیئے گئے باب کے ایک فداکار پر جلاد نے تلوار اٹھائی تو اُس نے کہا ''اگر میں تلوار کے پہلے وار میں زندہ رہا تو تجھے ایک مفید بات بتاؤں گا'' جلاد کے پہلے وار سے اس کی گردن آدھی کٹ گئی تو اس نے اپنی گردن کے لہو سے ہاتھ رنگتے ہوئے کہا ''جو بات تجھے بتانا تھی وہ یہ ہے کہ'' مجھے اپنے ہی خون کی قسم علی محمد باب سچا نبی ہے۔ میرے جیسے لاکھوں لوگوں کے خون اس پر قربان ہوں'' [32]

ایسے ہی فداکاروں کی ترجمانی کرتے ہوئے قرۃ العین طاہر نے کہا تھا۔

گر بچشم ماہی دیدی جمال مرگ ما

در صف ماتو ہمی شامل شدی جلاد شر

ترجمہ: اے شر پسند قاتل اگر تو ہماری آنکھوں سے ہماری موت کا جمال دیکھتا تو تو بھی ہم

[32] ''تاریخ کی عدالت میں'' ص 158

مقتول ہونے والوں کی صف میں آ کھڑا ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ قرۃ العین کو مخالفوں کے ہجوم نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

آپ سوچ رہے ہونگے کہ سید محمد علی محمد باب کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے قرۃ العین کا تفصیلی ذکر کیوں چھیڑ دیا؟ دراصل ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ قرۃ العین طاہرہ اسی باب کی پیروکار بلکہ جان نثار پیرو کار تھی جس کا علامہ اقبال نے مذاق اُڑایا اور جسے جاہلوں کی صف میں کھڑا کر کے مسرور ہوئے مگر وہی علامہ اقبال ''جاوید نامہ'' لکھ رہے تھے اور اپنی مفروضہ ''معراج'' کی سیر بیان کر رہے تھے تو قرۃ العین طاہرہ کو مقام بلند عطا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

چنانچہ ''جاوید نامہ'' میں ''فلک مشتری'' پر پہنچتے ہیں تو وہاں حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کو دیکھتے ہیں اور ایک خوبصورت نظم شروع کر دیتے ہیں جس کا عنوان ہے ''ارواح جلیلہ حلاج و غالب وقرۃ العین طاہرہ کہ بہ نشیمن بہشتی نگرویدند و بگردش جاوداں گرائیدند'' یعنی حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح جلیلہ جو اپنے بہشتی نشیمن میں قرار پذیر نہ ہوئیں اور گردش جاوداں یعنی مسلسل حرکت شروع کر دی'' مطلب یہ ہے کہ بہشت میں بھی ان کا ارتقاء انجام پذیر نہ ہوا اور ارتقائی گردش جاری رکھی اپنی نظم میں کہتے ہیں ''ترجمہ میں نے اپنی پرواز میں آسماں پر نظر ڈالی تو قریب تر سیادہ دیکھا اس نظارہ کی ہیبت نے میرے ہوش چھین لئے اور مجھے نزدیک و دور کی تمیز نہ رہی میں نے اپنے سامنے تین پاک باز روحوں کو دیکھا جن کے دلوں کی حرارت جہان کو پگھلائے دے رہی تھی۔ اس وقت پیر رومی نے مجھے تھام کر کہا اتنا ہوش ربودہ نہ ہو ان آتش نواؤں کی سانسوں سے خود کو زندہ کر لے تو نے شوق بے پروا کو نہیں دیکھا تو دیکھ لے اس شراب کی زوردار مستی نہیں دیکھی تو اب دیکھ لے'' یہ زوردار مستی کن روحوں میں موج زن تھی اقبال کہتے ہیں۔

غالب و حلاج و خاتون عجم

شورہا افگندہ درجان حرم

یہ روحیں غالب، حلاج اور خاتون عجم یعنی قرۃ العین کی تھیں جنہوں نے حرم کی روح کو بھی جوش دلا رکھا تھا۔

تھوڑا آگے چل کر حضرت علامہ نے ''نوائے طاہرہ'' کے عنوان سے قرۃ العین کی ایک خوبصورت غزل نقل کی ہے جو پوری کی پوری عشق رب ذوالجلال میں ڈوبی ہوئی ہے اور ''اضطراب وصال حق'' کی تصویر ہے، ہم اس کا صرف ایک شعر نقل کر کے یہ بحث ختم کرتے ہیں شعر کے الفاظ اور بحر کا انتخاب ہی ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قلزم اضطراب دید موجزن ہے۔ (33)

از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ، دربدر، کوچہ بکوچہ، کو بکو

(تیرا رخ انور دیکھنے کے لئے صبا کی طرح گھر گھر، دردر، کوچہ کوچہ، گلی گلی بھٹکی جارہی ہوں)

غلام قادر رہیلہ

''بانگ درا'' میں علامہ اقبال کی تیرہ اشعار کی ایک نظم ''غلام قادر رہیلہ'' ہے اس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

رُہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں ''شاہ تیموری'' کی آنکھیں نوک خنجر سے

آگے کے اشعار میں بتایا گیا ہے کہ ''شاہ تیموری'' کی آنکھیں نوک خنجر سے نکالنے کے بعد اُس نے ''نازنینان حرم'' یعنی شاہی محل کی شہزادیوں کو حکم دیا کہ وہ اکٹھی ہو کر اس کے سامنے رقص کریں وہ کوئی پیشہ ور رقاصائیں تو تھیں نہیں مگر ظالم کے غیرت کش فرمان کی تعمیل میں الٹے سیدھے پاؤں مارنے لگیں آنکھیں رو رہی تھیں، دل کانپ رہے تھے مگر قدم ''مجبور جنبش'' تھے وہ نظارہ کرتا رہا پھر یوں ظاہر کیا جیسے اُسے نیند آرہی ہے کمر سے تلوار کھولی، خنجر سامنے رکھ دیا اور سو گیا شہزادیوں کو حکم تھا کہ وہ ناچتی رہیں کچھ دیر سوتے رہنے کے بعد اٹھا اور مغل شاہزادیوں سے کہنے لگا تمہیں اپنے مقدر سے کچھ شکوہ نہیں ہونا چاہئے ہم جنگ جو لوگوں کو نیند نہیں آیا کرتی میں تو یونہی دکھاوے کے لئے سو گیا تھا۔

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

(33) ''جاوید نامہ'' کلیات اقبال فارسی مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز طبع ششم ص703،70

میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اولا دتیمور میں غیرت موجود ہے مگر معلوم ہوا حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔

اس طرح نظم کا اختتام ہو جاتا ہے اور اقبال یہ بتا جاتا ہے کہ جب غیرت وحمیت ختم ہو جائے تو تباہی مقدر ہو جاتی ہے اس لئے تباہ حال اور زوال گرفتہ قوموں کو مقدر کا شکوہ نہیں کرنا چاہئے انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی اپنی بداعمالی کے باعث انہیں اس انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ بے شبہ اقبال نے جو پیغام دینا تھا وہ دے دیا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابلاغ کے اعتبار سے نظم کامیاب ہے مگر چونکہ ایک تاریخی واقعہ سے استدلال کیا گیا ہے اس لئے قاری کے ذہن میں تجسس رہ جاتا ہے اور بات مبہم ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں ظہیرالدین بابر سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر تک مغلیہ خاندان کے شاہان وملوک کا طویل سلسلہ ہے یہ سب ''شاہان تیموری'' ہیں کچھ وہ ہیں جو بادشاہ ہو کر تخت پر بیٹھے اور کچھ دیگر تھے جو شاہزادوں کی حیثیت سے عیش وطرب کی زندگی گزارتے رہے۔ قاری سوچنے لگتا ہے کہ وہ کونسا ''شاہ تیموری'' تھا پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ''غلام قادر رہیلہ'' کون تھا؟ پھر یہ کہ اُس نے شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے کیوں نکال ڈالی تھیں؟ کیا یہ صرف اس لئے تھا کہ رہیلہ نے جنگ میں غلبہ پالیا مغل بادشاہ اپنے بھائیوں کی بھی آنکھیں نکال دیتے تھے۔ قاری یہ سوچ کر مطمئن ہو سکتا تھا مگر اقبال نے غلام قادر رہیلہ کو ظالم اور جفاجو کے ساتھ ''کینہ پرور'' کہہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رہیلہ کسی پرانی دشمنی کا انتقام لے رہا تھا اقبال نے واقعہ بیان کر کے جو نتیجہ اخذ کیا ہے یعنی ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے'' وہ پڑھ کر قاری کسی حد تک مطمئن ہو سکتا تھا مگر ''کینہ پرور'' کے الفاظ دل میں کھٹک پیدا کرتے ہیں اسے نظم میں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا اس لئے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ نظم میں ابہام ہے اور یہ ابلاغ کے اعتبار سے نامکمل ہے۔

شارحین اقبال یہ تو شاید بتا دیتے ہیں کہ غلام قادر رہیلہ ''روہیلکھنڈ'' کا ایک سردار تھا جو مغل بادشاہ ''شاہ عالم'' سے معرکہ آراء ہوا اور اُسے شکست دے کر وہ کچھ کیا جو کچھ اقبال کی نظم میں مذکور ہے مگر اس تشریح میں وہ سوال بے جواب رہتا ہے کہ روہیلہ آخر کونسا ''کینہ'' دل میں لئے پھرتا رہا ممکن

ہے شارحین اس شرمناک واقعہ سے لاعلم ہوں ہم اقبال کو بھی اس سے لاعلم سمجھ لیتے مگر اس نے ''کینہ پرور'' کہہ کر بتا دیا کہ وہ اس سے ناواقف نہیں اصل میں بات یہ ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغل بادشاہوں اور شہزادوں میں شراب وشباب سے کھیل کھیل کر طرح طرح کی شرمناک جنسی بیماریاں پیدا ہوگئی تھیں جس ''شاہ تیموری'' یعنی شام عالم کا ذکر نظم میں ہے وہ لونڈے بازی یا اغلام کا عادی تھا اُن دنوں یہ رسم بھی پڑگئی تھی کہ بغاوت میں جب باغی سردار شکست کھا جاتا اور پھر بادشاہ اس کا قصور معاف کرکے اس کا علاقہ واپس کرتا تو عام طور پر آئندہ کی پیش بندی کے لئے بادشاہ ضمانت کے طور پر اُس کا کوئی بچہ اپنے پاس رکھ لیتا یہ بچہ یرغمال ہوتا روہیل کھنڈ کا رہیلہ سردار بھی بغاوت میں شکست کھا کر اپنا بیٹا غلام قادر رہیلہ بطور یرغمال بادشاہ کو دے آیا۔ غلام قادر رہیلہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا لونڈے بازی کے عادی بادشاہ کو اس کے حسن وجمال نے مسحور کرلیا۔ قدیم سے یہ سلسلہ چلا آتا تھا کہ ایسا شوق رکھنے والے بادشاہ خاص طور پر ''ایران'' کے بادشاہ اس طرح کے پسندیدہ لڑکوں کا آپریشن کرا کے انہیں آلہ تناسل سے محروم کردیتے تھے اس طرح ان کے دو مقاصد پورے ہوتے تھے ایک تو وہ انہیں جنسی طلب کے لئے اس وقت تک استعمال کرتے رہتے جب تک ان میں کشش باقی رہتی دوسرے چونکہ وہ انہیں محبوب کے طور پر ہر وقت اپنے پاس رکھتے شاہی حرم میں بھی وہ ان کے پاس رہتے اگر ان میں مردانگی موجود رہتی تو وہ اپنے حسن وجمال کے باعث شہزادیوں کو مائل کرلیتے اور وہ گمراہ ہوجاتیں مقطوع الذکر ہونے کی صورت میں بادشاہ ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہوجاتے یہی وہ لوگ تھے جو آگے چل کر ''خواجہ سرا'' کہلاتے۔ بادشاہ نے غلام قادر رہیلہ کے ساتھ بھی یہی حرکت کی اور اُسے اپنا ''مفعول'' رکھنے کے لئے مقطوع الذکر کرادیا مگر یہ روہیل کھنڈ کا غیور پٹھان تھا محل سے بھاگ نکلا اور بغاوت منظم کرنے کی کوشش میں لگ گیا بالآخر طاقتور ہوکر آیا اور بادشاہ کو شکست دے کر اس کی آنکھیں نکال دیں یہ تھی اس کی ''کینہ پروری'' مسلمان مورخ اس معاملہ کو برص کے داغ کی طرح چھپائے رکھتے ہیں لیکن جانتے ہیں اور کہیں کہیں مجوب انداز میں بیان بھی کردیتے ہیں مشہور ہندو مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اپنی تاریخ ہند میں غلام قادر رہیلہ کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔

☑

تصورِ پاکستان۔ اقبالؒ اور چوہدری رحمت علیؒ

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کی تاریخ کو کبھی حقائق وواقعات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی قدم قدم پر اسے گمراہ کیا گیا اور حقیقت پر دروغ کے اتنے ردے چڑھا دیئے گئے کہ کتنے ہی پرت ہٹاتے جاؤ نیچے سے پھر کسی کذب کا بدصورت چہرہ آپ کو غلط راہ پر ڈالنے کے لئے نمودار ہو جائیگا۔ جھوٹ اس ابتلاء میں ڈال دیتا ہے کہ اسے چھپانے کے لئے سو ہزار اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں یوں ردے چڑھتے چلے جاتے ہیں اور سچ دبیز تہوں میں دور کہیں نیچے رہ جاتا ہے معلوم نہیں پاکستان کے ''سیاست کار، تاریخ نگار'' اور ''دانشور'' کہلانے والوں نے کیوں ایکا کر لیا ہے کہ سچائی کو ہر صورت جھوٹ کے پردوں میں ملفوف کرنا ہے اور یہی جھوٹ اگلی نسلوں کو وراثت میں منتقل کرنا ہے۔ تاریخ پاکستان کی کوئی سی کتاب اٹھا کر دیکھئے نئی نسلوں کو یہی علم منتقل کیا جا رہا ہوگا کہ پاکستان کی آزاد اور خودمختار ریاست یعنی Sovereign State کا خواب اقبال نے دیکھا اور قائداعظم محمد علی جناح نے اس خواب کو ملک پاکستان کی صورت میں متشکل کر دیا۔ آیئے آج کی محفل میں اسی موضوع پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس ''مسلمہ'' سمجھے جانے والے امر میں حقیقت کتنی ہے۔

جب دنیا میں جمہوریت کے چرچے ہونے لگے اور برطانیہ کی جمہوری حکومت ہندوستان کو جمہوری نظام عطا کرنے کا عندیہ دینے لگی تو مسلمان زعماء میں سے بعض چونک اٹھے کہ جمہوریت کا مطلب تو اکثریت کی حکومت ہوتی ہے ادھر ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے یہاں جمہوریت کا مطلب ہوگا ہندوؤں کی حکومت، اس طرح مسلمان ہمیشہ یہاں زیردست رہیں گے۔ مسلمان زعماء میں علامہ اقبال ایک حساس قومی شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکے تھے انہوں نے نظم

ونشر میں جمہوریت کی مخالفت شروع کردی اوراس پر چوٹیں کرنے لگے فرمایا۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

''گننے''اور''تولنے'' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فارسی زبان میں یہ شعر لکھا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

ترجمہ: جمہوریت سے گریز کراور پختہ کارغلام بن جا کیونکہ دوسو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسان کی سوچ برآمد نہیں ہوسکتی۔

بعض لوگ کہتے ہیں بعد میں حضرت علامہ جمہوریت کے قائل ہو گئے تھے اس کی دلیل میں وہ شعر پیش کرتے ہیں۔

''سلطانی جمہور'' کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

مگر یہ شعر اُس وقت کہا گیا جب وہ سوشلزم سے متاثر ہوئے اس وقت انہوں نے سوشلزم کی "Proltariat Dictatorship" کا ترجمہ ''سلطانی جمہور'' کیا تھا اس سے مراد مغربی جمہوریت نہیں تھی۔ چنانچہ جگہ جگہ علامہ صاحب نے جمہوریت کی مخالفت کر کے ہماری بات کی توثیق کی ہے۔

بہر حال صرف علامہ اقبال ہی نہیں بہت سے دوسرے مسلمان لیڈر بھی اکثریت کے خوف سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا سوچنے لگے تھے اس کا ایک حل یہ بھی سوچا جارہا تھا کہ مسلمان صوبوں کو صوبائی خودمختاری دے دی جائے اور یہ ہندوستانی وفاق کا حصہ ہوں اس طرح کی بہت سی اور تجاویز تھیں بھارت سے کاٹ کر مسلمانوں کا حصہ الگ کرنے کی تجویزیں بھی اقبال کے خطبہ الہٰ آباد سے بہت پہلے سامنے لائی جارہی تھیں ان کا استقصاء مشہور قانون دان شریف الدین پیرزادہ نے کیا ہے مگر اس وقت ہم ان تفاصیل میں نہیں جاسکتے کیونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارا موضوع اس وقت علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد ہے۔

جولوگ تاریخ کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کے مخلوط انتخابات قبول کرنے پر مسلم لیگ دوٹکڑوں میں تقسیم ہوچکی تھی ایک گروپ کے سربراہ جناح تھےاور دوسرا گروپ سرشفیع گروپ کہلاتا تھا۔ علامہ اقبال اسی سرشفیع گروپ کے سیکرٹری جنرل تھےاور وہ اجلاس جوآلہ آباد میں ہواتھاوہ ایک طرح سے مسلم لیگ کے سرشفیع گروپ کا ہی اجلاس تھا جس کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے وہ خطبہ ارشادفرمایا تھا جسے اقبال نگاروں نے تصور پاکستان کی بنیادقرار دینے پر بہت سازورقلم صرف کیا ہے۔اس خطبہ کا پس منظر یہ تھا کہ پہلے مولانا حسرت موہانی نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ''پنجاب''،''سرحد''،''سندھ'' اور''بلوچستان'' کو ملا کر ایک صوبہ بنادیا جائے یہ خود مختار (Autonomous) ہواوراس کا مرکزی حکومت ہند سے''ڈھیلا ڈھالا''اتحاد ہوجیسا فیڈریشن میں ہوتا ہے۔''نہرورپورٹ''میں اس تجویز کو یہ کہہ کررد کردیا گیا تھا کہ یہ بہت بڑا صوبہ ہوجائے گا جس کا انتظام مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ یہ تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے کہ حسرت موہانی کی تجویز اور نہرورپورٹ کے بعد''قادیانی فرقہ'' کے خلیفہ بشیرالدین محمود نے اپنے اخبار''الفضل''میں فیڈریشن کے مطالبہ کی حمایت میں12اکتوبر1928ء میں ایک سلسلہ مضامین بالا قساط لکھنا شروع کیا جو2نومبر 1928ء تک چلتا رہااسی سلسلہ کو28نومبر 1928 کوکتابی مشکل میں شائع کردیا گیا۔

بشیرالدین محمود نے لکھا

''فیڈرل حکومت کا اصول کوئی غیر مجرب اصول نہیں بلکہ ایک لمبے عرصہ سے اس کا تجربہ کیا جارہا ہے امریکہ، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اورسوئٹزرلینڈ میں بھی اسی قسم کی حکومت ہے۔ میں سمجھتا ہوں فیڈریشن کا سوال مسلمانوں کے لئے موت وحیات کا سوال ہےاوراس میں ہندوؤں کا بھی کوئی نقصان نہیں''[1]

29دسمبر 1928ءکوآل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس سرآغاخان کی زیرصدارت''دہلی''میں منعقد ہوااس میں جناح لیگ کے سوا تمام مسلم جماعتوں کے نمائندوں نے شرکت کی نہرورپورٹ کی مذمت کی گئی فیڈرل حکومت کا مطالبہ اوردوسرے وہی مطالبات پیش کئے گئے جوالفضل کے تبصرہ میں

[1] نہرورپورٹ پرتبصرہ ص64

آ چکے تھے مارچ 1929ء میں قائداعظم نے ''تجاویز دہلی'' اور ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کے دس 10 مطالبات پر اپنی طرف سے چار (4) مطالبات کا اضافہ کیا تاریخ میں ان ہی کو قائداعظم کے چودہ (14) نکات کہتے ہیں۔

مرزا بشیر الدین محمود نے مذکورہ تبصرہ میں نظائر پیش کرنے کی کوشش کی اور ایک قابل عمل مثال پیش کرتے ہوئے لکھا تھا ''ایک اور نئی حکومت ہے یعنی ''زیگوسلوویکیا''۔ جس میں نئی قسم کا تجربہ کیا گیا ہے یعنی سارے ملک میں تو فیڈریشن نہیں ہے لیکن ''روتھیینا'' کے علاقہ کے لوگوں کے خوف یعنی اکثریت کی طرف سے اقلیت کے حقوق کی پامالی کے خوف کی وجہ سے کامل خوداختیاری حکومت دے دی گئی ہے۔ مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر اسی طریق پر ہندو راضی ہو جائیں یعنی پانچ مسلم صوبے فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے مضبوط مرکزی حکومت کے تابع رہیں'' 2

یہ تجویز اس لئے اہم تھی کہ اس میں ''زیگوسلوویکیا'' میں ''روتھیینا'' صوبہ کی نظیر پیش کی گئی اور بتایا گیا تھا کہ اس ملک میں باقی تمام صوبے مضبوط مرکز کے ماتحت تھے مگر ''روتھیینا'' کو خودمختار صوبہ بنادیا گیا تھا۔ احمدی خلیفہ بشیر الدین محمود کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندو صوبے کانگریس کے رہنماؤں کے مطالبہ کے مطابق مضبوط مرکز کے ماتحت ہوں لیکن جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو انہیں الگ سے ایک صوبہ بنادیا جائے اور یہ صوبہ Autonomous یعنی صوبائی خودمختاری کا حامل ہو۔ اور اس کا مرکز سے اس طرح کا اتحاد ہو جیسا فیڈریشن میں ہوتا ہے۔ اب ہم علامہ اقبال کے خطبہ آلہ آباد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر پہلے ایک ضروری وضاحت دیکھ لیجئے۔

State اور Province

صوبہ کے لئے Province کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا اور State کا بھی Province بالعموم عام صوبے کے لئے بولا جاتا تھا لیکن State اس صوبہ کو کہتے تھے جس کو صوبائی خودمختاری حاصل ہو State بمعنی صوبہ اور State بمعنی ریاست یعنی آزاد اور خودمختار

2 ایضاً ص 64

ریاست کو ممیز کرنے کے لئے خود مختار صوبہ کے لئے استعمال ہونے والے State کو چھوٹے S سے لکھا جاتا لیکن مکمل آزاد اور خود مختار ریاست کے لئے State بڑے S سے لکھا جاتا تھا ابہام دور کرنے کے لئے خود مختار صوبہ کے لئے Autonomous اور مکمل طور پر آزاد ریاست کے لئے Soverign کا لفظ لکھ دیا جاتا تھا قائداعظم کے مشہور چودہ نکات کا آخری نکتہ دیکھ لیجئے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں

No change shall be made in the constitution by the central legislature except with the concurrence of the ❸"States" constitutin the Indian Federation

ترجمہ: مرکزی مقننہ کی طرف سے دستور میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں لائی جائے گی جب تک وفاق ہند میں شامل ''سٹیٹس''، یعنی خود مختار صوبے اس کی منظوری نہیں دیں گے۔

یہاں آپ نے دیکھا کہ خود مختاری کے حامل صوبہ کو State کہا گیا ہے اس امر کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اگر ہم United States of America کی مستقل مثال سامنے رکھ لیں امریکی ریاست خود مختاری کے حامل صوبوں کا وفاق ہے مولانا حسرت موہانی نے 1924ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک خود مختار صوبہ بنا دیا جائے جس کا مرکز سے ڈھیلا ڈھالا اتحاد ہو اسی تجویز کو مزید منقح انداز میں بشیر الدین محمود نے پیش کیا اور اس کے قابل عمل ہونے کے ثبوت کے طور پر ''زیگوسلوویکیا'' کے صوبہ ''روتھینیا'' کی مثال بھی پیش کی۔ نہرو رپورٹ میں مولانا حسرت موہانی کی متذکرہ بالا تجویز پر بحث ہوئی اور اسے یہ اعتراض رکھ کر رد کر دیا گیا کہ اس طرح ایک بہت بڑا صوبہ وجود میں آجائے گا جس کا انتظام ناممکن ہو جائے گا۔

اقبال کا خطبہ الہٰ آباد

اب آیئے علامہ اقبال کے خطبہ الہٰ آباد کی طرف، علامہ اقبال اگرچہ سر شفیع لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے لیکن اپنے خطبہ کی ابتداء میں انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ''میں کسی جماعت کا

❸ ''کری ایشن آف پاکستان''، از جسٹس شمیم حسین قادری ص43

رہنما نہیں اور نہ کسی رہنما کا پیروکار ہوں'' 4

آگے انہوں نے یہ وضاحت کی کہ ہندوستان میں مختلف قومیں بستی ہیں ان میں مسلمان بھی ہیں ان کا بھی دوسری قوموں کی طرح حق ہے کہ انہیں اپنی روایات وتمدن کے مطابق آزادانہ نشو ونما کے مواقع حاصل ہوں انہوں نے فرمایا

''مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات وتمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو ونما کا حق حاصل ہو تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربان سے بھی دریغ نہیں کریں گے'' 5

علامہ صاحب کے ذہن میں ملک کو دو ٹکروں میں بانٹنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ دوسرے بہت سے مسلمان سیاست دانوں کی طرح جمہوریت کے روبہ عمل آنے کی صورت میں مسلمانوں کی سیاسی موت دیکھ رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں صوبوں کی ازسرِنو تقسیم عمل میں لائی جائے اور جداگانہ انتخابات ہوں فرماتے ہیں'' ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ دارانہ مسائل کے تصفیہ کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی ازسرِنو تقسیم کی جائے لیکن اگر مسلمانوں کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر نہایت شدومد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا جو آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بار بار کئے گئے۔ ہیں مسلمانان ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جس کے تحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا مرکزی مجلس میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ مل جائیں'' 6

صوبوں کی ازسرِنو تقسیم کے متعلق ان کے ذہن میں ایک خاص اصول تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس اصول پر صوبے تقسیم ہوئے تو ''فرقہ وارانہ'' مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں گے انہوں نے یہ اصول بیان کرتے ہوئے کہا۔

''اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ ہر صوبہ کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل، ان کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب وتمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا'' 7

---

4 علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ص 3 5 ایضاً ص 14 6 ایضاً ص 31 7 ایضاً ص 20

ہم مولانا حسرت موہانی کی 1924ء میں پیش کردہ تجویز کا ذکر کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ اسے اس بنیاد پر رد کر دیا گیا تھا کہ اگر پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ بنایا جائے تو یہ بہت بڑا صوبہ ہوگا اور اس کا انتظام مشکل ہو جائے گا۔ علامہ صاحب اس تجویز میں اپنی طرف سے ترمیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ''State'' میں ملا دیا جائے خواہ سٹیٹ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے (Autonomous) خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی State قائم کرنا پڑے گی۔ ❽

آگے وضاحت کر دی گئی کی یہ وہی تجویز ہے جو پہلے نہرو رپورٹ میں رد کر دی گئی تھی فرماتے ہیں۔

اس تجویز کو نہرو کمیشن میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر روک دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی State قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہوگا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا'' ❾

ظاہر ہے یہ کسی الگ ملک کی بات نہیں تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی عمل داری رہے یا ہندوستان آزاد ہو جائے یہ سٹیٹ ہندوستان کے اندر ہوگی اسی لئے نہرو کمشن کو اس کے رقبہ کی وسعت پر اعتراض تھا۔ اگر یہ کسی الگ ملک کی بات ہوتی تو نہرو کمشن کو اس کے انتظام کی دشواری کا عذر کیوں پیش کرنا تھا یہ تو آزاد ریاست کا اپنا دردسر ہوتا۔ رقبہ کی اس وسعت پر جو اعتراض ہوا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جو قدم آگے بڑھایا گیا وہ یہ تھا علامہ صاحب فرماتے ہیں۔

This is true. So far as the area is concerned, the Exclusion of ambala division and perhaps of some

---

❽ ❾ علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ص16

districts, where non Muslims pre dominate, will mark it less extensive and more Muslims in Population

ترجمہ: اگر رقبہ کا خیال کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس State کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی غالباً انبالہ ڈویژن یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں غیر مسلم آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی معاملات میں اور بھی کمی ہو جائے گی (10)

چونکہ اس مسلم اکثریتی صوبہ کے لئے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تھا اس لئے اس کی خاطر State کا لفظ استعمال کیا گیا۔

مولانا حسرت موہانی کی تجویز 1924ء کی تھی۔ نومبر 1928ء میں احمدی فرقہ کے خلیفہ بشیر الدین محمود نے اسے زیادہ مدلل انداز میں پیش کیا تھا۔ جنوری 1929ء میں اسے ریزولیوشن کی صورت میں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں پاس کیا گیا۔ علامہ اقبال نے خطبہ الہٰ آباد میں آل پارٹنر مسلم کانفرنس کی اسی قرارداد کا حوالہ دیتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔ پروفیسر ریاض صدیقی نے خطبہ الٰہ آباد کی بات کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اسی سال یعنی 1928ء میں نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے قادیانی فرقہ کے رہنما مرزا بشیر الدین محمود احمد نے ایک تجویز پیش کی اور بنگال اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک فیڈریشن قائم کرنے کا مشورہ دیا اقبال کا خطبہ الہ آباد اسی تجویز کی تعبیر و تشریح ہے'' (11)

اسی خطبہ کے حوالہ سے قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری لکھتے ہیں۔

''اس طرح خطبہ الہ آباد والی تجویز سے مولانا حسرت موہانی اور لالہ لاجپت رائے کی تجویزیں پھر زندہ ہو گئیں'' (12)

لالہ لاجپت رائے کی تجویز بھی یہی تھی کہ مسلمانوں کے صوبے الگ ہوں اور ہندوستان کی مرکزی فیڈریشن کا حصہ ہوں مگر انہوں نے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ شمال مغرب کے ان صوبوں

(10) (11) علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد ص 16 (12) ''قرارداد پاکستان کا منظر و پس منظر'' ص 36

کے متصل مسلمان ملکوں کا وسیع سلسلہ شروع ہو جاتا ہے انگریز بھی اسی خدشہ سے پریشان ہو رہے تھے 1917ء میں روس میں سوشلسٹ انقلاب آچکا تھا انگریز خوف زدہ تھا اگر مسلمان ملک بشمول شمال مغربی ہند کے مسلمان صوبے اکٹھے ہو کر روس کے ساتھ ہو گئے تو برطانوی حکومت کے لئے بہت بڑا خطرہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ علامہ اقبال کو ہندو اور انگریز دونوں کے خدشات کا علم تھا انہوں نے انہیں مطمئن کرنا ضروری سمجھا انہیں بتایا کہ مسلمانان ہند نے بڑی وفاداری سے انگریز سرکار کی خدمت کی ہے اور اسے مستحکم کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے مسلمانوں کا یہ صوبہ روس کی یلغار سے ہندوستان کو بچائے رکھے گا۔ انہوں نے فرمایا

''اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور توانا طبقہ کی مرکزیت کی بدولت جس نے سرکار برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں خدمات سرانجام دے کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھ سکیں۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو وارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی 56فی صد ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ 54فی صد ہے۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ رائیٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ مل کر خودمختار اسلامی States قائم کی جائیں ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانان ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ

قدم بڑھائیں لیکن اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ دوسری ملتوں پر ان کا غلبہ ہو جائے (13)

بہر حال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک اسلامی اٹانومس سٹیٹ کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہوگا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے اس سے نہ صرف صحیح معنوں میں ان کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے قریب تر ہو جائیں گے'' (14)

خطبہ میں کچھ شاعرانہ ژولیدگی فکر تو ہے مگر یہ بات کہیں نہیں کہ ہندوستان کا ایک حصہ الگ کر کے علامہ صاحب مسلمانوں کے لئے نیا ملک وجود میں لانا چاہتے ہیں وہ صرف مسلمانوں کا ایک خود مختاری کا حامل صوبہ مانگتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مضبوط مرکز کا تصور رکھنے والی اور ہندوؤں کا تسلط قائم کرنے والی حکومت نہ ہو بلکہ فیڈرل حکومت کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں توازن قوت ہو وہ ہندوستان کا استحکام اسی میں دیکھتے ہیں کہ ہندو اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق اپنے تمدن کو نشو و نما دینے میں اپنے صوبوں میں ایک حد تک آزاد ہوں اور مسلمانوں کو اپنے صوبوں میں یہی مواقع حاصل ہوں۔ آخر میں ''عربی ملوکیت'' کے اثرات سے آزاد ہو کر اسلام کی تجدید کی جو بات انہوں نے کی ہے وہ بڑی حد تک نا قابل فہم ہے اور نا قابل فہم رہے گی کیونکہ آج اسلام کی تاریخ کے پاس جو سرمایہ ہے اس کا زیادہ حصہ ''عرب ملوکیت'' کے دور میں ہی وجود میں آیا ہے۔ یہ وسیع ذخیرہ احادیث اور اس سے متعلقہ علوم اسماء الرجال وغیرہ اور وہ زبردست قانونی نظام جسے ''فقہ'' کہا جاتا ہے یہ سب تو اسی عہد ملوکیت میں ہی مدون ہوا۔ عہد خلافت تو زیادہ تر بیرونی ممالک سے جنگوں یا خانہ جنگی میں بسر ہوا۔ علامہ اجتہاد سے شاید کوئی ایسی صورتحال پیدا کرنے کے حامی تھے جس میں خلاف اسلام روایات تمدن سے نباہ کیا جا سکے۔ فیڈریشن کی صورت میں یہی کچھ تو پیش آنا تھا وہ اپنے اس خیال کو

(13) ''ہمارے قائد اعظم''، مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ص 33 (14) علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ص 17، 18، 19

پوری وضاحت سے یہاں پیش نہیں کر سکے تاہم کنایتاً اس کا اظہار اسی خطبہ میں کر دیا ہے وہ کہتے ہیں

''اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سود کے متعلق قوانین بنائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے اسلامی حکومت نے شرح سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں'' (15)

ہم نے علامہ اقبال کے خطبہ کا متعلقہ حصہ تمام تفاصیل کے ساتھ نقل کر دیا ہے اب تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

چوہدری رحمت علی

مشہور اقبال نگار محمد احمد خان لکھتے ہیں۔ ''چوہدری رحمت علی تحصیل و ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے 1919ء میں بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا کچھ عرصہ ملازمت کی 1927ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے کیمبرج اور ڈبلن کی جامعات سے انہوں نے ایم اے اور قانون کی ڈگریاں لیں وہ پھر کیمبرج میں ہی رہ پڑے۔ بتاریخ 28 جنوری 1933ء لندن میں انہوں نے چار ورق کا ایک پمفلٹ بزبان انگریزی شائع کیا جس کا عنوان تھا۔ ''اب یا کبھی نہیں'' (Now or Never) اس پمفلٹ پر چوہدری رحمت علی کے علاوہ محمد اسلم، شیخ محمد صدیق اور عنایت اللہ خان کے دستخط تھے۔ اس پمفلٹ میں انہوں نے برصغیر ہند میں مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق کا مطالبہ کیا تھا'' (16)

محمد احمد خان صاحب نے غلطی تو یہ کی کہ صاحبزادہ محمد صادق کی جگہ شیخ محمد صدیق لکھ دیا 1919ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کرنے والی بات میں بھی سنہ غلط معلوم ہوتا ہے 1919ء میں بی اے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ 1915ء میں چوہدری رحمت علی دسویں جماعت کے طالب علم ہوں گے مگر وہ اپنی کتاب "Pakistan, The Father land of Nation" میں بتاتے ہیں کہ 1915ء میں انہوں نے ''بزم شبلی'' کی بنیاد رکھتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا تھا جسے بعد میں منضبط انداز میں 1933ء کے پمفلٹ Now or Never میں بیان کیا گیا میٹرک کے طالب علم

---

(15) ایضاً ص 15 (16) اقبال کا سیاسی کارنامہ ص 895

سے اس طرح کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے ایک مشہور کالم نگار خالد حسن (مرحوم) نے اپنے روزنامہ ''ڈان'' میں لکھے ہوئے ایک کالم میں تحریر کیا تھا ''رحمت علی 1897ء میں پیدا ہوئے وہ لاہور کے اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم رہے اور پھر کیمبرج چلے گئے جہاں 1918ء میں دو دوسرے طالب علموں کے ساتھ مل کر ''اب یا کبھی نہیں "Now or Never" نام کا پمفلٹ لکھا'' (17)

دونوں تحریروں کا تضاد واضح ہے۔ خیر ہم ان باتوں سے صرف نظر کر کے اصل موضوع طرف آتے ہیں۔ چوہدری رحمت علی ''پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن'' میں دو قومی نظریہ پر مسلمانوں کے پختہ ایمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جس طرح اور بہت سے والدین نے بھی اپنے بچوں کو یہ عقیدہ سمجھایا ہوگا اسی طرح میرے والد حاجی چوہدری شاہ محمد نے بھی بچپن میں ہی مجھ میں یہ عقیدہ بھر دیا۔ میں نے اس کے ساتھ نشوونما پائی اور اس نے میرے ساتھ، میری تعلیم نے اسے پکا کر دیا اور میرے تجربات نے اس کو فولاد جیسی توانائی بخشی، مزید یہ کہ 1909ء اور 1915ء کے دوران ملت کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا انہوں نے اس کو میری زندگی کا محور بنا دیا۔ یہ 1915ء کا واقعہ ہے اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن سال جب بزم شبلی کی بنیاد رکھتے ہوئے میں نے پہلی بار اپنے خیالات کا اظہار کیا میں نے بزم سے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا۔

انڈیا کا شمال مسلم ہے اور ہم اسے مسلم ہی رکھیں گے۔ صرف یہی نہیں۔ ہم اسے ایک مسلم سٹیٹ بنائیں گے لیکن یہ ہم صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمارا اور ہمارے شمال کا تعلق انڈیا سے ٹوٹ جائے چونکہ یہ اس کے لئے شرط اولیں ہے۔ اس لئے جتنی جلدی ہم ''انڈینزم'' کا طوق اتار پھینکیں اتنا ہی ہم سب کے لئے اور اسلام کے لئے بہتر ہوگا'' (18)

چوہدری صاحب بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دوقومی نظریہ تو مسلمانوں کو متوارث ملتا آرہا تھا ہر مسلمان باپ اپنے بچوں کو یہ عقیدہ منتقل کرتا آرہا تھا کہ مسلمان قوم دوسری قوموں سے بالکل الگ اور ممیز ہے لیکن

(17) ''ایک تکلیف دہ کہانی'' کالم خالد حسن مترجمہ ریحان قیوم روزنامہ خبریں'' اسلام آباد 29 مارچ 2001ء

(18) ''پاکستان دی فادر لینڈ آف پاک نیشن'' مترجمہ اقبال الدین احمد ص 66

شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی ہندوستان سے الگ آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنے کا خیال صرف میرے ذہن میں آیا تھا اور میں نے پہلی دفعہ 1915ء میں اس کا اظہار کیا تھا لکھتے ہیں۔

''اس قصے پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے لئے یہ اللہ کی ایک رحمت تھی اس سے میرے نصب العین کو صرف اور صرف اسلامی سمت نصیب ہوگئی ایسی سمت جس نے آخر کار پاک پلان کی طرف رہنمائی کی پاکستان جس کا پہلا حصہ ہے'' [19]

پھر انہوں نے ایک شخص محمد گل خان صدر انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی طرف سے محدود پیمانے پر ایسی ہی بات کرنے کا ذکر کیا ہے محمد گل خان نے یہ بات 1923ء میں کی تھی اس کے بعد انہوں نے مولانا حسرت موہانی کو آزادی کی خاطر ان کی قربانیوں پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے مطالبہ کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

''1924ء میں انہوں نے ہندو جاتی کے لیڈروں سے سیاسی حالات پر بات چیت کی اور انڈیا کو آزاد کروانے کے بارے میں انہوں نے اپنی تجویز پیش کی اس بات چیت میں انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے اس بات کو رد کر دیا کہ انڈیا کے لئے صرف ڈومینین کے درجے کا مطالبہ کیا جائے انہوں نے انڈیا کی مکمل آزادی کا نقطہ نظر پیش کیا اور اسے حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی حمایت کا وعدہ کیا بشرطیکہ ہندو جاتی ان کی اس بات کو تسلیم کرے کہ ''مسلم سٹیٹس متحد ہو کر نیشنل فیڈرل گورنمنٹ آف انڈیا کے ماتحت ہوں گی'' [20]

اس کے بعد چوہدری رحمت علی نے لفظ سٹیٹ State کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا ہے یہ وضاحت اگرچہ ہم لکھ آئے ہیں لیکن یہاں ہم چوہدری صاحب کے الفاظ درج کرنا لازم سمجھتے ہیں انہوں نے لکھا ہے۔

''یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فیڈریشن کے اندر لفظ ''سٹیٹ'' کا مطلب اقتدار اعلیٰ کا ملک نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی ملک کے ماتحت بہت سے علاقوں میں سے ایک علاقہ (Unit) ہوتا ہے اور اس لئے اگرچہ فریب نظر کی بناء پر ظاہر طور پر علیحدہ حصے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ انڈیا میں استعمال ہونے والے

[19] ایضاً ص68 [20] ایضاً ص69

لفظ ''صوبہ'' کے ہم معنی ہے'' [21]

چوہدری صاحب کو مولانا حسرت موہانی کی بے لوث' مخلصانہ سیاسی خدمات کا پوری طرح اعتراف ہے مگران کی 1924ء کی مذکورہ تجویز سے واضح اختلاف ہے اس اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اگر مجھے ان کی تجویز بالکل انہی کے مطابق پیش کرنے کی اجازت ہوتو (میں یہ کہوں گا کہ) انہوں نے ہندوؤں سے کہا:

(ا) مستقبل میں آزاد انڈین سٹیٹ کی بنیاد دو کمیونٹیوں (ہندو مسلم) پر مشتمل تسلیم کی جائے۔

(ب) مسلم اکثریت والے صوبوں کو مسلم سٹیٹس میں اور ہندو اکثریت والے صوبے کو ہند سٹیٹس میں بدل دیا جائے۔

(ج) ان سٹیٹس کی ایک انڈین فیڈریشن بنائی جائے اور اسے ایک ایسی سپریم نیشنل گورنمنٹ کے تحت کر دیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز پیش کرتے وقت وہ خلوص دل سے ایک آزاد فیڈرل انڈیا میں آزاد اسلام کی امید کر رہے تھے لیکن یہ ایک فضول سی امید تھی چونکہ اس قسم کی فیڈریشن سے اسلام کو زنجیروں میں جکڑنے کے علاوہ کچھ نہ ملتا اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

اوّل:۔ ہمارے صوبوں کو ''سٹیٹس'' یعنی خود مختار صوبوں میں بدلنے سے ہماری بنیادی حیثیت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔

دوم:۔ چھ مسلمان سٹیٹس اور سولہ ہندو سٹیٹس پر مشتمل فیڈریشن بننے سے انڈیا میں ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محکوم بن کر رہ جاتے۔

سوم:۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کا مطلب ہم مسلمانوں کے لئے صرف ہندو قومیت ہی ہوتا۔ کیونکہ دس کروڑ مسلمان پچیس کروڑ ہندوؤں کے برابر نہ ہو سکتے۔ آخری بات یہ کہ اس تعداد کے فرق کی بناء پر سپریم نیشنل گورنمنٹ میں بہت بڑی اکثریت ہندوؤں کی ہوتی'' [22]

---

[21] ایضاً ص 70 [22] ایضاً ص 70

اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کی تجویز پر تبصرہ کیا پھر علامہ اقبال کو بحیثیت ایک عظیم قومی شاعر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں پھر ان کے خطبہ آلہ آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد یوپی میں انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں انڈیا کے قومی حالات کا جائزہ لیا اور انڈین قوم کی جو بین الاقوامی ساخت ہے اس پر زور دیا۔ آخر میں ایک عظیم ماہر کی طرح اپنے بیان کا لب لباب بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی کہ مختلف مذہبی گروپوں کو جان ومال کی حفاظت دلا کر انڈیا کی زندگی میں ڈھال دیا جائے (منطبق کر دیا جائے) اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جہاں تک مسلم کمیونٹی کا تعلق ہے انہوں نے کہا ''انڈیا کے اندر مسلم انڈیا'' [23]

''ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی آگے جانا چاہوں گا جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی 1928ء میں پاس ہونے والے ریزولیوشن میں ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، نارتھ ویسٹرن فرنیٹر پراونس، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سٹیٹ بنا دی جائے۔ برطانوی ایمپائر کے اندر رہتے ہوئے یا برطانوی ایمپائر سے باہر (انڈیا کے لئے) حکومت خود اختیاری، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نارتھ انڈین مسلم سٹیٹ کے الحاق کا بننا کم از کم نارتھ ویسٹ انڈیا کے مسلمانوں کی تقدیر (منزل) ہے نہرو کمیٹی کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تھی انہوں نے اسے اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اگر اس پر عمل کیا گیا تو اس سے ایک بے ہنگم سی ''سٹیٹ'' بن جائے گی [24]

اس پر چوہدری رحمت علی کہتے ہیں۔

''اپنے پورے خطبہ میں انہوں نے (علامہ اقبال نے) انڈیا کو ایک ملک کہا ہے انڈینز کو ایک قوم، اور مسلمانوں کو اسی قوم کا گروہ یا حصہ (Communities) اسی لئے انہوں نے مسلمانوں سے

---

[23] ''چترا'' دی انڈین اینوال رجسٹر 1930ء حصہ دوم ص 338 [24] ''پاکستان از چوہدری رحمت علی ص73 ''سٹیٹ'' کی وضاحت کرتے ہوئے مترجم نے حاشیہ میں لکھا ہے ''یاد رہے کہ علامہ اقبال کی اصل تقریر کی تحریر میں لفظ State کا s چھوٹا درج ہے جو کسی ملک کے اندر کسی چھوٹے علاقہ یعنی صوبے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے ایک آزاد ملک کے لیے S بڑا استعمال کرنا ہوگا پاکستان کے واحد نڈر مورخ پروفیسر کے کے عزیز نے اپنی کتاب ''دی ہسٹری آف دی ائیڈیا آف پاکستان'' میں اس پر خوب بحث کی ہے'' (مترجم) حاشیہ ص74

مخاطب ہو کر کہا ''ہم مسلمانوں پر انڈیا کے بارے میں ایک فرض ہے جہاں ہمیں جینا اور مرنا ہے''

یہ اور اس طرح کے دوسرے دلائل سے چوہدری صاحب نے یہ ثابت کیا کہ علامہ اقبال کی تجویز انڈین فیڈریشن کو قبول کرتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا ایک خود مختاری کا حامل صوبہ وجود میں آجائے چوہدری صاحب اس کے خلاف اس نظریہ کے نقیب تھے کہ مسلمانوں کو اپنے اوپر سے، ہندوستانی قومیت کا لیبل اتار پھینکنا چاہئے اور انڈین فیڈریشن سے الگ خود مختار مسلم صوبوں کی الگ فیڈریشن بنانی چاہئے جو ایک آزاد ملک بن کر بالآخر افغانستان اور ایران کے مسلمان ممالک سے یک جہتی پیدا کر کے مسلمانوں کو ایک عظیم قوت بنا کر ان کا شان دار ماضی انہیں لوٹا دے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس عظیم مقصد کے لئے انہوں نے مسلمان سیاسی رہنماؤں سے رابطے کیئے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھ کر خواہش ظاہر کی کہ وہ اسی کو نصب العین بنا کر آگے بڑھیں مگر کسی نے بھی ان کی تجویز کی بھرپور حمایت کر کے اسی کو نصب العین بنا لینے پر رضامندی کا اظہار نہ کیا ہر طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ خدا ان سے ہی یہ کام لینا چاہتا ہے لکھتے ہیں۔

''پھر مجھ پر اس احساس نے قبضہ جما لیا کہ اللہ نے اس تاریخ ساز کام کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے'' [25]

اس طرح انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو الگ وطن دلانے کی جدوجہد شروع کر دی اب ان کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ اس الگ ملک کا نام کیا رکھیں گے؟ اس سلسلہ میں وہ بتاتے ہیں کہ

''ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھ سے زیادہ کوئی اس بات کا احساس نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک نہایت مشقت طلب راستہ ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ایک مقدس فرض بھی تھا ایسا فرض جو منزل مقصود کی طرف لے جاتا تھا۔ میں نے کئی سال پہلے یہ فرض ادا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس پر وہ سب کچھ قربان کر دیا جو میرے بس میں تھا اپنی تعلیم کو بھلا کر، اپنے مستقبل یا گھر سے دست برداری اختیار کرتے ہوئے میں نے اسے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور میں نے اپنے ایمان سے رہبری کی دعا مانگی میں نے وہ سب کچھ کیا جس سے اس مقصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی میں نے چلے کاٹے اور اللہ سے راہبری کی التجائیں کیں اللہ نے اپنی خاص نظر عنایت سے مجھے روشنی دکھائی اور میری لفظ

[25] ایضاً ص 79

''پاکستان''اور پاک پلان کی طرف رہنمائی کی اور ان دونوں نے اب ہمارے لوگوں کی زندگیوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔''[26]

پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس نصب العین کو مسلمانوں کو سامنے لانے کے لئے انہوں نے "Now or Never" نام کا پمفلٹ لکھا'' پھر میں نے ان نوجوانوں کی تلاش شروع کی جو اس پمفلٹ پر میرے ساتھ دستخط کریں تین ماہ سے زیادہ عرصہ کی تلاش کے بعد صرف تین نوجوان لندن میں ایسے ملے جو دستخط کرنے پر بھی تیار ہو گئے اور تعاون کی پیش کش بھی کی'' یہ تین نوجوان تھے (1) محمد اسلم خان خٹک (آکسفورڈ) (2) صاحبزادہ شیخ محمد صادق لندن کی کسی انز آف کورٹ کے طالب علم (3) عنایت اللہ خان کسی مویشیوں سے متعلقہ کالج کے طالب علم۔

اس پمفلٹ کی اشاعت کے بعد اگلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ 1933ء میں ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ باقاعدہ تنظیم کی بنیاد 1933ء میں رکھی گئی لیکن جس وقت سے برطانوی حکومت نے ہندوستان میں فیڈرل حکومت قائم کرنے کا پروگرام بنایا چوہدری رحمت علی نے مسلمانوں کو فیڈریشن مین شامل ہو کر فیڈرل حکومت کا حصہ بننے سے روکنے سے متعلق اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے الگ صوبے بنوا کر صوبائی خودمختاری حاصل بھی کر لی لیکن انڈین فیڈریشن کا حصہ رہے تو اس کا مطلب یہی ہوگا مسلمانوں نے اپنے موت کے صداقت نامے پر دستخط کر دیئے ان کے نزدیک متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت بے معنی ہو جاتی وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے صوبوں کا الگ فیڈریشن ہو اور یہ ہندوستان سے الگ ہو اس الگ خطہ زمین کا نام انہوں نے خود پاکستان تجویز کیا اس سلسلہ میں وسیع پیمانے پر خط وکتابت کی ہندوستان میں مسلمان سیاسی رہنماؤں اور انگریز ارباب کار کو خطوط لکھے انگلستان کے اخبارات کے ایڈیٹروں کو لکھا وہاں کے ارکان پارلیمنٹ اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو لکھا۔ یوں انہوں نے اپنی ''پاکستان سکیم'' کو متعارف کرانے کی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کوشش کی انہوں نے اپنی پاکستان سکیم کو بے شمار پمفلٹس اشتہارات اور خطوط کے ذریعہ متعارف کرایا۔ ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا 1935ء میں اسی ادارہ کی جانب سے ایک کتاب جس کا نام ''پاکستان'' تھا شائع کی [27]

[26] ایضاً ص 82

ان کوششوں کا اثر ہوا انگریز سیاسی مفکرین اس تجویز پر چونک اٹھے حتی کہ گول میز کانفرنس میں ان کے ذہنوں میں بڑا سوال یہی تھا۔ ذرا یہ تفصیل دیکھ لیجئے۔

''گول میز کانفرنس کے برطانوی مندوب سر رینالڈ کریڈاک نے ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں سے پوچھا سوال نمبر 9598 کیا کوئی صاحب بتائیں گے کہ ''پاکستان'' کے تحت صوبوں کے کسی الگ وفاق کی کوئی سکیم موجود ہے''؟

جواب از عبداللہ یوسف علی سی بی ای: جہاں تک مجھے علم ہے یہ محض ایک طالب علم کی سکیم ہے اسے کسی ذمہ دار شخص نے پیش نہیں کیا۔

کریڈاک:۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ''پاکستان'' نام کی کسی سکیم سے واقف ہیں؟

جواب از سر ظفر اللہ خان:۔ آپ کو جواب مل گیا ہے یہ ایک طالب علم کی سکیم ہے اور اس میں کوئی قابل غور بات نہیں۔

سوال نمبر 9599 از سر آئزک موٹ:۔ پاکستان کیا ہے

جواب از سر ظفر اللہ خان:۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہمارے خیال میں یہ ایک مفروضاتی اور نا قابل عمل تجویز ہے۔

سوال نمبر 9600 از رینالڈ کریڈاک:۔ مجھے کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں ''پاکستان'' کے تحت بعض مسلم صوبوں کو الگ سے یکجا کرنے کی تجویز ہے؟

جواب از خلیفہ شجاع الدین:۔ غالباً یہ کہنا کافی ہوگا اب تک کسی نمائندہ فرد یا تنظیم نے ایسی کسی سکیم پر غور نہیں کیا'' [28]

آپ نے دیکھ لیا کہ ''پاکستان سکیم'' کو برصغیر کے سیاسی زعماء ایک طالب علم کی مفروضاتی اور نا قابل عمل تجویز سمجھ رہے تھے مگر انگریز مدبرین کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ یہاں سے یہ بھی واضح

---

[27] روزنامہ جنگ کراچی مورخہ 24 مارچ 1971ء اس ساتھ ہی انہوں نے ''پاکستان'' کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کر رکھا تھا جس کا ذکر انہوں نے ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے ساتھ گفتگو میں کیا۔ (بحوالہ قائداعظم جناح از جی الانا ص 365) [28] ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے متعلق مشترکہ کمیٹی کے روبرو شہادتوں کی روداد'' ج 2 ص 1406 مطبوعہ سٹیشنری آفس لندن نیز'' قائداعظم جناح'' از جی الانا ص 370

ہو گیا کہ اس وقت اقبال کے خطبہ آلہ آباد کو ''پاکستان سکیم'' سے الگ دیکھا جا رہا تھا۔ اور ان دونوں میں کسی طرح مماثلت نہیں ڈھونڈی جا رہی تھی۔

اُس وقت برصغیر کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بالعموم آئیڈیلزم کا شکار تھے اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے واپس آنے کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے چوہدری رحمت علی بھی ان ہی میں سے ایک تھے انہوں نے انڈیا (India) کو پوری طرح مسلمانون کے قبضہ میں دیکھنا شروع کر دیا تھا اور حرفوں کو آگے پیچھے کر کے اس کا آئندہ نام (Dinia) ''دینیہ'' تجویز کر رکھا تھا خیر اسے چھوڑ یئے ہم اپنے آپ کو موضوع تک محدود رکھنے کے پابند ہیں۔ بہرحال اپنے اس وسیع پلان کا ابتدائی جزوہ قیام پاکستان تھا۔ اور ابھی انہوں نے اسی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر رکھی تھی مسلمان سیاسی رہنما تو جس طرح آپ نے دیکھ لیا ''پاکستان سکیم'' کو ایک طالب علم کی مفروضاتی اور ناقابل عمل تجویز سمجھ رہے تھے لیکن برصغیر کے مسلم نوجوان اسی کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے ''مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے ارباب بست دکشاد چوہدری رحمت علی ہی کی ''پاکستان سکیم'' کے دیوانے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مولانا عبدالستار خان نیازی، صوفی ابراہیم علی چشتی وغیرہ تمام حضرات کو اسی ''پاکستان سکیم'' نے متحرک کر رکھا تھا۔ ''مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کا قیام یکم ستمبر 1937ء کو عمل میں آیا تھا اس کے پہلے صدر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید تھے ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی ہے کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا منشور بناتے وقت

It goes without saying that none of us had read the Allahabad address and it was the Pakistan National Movement of Ch. Rahmat Ali that had primarily influenced our minds.

یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی اب تک علامہ اقبال کا خطبہ آلہ آباد 1930ء نہیں پڑھا تھا یہ چوہدری رحمت علی کی ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' ہی تھی جس نے سب سے پہلے ہمارے ذہنوں کو متاثر کیا۔ [29]

---

[29] ''پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن'' حاشیہ از اقبال الدین احمد ص 235 شائع کردہ چغتائی پبلشرز لاہور 2007ء

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے الگ مسلمانوں کا ملک تشکیل دینے کا تصور چوہدری رحمت علی کا ہی تھا پھر یہ کہ اس ملک کا نام پاکستان بھی چوہدری رحمت علی نے ہی تجویز کیا تھا انہوں نے ہی وضاحت کی تھی کہ یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے تجویز کیا گیا تھا پنجاب کا ''پ'' افغانیہ یعنی صوبہ سرحد ''ا''، ''کشمیر کا ''ک'' سندھ کا ''س'' اور بلوچستان کا ''تان ملا کر نئے متصورہ ملک کا بامعنی نام وجود میں آ گیا تھا۔ (30)

چوہدری رحمت علی نے اپنے سارے وسائل جھونک کر اس کی اتنی تشہیر کی کہ مشرق و مغرب اس نام کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے پنجاب کے اُس دور کے وزیراعظم یعنی صوبائی وزیراعلیٰ سر سکندر حیات نے پنجاب اسمبلی میں واشگاف طور پر کہا تھا۔

Then there is Chaudhri Rahmat Ali's Scheme widely circulated in this country. The word Pakistan might have an appeal, A Strong appeal for the Muslim masses.

ادھر چوہدری رحمت علی کی سکیم ہے جسے اس ملک میں وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا ہے لفظ ''پاکستان'' میں مسلمان عوام کے لئے اپیل ہے بڑی زبردست اپیل (31)

مگر افسوس ہے کہ ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال اس حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے کہتے ہیں ''لیکن معلوم ہوتا ہے کہ'' پاکستان نیشنل موومنٹ کیمبرج تک ہی محدود رہی اس کا نام کبھی مسلم ہند میں سننے میں نہیں آیا'' (زندہ رود ص425) بلاشبہ اس لفظ میں بڑی اپیل تھی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نوجوانوں نے اسے لوگوں تک پہنچانے میں بڑی جاں فشانی دکھائی تھی اس لئے پاکستان سکیم میں لوگ زیادہ دلچسپی لے رہے تھے ہندوؤں نے خاص طور پر اس کو موضوع بنالیا اور اس کے خلاف لکھنے لگے۔ چوہدری رحمت علی اس وقت ایک غیر معروف آدمی تھے ہندوستان کے سیاسی جغادری اس نئے آدمی کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہ تھے آپ نے دیکھا کہ خود مسلمان سیاسی زعماء بھی ''پاکستان سکیم'' کو ایک

---

(30) ''پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن''، حاشیہ از اقبال الدین احمد ص81 شائع کردہ چغتائی پبلشرز لاہور 2007ء

(31) ''پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن''، حاشیہ از اقبال الدین احمد ص244 شائع کردہ چغتائی پبلشرز لاہور 2007ء

طاب علم کی مفروضاتی اور نا قابل عمل تجویز کہہ کر چوہدری رحمت علی کا استخفاف کررہے تھے اس وقت مسلمانوں کو متعصبانہ سوچ کے مالک ٹھہرانے پر ہندو اخبارات نے اس سکیم کو علامہ اقبال کے خطبہ آلہ آباد 1930ء کی تعبیر و تفسیر قرار دینا شروع کر دیا مغرب بھی چوہدری رحمت علی کو اہمیت دینے پر تیار نہ تھا اس نے بھی پاکستان سکیم کو علامہ اقبال سے منسوب کرنا شروع کر دیا اس وقت علامہ اقبال نے وضاحت ضروری سمجھی۔ 1933ء میں چوہدری رحمت علی کا پمفلٹ ''اب یا کبھی نہیں'' Now or Never گول میز کانفرنس کے موقع پر منظر عام پر آیا تھا اور لوگوں نے اقبال کے 1930ء کے خطبہ سے اس کے ڈانڈے ملانا شروع کر دیئے تھے ان ہی لوگوں میں ایڈروڈ ٹامسن بھی تھے علامہ اقبال نے انہیں 4 مارچ 1934ء کو وضاحتی خط لکھا اس میں وہ فرماتے ہیں۔

''آپ نے مجھے اس سکیم کا حامی قرار دیا ہے جو ''پاکستان'' کے نام سے موسوم ہے۔ ''پاکستان'' میری سکیم نہیں جو تجویز میں نے اپنے خطبہ میں پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے قیام کی تجویز تھی یعنی مغربی ہند میں ایک ایسے صوبہ کی تشکیل جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو میری سکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ آئندہ کی انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا لیکن ''پاکستان سکیم'' مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن کے قیام کی سفارش کرتی ہے جس کا انگلستان سے براہ راست تعلق علیحدہ ڈومینین کی صورت میں ہوگا یہ سکیم کیمبرج میں بنائی گئی اور اس کے موجدوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین نے مسلم قوم کو ہندو یا انڈین نیشنلزم کے بھینٹ چڑھا دیا ہے'' [32]

اس کے دو روز بعد 6 مارچ 1934ء کو ہی علامہ صاحب نے اپنے دوست مولانا راغب احسن (ڈھاکہ) کو بھی ایک خط لکھا اس میں بھی یہی وضاحت کی خط انگریزی میں ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے

''6 مارچ 1934ء

عزیز من راغب

میرا خیال ہے یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے سلسلہ جنبانی کروں اور یہی کروں گا لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تحریر فرما کر مجھے ارسال کر دیں

---

[32] ''زندہ رود'' ص 421

خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈروڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں یہ تبصرہ مختلف وجوہ کی بنا پر دلچسپ ہے اور یہ تبصرہ شاید آپ کے جریدہ میں اشاعت کے لئے مناسب ہی رہے دوسری کاپی ''سٹار آف انڈیا (کلکتہ) کو روانہ کر دیجئے۔

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ میری تجویز ''پاکستان سکیم'' سے تعلق رکھتی ہے حالانکہ جہاں تک میری تجویز (خطبہ آلہ آباد میں بیان کردہ) کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جب کہ ''پاکستان سکیم'' کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔

آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ''سٹار آف انڈیا'' کے ایڈیٹر کی توجہ بھی اس نکتہ کی جانب منعطف کرا دیں۔خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال، (33)

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب خود کہنے والے نے اپنی کہی ہوئی بات کی وضاحت کر دی تو پھر کسی کے کچھ کہنے کہ گنجائش کہاں رہ جاتی ہے آپ حق بجانب ہیں لیکن ہمارے ''دانشوروں'' کو یہ عادت ہے کہ وہ دوسروں کے منہ میں اپنی زبان ڈال دیتے ہیں اور اپنے مطلب کی بات کہہ کر اس سے منسوب کر دیتے ہیں کہنے والا خود کہہ رہا ہے کہ میں نے اپنی تجویز میں جو State کا لفظ کہا تھا تو اس سے میری مراد خود مختاری کا حامل صوبہ تھا مگر ہمارے دانشور کہتے ہیں State سے مراد باقاعدہ ریاست ہے یہاں ذرا فرزند اقبال ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال کے ارشادات سنیئے فرماتے ہیں۔

(33) ''اقبال۔جہان دیگر''۔''زندہ رُود'' ص 422

''یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کے مسلم ریاست کے تصور اور چوہدری رحمت علی کی ''پاکستان سکیم'' میں فرق کیا تھا اقبال نے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز ہندوستان میں ایک ذمہ دار مسلم سیاسی شخصیت کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کی تھی چوہدری رحمت علی نے ایک مسلم طالب علم کی حیثیت سے ان ہی مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ریاست کا نام ''پاکستان'' تجویز کر کے اپنا پمفلٹ انگلستان سے شائع کرایا اقبال کی خود مختار مسلم ریاست کسی قابل قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر ہندوستان کے وفاق میں برطانوی سلطنت یا برطانوی دولت مشترکہ کے اندر قائم ہو سکتی تھی اور اس کا علیحدہ طور پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہونے کا امکان صرف اسی صورت میں تھا جب ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہ رہے لیکن چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنا تھا'' [34]

فرزند اقبال کی کاری گری ملاحظہ ہو انہوں نے ''مسلم سٹیٹ'' کا ترجمہ مسلم صوبہ نہیں کیا ''مسلم ریاست'' کیا حالانکہ اقبال کہہ چکے ہیں کہ ان کی مراد مسلم صوبہ کی تخلیق تھی انہوں نے خود ہی ایک اور بات کر دی کہ اگر ہندو مسلم مفاہمت ہو جاتی تو یہ خود مختار مسلم ریاست ہوتی اور اگر ایسی مفاہمت نہ ہو سکتی تو پھر یہ آزاد مملکت ہوتی۔ اقبال کے خطبہ کا متعلقہ حصہ ہم نے تفصیل سے نقل کیا ہے وہاں کہیں بھی یہ بات نہیں پھر اقبال اور چوہدری رحمت علی کی حیثیتوں کا فرق نمایاں کیا گیا چوہدری رحمت علی کو ایک طالب علم کہہ کر استخفاف کیا گیا اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بات کرنے والی ذمہ دار شخصیت قرار دیا گیا یہ نہیں بتایا گیا اس اجلاس میں انہوں نے مسلم لیگ کے کسی متفقہ مطالبہ کی بات نہیں کی تھی صرف اپنی ذاتی خواہش کا اظہار کیا تھا تاہم غنیمت ہے کہ فرزند اقبال نے پاکستان سکیم کو چوہدری رحمت علی سے ہی منسوب رہنے دیا۔

علامہ اقبال نے مسلم صوبوں کو ایک صوبہ میں مدغم کر کے خود مختار صوبہ بنانے کا جو مطالبہ کیا تھا اُسے نہرو رپورٹ میں بے ہنگم اور بہت بڑا صوبہ کہہ کر پہلے ہی رد کیا جا چکا تھا اگر اقبال کی تجویز کے

[34] ''زندہ رُود'' ص 420-419

مطابق اس میں سے چند ہندو اکثریت والے علاقے منہا بھی کر دیئے جاتے پھر بھی یہ بے ہنگم رہتا۔ ایک اور بات بھی کہ اقبال نے پھر کبھی لوگوں کی توجہ خطبہ آلہ آباد میں پیش کردہ تجویز کی طرف مبذول نہیں کرائی بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے دست بردار ہو گئے تھے ملک برکت علی حضرت علامہ کے مہربان دوست تھے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا۔

''مجھے اس امر پر بڑی مسرت ہے کہ میں یہ کہنے کے قابل ہو گیا ہوں کہ سر محمد اقبال اب اپنی تجویز سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ ایسی چیز جسے کوئی بھی ایسا شخص پیش نہیں کر سکتا جس کے ہوش وحواس برقرار ہوں اور اگر وہ اس سے دست بردار نہ بھی ہوتے تو بھی میں زوردار الفاظ میں اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے رد کر دیتا'' 35

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے مسلمان سیاست دان اس تجویز کو نا قابل عمل تجویز سمجھتے تھے بات بھی صاف تھی اگر غیر منقسم ہندوستان کے وفاق کا حصہ ہی رہنا ہے تو پھر اس طرح کے صوبہ میں مسلمان اپنی تہذیب کا احیاء کس طرح کر سکتے تھے ان سیاست دانوں کو چوہدری رحمت علی کی تجویز بھلی لگتی تھی ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کی باتیں بھی معقول لگتی تھیں مگر ''ایک طالب علم'' انہیں ہضم نہیں ہوتا تھا آخر اتنے بڑے سیاست دان ایک غیر معروف طالب علم کو کیسے اپنا لیڈر مان لیتے وہ نامور لوگ سمجھتے تھے اس طالب علم'' کو اپنا مقتدا مان لینا سیاسی خودکشی ہو گی۔ چوہدری رحمت علی اور ان کے انگلینڈ کے دوست بھی چاہتے تھے کہ اپنی تحریک کسی نامور آدمی کی قیادت میں چلائیں اس سلسلہ میں انہوں نے اقبال کو بھی پیش کش کی مگر اس پیش کش میں چوہدری رحمت علی نے یہ شرط شامل کر دی کہ وہ اپنا ''سر'' کا خطاب واپس کر دیں اور ان کے ساتھ مل کر کام کریں مگر شاید ان میں یہ جرأت نہ تھی چوہدری رحمت علی کے ساتھ کام کرنا ویسے بھی مشکل تھا وہ اپنے رویوں میں کسی قسم کی لچک نہیں آنے دیتے تھے۔ ترک صحافی خالدہ ادیب خانم نے صحیح لکھا ہے۔

''تحریک پاکستان کے بارے میں چوہدری رحمت علی کسی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے اور اپنی تحریک کے حق میں وہ اس جوش وجذبہ اور فصاحت و بلاغت سے دلائل دینے لگتے تھے جیسے کوئی وکیل اپنا کیس لڑ رہا ہو'' 36

35 ''تھاٹس آن پاکستان'' از ڈاکٹر بی آر امبیدکر ص 362 36 ''ان سائیڈ انڈیا'' ص 351

چوہدری رحمت علی نے اپنا سب کچھ ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' کے لئے داؤ پر لگا دیا ان کی شب و روز کی محنت اور ان کے مطالبہ کی معقولیت رنگ لانے لگی خاص طور پر ہندوستان کے مسلم طلبہ متاثر ہونے لگے اقبال الدین احمد انڈیا آفس لائبریری میں اپنی تلاش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہیں پر مجھے وہ خط مل گیا جو سید محمد افضال حسین قادری نے 8 مارچ 1940ء کو علی گڑھ سے چوہدری رحمت علی کے نام لکھا تھا جس میں اور بہت سے ایسے طالب علموں کے نام ہیں جو پاکستان نیشنل موومنٹ کے ممبر بنے تھے اس خط میں چوہدری رحمت علی کو قائد ملت کہہ کر خطاب کیا گیا ہے'' (37)

پاکستان سکیم کی یہی مقبولیت تھی جس کے باعث پرستاران اقبال کوشش کرنے لگے تھے کہ یہ سہرا کسی نہ کسی طرح حضرت علامہ کے سر پر سجا دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے اقبال بھی قلبی طور پر یہی خواہش رکھنے لگے تھے مگر کھل کر اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے ہم لکھ آئے ہیں چوہدری رحمت علی نے ابتداء میں علامہ اقبال سے کہا تھا کہ وہ ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' میں شامل ہوں مگر اقبال خاموش رہے چوہدری رحمت علی اپنے رفیق خواجہ عبدالرحیم کو لکھتے ہیں۔

''میکلوڈ روڈ کے مست (یعنی اقبال) کی جانب سے ایک لفظ بھی موصول نہیں ہوا'' (38)

مگر یہ ابتدائی بات تھی جب چوہدری رحمت علی کی سکیم کا زیادہ چرچا ہوا تو پرستاران اقبال اسے اقبال سے منسوب کرنے لگے اور معلوم ہوتا ہے اقبال بھی چپکے چپکے یہ کریڈٹ حاصل کرنے کی خواہش کرنے لگے یہ بات اُس خط سے معلوم ہوتی ہے جو چوہدری رحمت علی نے 1935ء میں خواجہ عبدالرحیم کو لکھا۔ چوہدری صاحب لکھتے ہیں۔

''ہم میں سے کسی کو بھی ڈاکٹر صاحب (یعنی اقبال) کی اس خدمت سے انکار نہیں ہو سکتا جو انہوں نے اسلام کی کی ہے لیکن تحریک پاکستان کو ان کے حلقہ خاص کے رشید صاحب جیسے ممبر کا ان سے منسوب کرنا اہمیت سے معرا نہیں معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اپنے حلقہ خاص میں اگر اس خیال کو اپنی زبان سے ظاہر نہیں فرماتے تو کم از کم اس کی تردید بھی نہیں کرتے اور اب جب کہ تین سال کی محنت اور

(37) پاکستان دی فادر لینڈ آ دی پاک نیشن'' مترجم اقبال الدین احمد ص 19 (38) خط محررہ 11 اپریل 1933ء بحوالہ زندہ رُود'' ص 424

خطرات کے بعد اس تحریک کا نام پاکستان کے سلسلہ میں لوگوں کی زبان پر آنے لگا ہے تو غالباً حضرت کے قلب کے لئے یہ چنداں ناگوار نہیں کہ ہم سب کو اس کے تعلق سے محروم کر کے اس کا نیک وبد کریڈٹ خود ہی حاصل کرلیں۔ آپ کو میرے وہ الفاظ یاد ہوں گے جو میں نے انہیں کہے تھے کہ ''تحریک پاکستان'' کی ممبری کے لئے بھی آپ کو اس وقت تک قبول نہیں کروں گا جب تک آپ اس ''سری'' (یعنی سر کے خطاب) سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت آواز کی تکلیف کی وجہ سے دیگر تمناؤں سے مایوس ہو بیٹھے ہیں اس لئے ہم عاجزوں کی طرف دست درازی فرما رہے ہیں۔ اگر میں نے انہیں اس سرقہ کا مجرم پایا تو مجھے کتاب میں ان تمام گفتگوؤں کا خلاصہ درج کرنا ہوگا جو اس سلسلہ میں حضرت کی دردناک کمزوریوں کی داستان ہیں میں یہ عرض کروں گا کہ یہ پہلو اپنے تک ہی محدود رکھیں یا یاران غار تک، باہر نہ جانے دیں'' [39]

ہمارا خیال ہے چوہدری رحمت علی کی ''پاکستان سکیم'' کی مقبولیت دیکھ کر اور اُس کے متعلق اپنے پرستاروں کا اس سکیم کو اقبال سے منسوب کرنے کا زیر لب، بالائے لب اظہار دیکھ کر واقعتاً اقبال اس کریڈٹ کے خواہاں ہو گئے تھے اور اُن پر واضح ہو گیا تھا ان کی خود مختار مسلم صوبے والی تجویز مہمل سی تھی چنانچہ وہ چوہدری رحمت علی والی سکیم کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے تھے مگر ان کی ''دردناک کمزوریاں'' آڑے آ رہی تھیں اس لئے وہ قائداعظم کو ترغیب دینے لگے کہ وہ اس سکیم کو ان کی سکیم کے طور پر آگے بڑھائیں انہوں نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم کے نام جو خط لکھا ذرا اس کا انداز ملاحظہ کریں لکھتے ہیں۔

''برصغیر میں شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء اتنی دیر ممکن نہیں جب تک کہ یہاں ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں کئی برسوں سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبہ کا وقت آن نہیں پہنچا''

آخری جملہ ایک بار پھر پڑھیئے اور دیکھئے کہ کس طرح اس تصور کو اپنے برسوں پہلے کے پالے ہوئے عقیدہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ پھر اپنے خط بنام جناح محررہ 21 جنون 1937ء میں لکھتے ہیں۔

---

[39] خط محررہ 14 اکتوبر 1935 بحوالہ ''زندہ رُود'' ص 424

''ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں یعنی مسلم صوبوں کی علیحدہ فیڈریشن میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ، شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان یا بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خوداختیاری سے کیوں کر محروم رکھا جاسکتا ہے''

علامہ اقبال کے ان دونوں خطوط کے اقتباسات نقل کر کے فرزند اقبال ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال تحریر فرماتے ہیں۔

''اقبال ہندوستان کے وفاق کے اندر خودمختار مسلم ریاست یا صوبہ (خطبہ آلہ آباد والی تجویز) کی تجویز سے آگے نکل کر اب شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک ایسی علیحدہ فیڈریشن کی تخلیق کا ذکر کر رہے تھے جو نہ صرف آزاد اور مقتدر ریاست ہی کی صورت میں لائی جاسکتی تھی بلکہ اس میں اسلامی اصلاحات یا اسلامی شریعت نافذ کر کے حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا تھا'' [40]

یہی سکیم تو بیچارے چوہدری رحمت علی کی تھی ہم لکھ آئے ہیں کہ خود حضرت علامہ نے ایڈورڈ تھامسن اور راغب حسن کے نام خطوط لکھ کر بالوضاحت لکھ دیا تھا کہ یہ سکیم کیمبرج والوں کی (یعنی چوہدری رحمت علی کی) ہے۔ کاش قائداعظم کو خط لکھتے ہوئے حضرات علامہ انتہائی دیانت داری سے یہ بات لکھ دیتے تو کوئی یہ نہ کہہ سکتا کہ اقبال چوہدری رحمت علی کی سکیم پر دراز دستی کرنے لگے تھے اگر اقبال نے ایسا نہ کیا تو ان کے فرزند کا فرض تھا کہ وہ وضاحت کر دیتے وہ اتنا تو کہتے ہیں ''اب ہندوستان کے اندر مسلم صوبہ کی تخلیق سے آگے بڑھ کر آزاد مسلم ریاست کی بات کر رہے تھے'' گویا انہوں نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ خطبہ الہ آباد والی تجویز اور تھی جسے اب انہوں نے رد کر دیا اور نئی تجویز پیش کی مگر اس منصف نے بھی رحمت علی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور باپ کی دراز دستی پر پردہ ڈال گیا۔ اقبال کے ایک اور پرستار محمد احمد خان ہیں۔ انہوں نے ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' میں خطبہ آلہ آباد سے ہی مطالبہ پاکستان اخذ کرنے پر زور لگایا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں اقبال نے خود اٹانومس سٹیٹ دوبار کہا تھا یعنی

[40] ''زندہ رُود'' ص423

''خودمختاری کا حامل صوبہ کے لئے مطالبہ کیا تھا مگر محمد احمد خان صاحب مصر ہیں کہ اس سے اقبال آزاد ومقتدر ریاست ''ساورن سٹیٹ'' مراد لے رہے تھے یعنی ان کے دل میں اسی ریاست کا خیال تھا مگر زبان پر نہیں لا رہے تھے کیوں؟ اس کے جواب کی تان یہاں ٹوٹتی ہے کہ ''چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں''

اقبال نے جناح کو جو خطوط لکھے ان کے اوپر ''بصیغہ راز'' لکھا ہوا ہے گویا اب تک وہ اپنے اندر اتنی جرات نہیں پاتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا مطالبہ اپنے طور پر پیش کر سکیں اور ایک وہ دیوانہ تھا جو بڑی دلیری سے اس کی تشہیر کرتا آ رہا تھا۔

مسلم لیگ کے سیاسی زعماء ''پاکستان سکیم'' کی مقبولیت کے قائل تھے اور اس کی مقبولیت دیکھ کر اسی کو اپنا سیاسی نصب العین بنانا چاہتے تھے مگر اسے خلاف شان سمجھتے تھے کہ کیمبرج کے ایک طالب علم کو اپنا لیڈر مان لیں۔ اقبال کے دل میں اس سکیم کو خود سے منسوب کر لینے کا خیال چٹکیاں لے رہا تھا مگر ابھی وہ لوگ زندہ تھے جنہوں نے ان کی اپنی بیان کردہ وضاحتیں پڑھی تھیں پھر وہ چوہدری رحمت علی جیسے ''منہ پھٹ'' آدمی کے ردعمل کا سوچ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے تاہم انہوں نے قائداعظم کو ''بصیغہ راز'' یہ سکیم اپنی ذات سے منسوب کر کے لکھ بھیجی تھی مگر قائداعظم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ علامہ صاحب فوت ہو گئے ان تصریحات کے بعد علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کو مطالبہ پاکستان کی بنیاد سمجھنا حقائق کو مسخ کرنے اور تاریخ کو قتل کرنے کے سوا کچھ ہماری بحث کو یہاں ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر ہم مزید وضاحت کے لئے کچھ قدم آگے بڑھاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد کیا تھی۔

مطالبہ پاکستان

نواب سر محمد یامین خان قائداعظم کے قریبی ساتھی اور مسلم لیگ کے صف اوّل کے لیڈر تھے انہوں نے اپنی یادداشتیں کتابی صورت میں جمع کی ہیں اقبال کا خطبہ آلہ آباد اور چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کا موازنہ ان کا موضوع نہیں انہوں نے اپنی کتاب میں بر سبیل تذکرہ ایک واقعہ بیان کیا ہے مگر ان کا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ لکھتے ہیں۔

''یکم مارچ 1939ء ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے لنچ پر مجھ کو، مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خان، سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف سر ظفر اللہ خان، مسٹر جناح کے دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ خان کے دوسری طرف ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، لنچ کھانے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسی ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا'' چوہدری رحمت علی کی سکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو ملا کر باقی ہندوستان سے علیحدہ کر دیئے جائیں اس سے پاکستان اس طرح بنتا ہے چونکہ سید محمد حسین زور زور سے بول رہے تھے سر ظفر اللہ خان نے آہستگی سے مجھے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے۔ سر ظفر اللہ خان اس کی مخالفت کرتے رہے کہ یہ نا قابل عمل ہے مسٹر جناح دونوں کی تقریر غور سے سنتے رہے پھر بولے کہ ''اس کو ہم کیوں نہ اپنا لیں اور اس کو مسلم لیگ کا کریڈ (Creed) بنالیں ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگریس سے مصالحت ہو سکے گی وگرنہ نہیں'' میں نے کہا ''مغربی علاقہ کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں مشرقی علاقہ کا کیا بنے گا؟'' مسٹر جناح نے ذرا غور کیا پھر بولے ''ہم دونوں طرف کے علاقوں کو علیحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے بغیر اس کے کانگریس قابو میں نہ آئے گی'' میں نے کہا ''ابھی کئی دن ہوئے کہ بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ بارگیننگ (Bargaining) یعنی سودابازی کے لئے یہ مسئلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بنا کر اٹھایا جائے'' [41]

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بات نواب سر یامین خان کی ذہنی اپج ہو سکتی ہے یا یہ کہ ایہ اکیلی روایت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت یہ وہ حقیقت تھی جو روز روشن کی طرح عیاں تھی اور اسے امر مسلم سمجھا جاتا تھا اسی لئے اسے پیش پا افتادہ حقیقت کے طور پر بیان کیا جاتا اور اس پر دلائل لانے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔ چنانچہ سید طفیل احمد منگلوری رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسے مسلم حقیقت کے طور پر ایک اور بحث کے ضمن میں بیان کر دیتے ہیں انہوں نے لکھا ہے۔

''کانگریس کے ساتھ 1937ء کی بدمزگی کے وقت جب کہ مطالبات کے ترکش میں کوئی

---

[41] ''نامہ اعمال'' (از سر محمد یامین خان) حصہ اوّل ص 26-725

تیر باقی نہ رہا تو آخر مسٹر جناح نے بھی چوہدری رحمت علی کے مجوزہ پاکستان کا مطالبہ اختیار کر کے اسے مارچ 1940ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لاہور میں پاس کر دیا'' (''مسلمانوں کا روشن مستقبل'، شائع کردہ مکتبہ محمودیہ لاہور ص469)

بات اسی انداز میں مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی نے بھی نقل کی ہے (دیکھئے انڈرسٹینڈنگ مسلم مائینڈ مقالہ جناح) ہم نے 1930ء کے الہ آباد کے اجلاس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک طرح سے سر شفیع لیگ کا اجلاس تھا۔ اگرچہ فروری 1930ء میں دونوں گروپ یعنی جناح گروپ اور سر شفیع گروپ متحد ہو چکے تھے۔ مگر قائداعظم اس وقت تک ''اتحاد کا سفیر'' بنے رہنے کی کوشش کر رہے تھے اور اپنے مشن میں بری طرح ناکام ہو کر دل برداشتہ ہو گئے تھے گول میز کانفرنس میں ان کی کیا کیفیت تھی۔ اس کے متعلق ان کے خاص سوانح نگار جی۔ الانا کی یہ تصریحات دیکھئے وہ لکھتے ہیں ''ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں قائداعظم کی کوشش بارآور نہ ہونے کے اثرات ''مانچسٹر گارجین'' سے بہتر شاید کسی نے بیان نہیں کیے اس اخبار نے لکھا تھا'' گول میز کانفرنس میں مسٹر جناح انوکھی پوزیشن کے مالک تھے ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ فرقہ واریت کا شکار ہو گئے ہیں، مسلمان انہیں ہندوؤں کا حامی سمجھتے تھے رجواڑوں کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور انگریز انہیں انتہا پسند خیال کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہ رہے۔ انہیں کوئی شخص پسند نہیں کرتا تھا'' (42)

مصنف مذکور آگے چل کر لکھتے ہیں

''سر شوستر سے ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ 1930ء کی گول میز کانفرنس میں جناح بری طرح ناکام رہے حتیٰ کہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک وہ ہندوستان واپس آنے پر آمادہ نہ تھے'' (43)

وہ انگلستان میں ہی بس گئے اور وہیں پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کرنے لگے اور پھر سر شفیع کی وفات کے بعد بعض زعماء کے اصرار پر اپریل 1934ء میں واپس آئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی اب وہ کسی حد تک فرقہ وارانہ سیاست کرنے لگے تھے بہر حال سر یامین خان کی روایت

---

(42) ''قائداعظم جناح'' از جی الانا مترجم رئیس امروہوی شائع کردہ فیروز سنز ص286 (43) ایضاً ص297

کے مطابق انہوں نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کو مسلم لیگ کا کریڈ بنا لینے کا عزم کرلیا مگر مصیبت یہ تھی کہ ''پاکستان سکیم'' کا خالق ''کیمبرج کا ایک طالب علم'' تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور قائداعظم کہلانے والے لیڈر کو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی کہ انہوں نے ایک ''طالب علم'' کو اپنا رہنما مان لیا ہے اور اُسی کی سکیم کو روبہ عمل لانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہے چنانچہ 1940ء میں اسی سکیم کا چربہ قرارداد لاہور کی شکل میں پیش کر دیا گیا مگر ''پاکستان'' کا لفظ استعمال کرنا خلاف شان سمجھا گیا اگرچہ اس اجتماع میں ایک روایت کے مطابق بیگم محمد علی جوہر نے اور ایک دوسری روایت کے مطابق مولانا عبدالستار خان نیازی (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن) نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ بھی لگا دیا مگر قائداعظم اور دیگر لیگی لیڈروں نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ زنجیر پا وہی بات تھی کہ یہ تو ''کیمبرج کے ایک طالب علم'' کی تجویز ہے حالانکہ وہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ اس طالب علم کی یہ تجویز ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبول ہو چکی تھی اور لفظ پاکستان عوام کی زبان پر تھا قرارداد لاہور پر ہندو اخبارات نے کھل کر لکھا کہ یہ وہی ''پاکستان سکیم'' ہے جو چوہدری رحمت علی نے چلا رکھی ہے۔ قائداعظم سوچنے لگے تھے کہ کیا کیا جائے؟ ''کیمبرج کے طالب علم'' کو اپنے سے زیادہ عقل مند مان لینا وہ کسر شان سمجھتے تھے اس وقت انہیں پرستاران اقبال کی یہ بات بھلی لگی کہ کریڈٹ اقبال کو دے دیا جائے انہوں نے یہی مناسب خیال کیا مگر اقبال کے ساتھ خود کو شامل کرنا ضروری سمجھا۔

1937ء میں اقبال نے کچھ خطوط قائداعظم کو لکھے تھے اس وقت قائداعظم نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اتنا غیر ضروری سمجھا تھا کہ ان سترہ خطوط میں سے بمشکل ایک خط کا جواب دیا تھا مگر اس کی نقل رکھنا مناسب خیال نہیں کیا تھا تاہم وہ خطوط ان کے پاس پڑے تھے وہ انہوں نے اشاعت کے لئے دے دیئے اور ان کا پیش لفظ بھی لکھ دیا اس پیش لفظ میں انہوں نے لکھا۔

''یہ خطوط بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً وہ جن سے مسلم ہندوستان کے مستقبل سے متعلق ان کے نظریات کی صاف اور غیر مبہم الفاظ میں وضاحت ہوتی ہے۔ ان کے یہ نظریات بنیادی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کے دستوری مسائل کا بہ احتیاط مطالعہ کرنے اور ان کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ان نظریات نے مجھے بھی ان ہی نتائج تک پہنچایا جن پر دہ

پہنچ چکے تھے اور یہی نظریات کچھ عرصہ بعد مسلم ہند کی متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار کل ہند مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں ہوا جس کو عام طور پر قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے اور جو 23 مارچ 1940ء کو منظور ہوئی''(44)

اس کے علاوہ 9 دسمبر 1944ء کو''یوم اقبال'' منعقدہ لاہور کے موقع پر قائداعظم نے جو پیغام دیا اس میں فرمایا۔

''وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی منطقوں میں جو مسلمانوں کے تاریخی وطن رہے ہیں ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا تخیل پیش کیا''(45)

اس پیغام میں انہوں نے علامہ اقبال کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی شامل کر لیا خوش گمان لوگ کہہ سکتے ہیں کہ جب قائداعظم یہ بات کہہ رہے تھے تو اُن کے دماغ میں چوہدری رحمت علی بھی تھے خیر جو کچھ ہو بہر حال اس سے پرستاران اقبال کا وہ دعویٰ کمزور پڑ گیا ہے جو سارا کریڈٹ اقبال اور صرف اقبال کو دے رہے تھے۔ قائداعظم کے قریبی ساتھی ایم اے ایچ اصفہانی نے شاید زیادہ صاف لفظوں میں بات کی انہوں نے ایڈیٹر کے نام خط میں لکھا۔(46)

''اس بات سے بلاشبہ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر اقبال کا فکر، شاعری اور خطبات بھی اسی سمت میں اشارہ کرتے تھے لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے تاریخ کو مسخ کرنا ہے''(46)

خیر جو بھی ہو چوہدری رحمت علی کا مطالبہ پاکستان مسلم لیگ کے گلے پڑ گیا تھا تاہم لفظ پاکستان مسلم لیگی لیڈروں کو ہضم نہیں ہو رہا تھا مسلم لیگ کے ایک لیڈر سر فیروز خان نون نے 1945ء میں گورنر پنجاب سے اپنی ملاقات میں کہا۔

''کاش لفظ پاکستان ایجاد ہی نہ ہوا ہوتا''(47)

---

(44) ''لیٹرز آف اقبال ٹو جناح'' ناشر شیخ محمد اشرف لاہور 1943ء ص 5,4 بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص 484

(45) ''سم ریسنٹ سپیچز اینڈ رائٹنگز آف جناح ج 2 ص 232 (46) ایم اے ایچ اصفہانی کا خط ایڈیٹر کے نام روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ 7 مئی 1967 (47) گورنر پنجاب سے ملاقات مورخہ 27 ستمبر 1945ء بحوالہ ترجمہ ''پاکستان'' حاشیہ از اقبال الدین احمد ص 234

ادھر جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں

''معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان نیشنل موومنٹ کیمبرج تک ہی محدود رہی اس کا نام کبھی مسلم ہند میں سننے میں نہ آیا 48

پچھلی تصریحات آپ دیکھ چکے ہیں انہیں سامنے رکھا جائے تو اچنبھا ہوتا ہے کہ ریٹائرڈ جسٹس صاحب کتنی ناانصافی سے کام لے رہے ہیں۔

چوہدری رحمت علی انتہائی آئیڈیلزم کا شکار انسان تھے انہوں نے عجیب عجیب خواب پالنا شروع کر دیئے تھے جی الانا لکھتے ہیں ''مشہور ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے لندن اور پیرس میں چوہدری رحمت علی سے ملاقات کی تھی اس وقت ان کی عمر تیس (30) سے تجاوز کر چکی تھی انہوں نے کیمبرج اور ڈبلن سے امتیاز کے ساتھ ایم اے بار ایٹ لاء کیا وہ ایک ذہین قانون دان تھے انہوں نے 1933ء میں پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد ڈالی'' 49

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

''خالدہ ادیب خانم نے پوچھا'' متحدہ قومیت کے متعلق کیا خیال ہے؟'' چوہدری رحمت علی نے جواب دیا'' ہم ہندوستانی نہیں پاکستانی ہیں ہندوستان کو متحد کرنا الگ بات ہے اور پاکستان کو غصب کر لینا الگ، لہٰذا متحدہ قومیت کی خاطر اپنی قوم کے نصیبے پر مہر لگا دینا ہماری خوش حالی کے حق میں غداری اپنی تاریخ سے بے وفائی اور انسانیت کے خلاف ایک جرم ہوگا'' 50

ذرا آگے چل کر مصنف مذکور لکھتے ہیں ''چوہدری رحمت علی نے 1940ء میں ایک اور کتابچہ شائع کیا انہوں نے لکھا پاکستان سکیم کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے ہم دوسرا مرحلہ بھی ''بنگا سامستان'' (بنگال' آسام) اور ''عثمانستان'' (حیدر آباد دکن) شروع کریں گے یہ کتابچے اور نقشہ جس میں چوہدری رحمت علی نے مختلف رنگ کی پنسلوں سے لکیریں کھینچی ہیں پاکستان کے قومی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں'' 51

چوہدری رحمت علی کی تحریک کس طرح چل رہی تھی جی الانا لکھتے ہیں

48 ''زندہ رود'' ص 425 49 ''قائداعظم جناح'' ص 364 50 ایضاً ص 366 51 ایضاً ص 372

''خالدہ ادیب خانم نے پوچھا'' تمہاری تحریک حصول پاکستان کے لئے کیا خدمات سرانجام دے رہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا سارے پاکستان میں ہماری تحریک کی شاخیں موجود ہیں ہم کتابچے اور ایک ہفت روزہ'' پاکستان'' شائع کرتے ہیں'' [52]

غرضیکہ چوہدری رحمت علی پورے جوش جنوں کے ساتھ پاکستان سکیم چلا رہے تھے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلم نوجوانوں میں ان کی تحریک سے وابستگی پائی جاتی تھی اور وہ ان کے خوابوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا شاندار ماضی اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ واپس آجائے گا اور اس کی ابتداء آزاد مملکت پاکستان سے ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ چوہدری رحمت علی ہندوستان کی عملی سیاست سے بہت دور تھے نظریاتی باتوں اور عملی دنیا میں بہت فرق ہوتا ہے قائداعظم یہاں عملی سیاست کر رہے تھے انہیں انڈین نیشنل کانگریس جیسی بہت بڑی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا اس جنگ میں تیسرا فریق خود برطانوی حکومت تھی اور معاملات اس کے ہاتھ میں تھے یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ حالات چوہدری رحمت علی کی خواہشات کے مطابق کروٹ بدلتے جائیں مسلم لیگ کو عملی سیاست میں'' کچھ لو کچھ دو'' کے سمجھوتے کرنا پڑ رہے تھے یہ بات چوہدری رحمت علی جیسے جذباتی اور جوشیلے شخص کے لئے ناقابل برداشت تھی چنانچہ وہ قائداعظم کے خلاف ہوگئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''قیام پاکستان سے چندہ ماہ پیشتر معلوم ہوتا ہے کہ چوہدری رحمت علی محمد علی جناح کی قیادت سے بددل ہوگئے تھے یہ وہ مرحلہ تھا جب مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان قبول کیا۔ کے کے عزیز اپنی انگریزی کتاب'' رحمت علی اور اس کی تمام تحریریں'' جلد اوّل کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں کہ چوہدری رحمت علی نے غصہ میں آکر محمد علی جناح کے خلاف ایک کتابچہ تحریر کیا اور اس میں ان پر اس قسم کے ذاتی حملے کئے کہ پمفلٹ کو پڑھنا مشکل ہے یہ کتابچہ بعنوان The Greatest Betrayal ''عظیم ترین غداری'' (ملت کو کس طرح بچایا جائے) حال ہی میں'' بک ٹریڈرز لاہور'' کی طرف سے چوہدری رحمت علی کی تصنیف پاکستان'' (انگریزی) میں شامل کر کے شائع کیا گیا ہے'' [53]

اب انہوں نے قائداعظم کو'' کوئزلنگ اعظم'' لکھنا شروع کر دیا واضح رہے کہ Vidkum

---

[52] ایضاً ص 365 [53] ''زندہ رُود'' ص 425

Quisling ''ناروے'' کا ایک سیاست دان تھا جس پر اپنے ہی لوگوں کے خلاف جاسوسی اور اپنی قوم کے ساتھ غداری کا الزام تھا۔ چوہدری رحمت علی اپنے بیان ''برٹش ورڈکٹ آن انڈیا'' میں لکھتے ہیں۔

''اس بارے میں برٹش بنیا (ہندو) اتحاد کے کچھ نہایت معنی خیز بیانات قابل توجہ ہیں جن میں انہوں نے ایک قسم کے پاکستان "A sort of Pakistan" پر غور کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے یعنی وہ پاکستان نہیں جسے ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' نے دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کی تشریح کی اور جس کا مطالبہ کیا وہ بڑی احتیاط سے کہتے ہیں ایسا پاکستان جسے مسلم لیگ نے اختیار کیا، تشریح کی اور مطالبہ کیا یقیناً یہ صرف ''پاکستان'' سے پرچا دینے کی مکارانہ کوشش ہے چونکہ ''کنگ لنگ اعظم جناح'' کی مہربانی سے پاکستان کی شکل ایسی بدلی ہے کہ پاکستان کے بارے میں مسلم لیگ کا تصور گمراہ کن ہے اور پاکستان جو مسلم لیگ نے مانگا وہ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے اسی لئے برٹش بنیا اتحاد مسلم لیگ سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے'' [54]

چوہدری رحمت علی کے متصورہ یا مفروضہ پاکستان میں ''ک'' کشمیر سے لیا گیا تھا مگر کشمیر الگ ریاست تھی اس کا فیصلہ ہندوستان کی باقی ریاستوں کی طرح ہونا تھا مسلم لیگ اس کا مطالبہ نہیں کر سکتی تھی اس طرح پاکستان سے ''ک'' نکل جاتا تھا اور وہ پاستان رہ جاتا تھا۔ مسلم لیگ کی طرف سے 3 جون کا منصوبہ قبول کر لینے کے ٹھیک چھ روز بعد چوہدری رحمت علی نے قائداعظم کے خلاف تلخ و ترش باتیں شروع کر دیں The Greatest Betrayal میں انہوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کو کھل کر ہدف طنز و تشنیع بنایا اور کہا ملت کے ساتھ شرم ناک غداری کی گئی ہے۔ انہوں نے قائداعظم کو کنگر نگ اعظم کے ساتھ ہندوستان کے مشہور غداروں میر جعفر اور صادق کا ہم پلہ قرار دیا اور کہا جناح نے دس کروڑ مسلمانوں کا مستقبل تباہ کر دیا ہے انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں جناح کا منصوبہ خاک میں ملا دیں کیونکہ اس نے ملت پر چھ مہلک اور جان لیوا چوٹیں لگائی ہیں بنگال اور آسام تقسیم کرائے، دہلی آگرہ اور لکھنؤ جیسے مسلمانوں کی تہذیبی مراکز گنوا دیئے مسلمانوں کے مستحکم قلعے ہندوؤں کے حوالے کر دیئے اس طرح کے فیصلوں سے اس نے مسلمانوں کے شاندار اور فتح مند ماضی

[54] ''پاکستان'' مترجمہ اقبال الدین احمد ص 244

کو تہس نہس کر دیا ہے پوری تاریخ تباہ کر کے رکھ دی ہے اور اب اپنی دغا بازی کا داغ دھونے کی بھرپور کوششیں کر رہا ہے انہوں نے مسلمانان ہند سے کہا ''مرگ ملت کو بطور جشن جناح مناؤ اور تباہی کے افسوس میں ندامت کے ذلت آمیز داغ کو بھی شامل کرلو، پاکستان جسے وہ ''پاکستان'' کہتے تھے اور خود قائداعظم نے بھی جسے Truncated and Mouth Eaten Pakistan (کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان) کہا تھا بن گیا اس پاکستان میں چوہدری رحمت علی بھی آئے۔ مگر کیسے آئے اور کیسے واپس گئے ان کے مداح خاص ایم انور بارایٹ لاء نے تو صرف اتنا لکھا تھا [55]

''چوہدری رحمت علی نے 1937ء میں خالدہ ادیب خانم سے کہا تھا پاکستان ان علاقوں کا مقدر ہے میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا لیکن اس کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا، مگر پاکستان ان کی زندگی میں ہی قائم ہوا اور انہوں نے خود مختار آزاد ریاست کو قائم ہوتے دیکھ لیا وہ 1948ء میں پاکستان آئے لاہور میں کچھ عرصہ گم نامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد نامعلوم وجوہ کی بناء پر انگلستان روانہ ہو گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے 1951ء کے لگ بھگ انگلستان میں انتقال ہوا وہ ووکنگ میں دفن ہیں اور ان کی قبر پر لوح مزار تک نہیں ہے پاکستان کا یہ سپوت وطن سے دور پاکستان کے لئے جدوجہد کرتا رہا اور اپنے وطن سے دور دفن ہے'' [56]

ایم انوار نے واپسی کی وجہ جانتے ہوئے مصلحتاً ''نامعلوم وجوہ'' لکھ دیا اسی ''دروغ مصلحت آمیز'' کے تحت ایم اے کے طلبہ کے لیے تاریخ پاکستان کی نصاب کے مطابق لکھی ہوئی جن کتب کی سفارش کی جاتی ہے ان میں خاصی شاعری کی جاتی ہے کہ چوہدری رحمت علی وطن تشریف لائے کچھ روز آزاد وطن کی آزاد فضاؤں سے لطف اندوز ہوئے آزاد ہواؤں سے مشام جاں کو معطر کیا اور پھر مسرور مطمئن واپس انگلینڈ چلے گئے [57]

---

[55] ایم انور بارایٹ لاء پاکستان نیشنل موومنٹ کے سیکرٹری رہے تھے اور 1941ء میں انگلینڈ کے ہفت روزہ ''گریٹ برٹن اینڈ دی ویسٹ''، میں چوہدری صاحب کے دفاع میں ان کے خطوط بھی چھپتے رہے (پاکستان ص 74) [56] ''دی فارگاٹن ہیرو'' از ایم انور۔ پاکستان ٹائمز لاہور 23 مارچ 1964ء [57] تاریخ پاکستان از اصغر علی اور ایم اے کے لئے لکھی ہوئی دوسری کتب دیکھئے

مگر صورت حال اس سے قطعی مختلف تھی۔ جاوید اقبال صاحب نے اس سے تھوڑا پردہ سرکایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''چوہدری رحمت علی قیام پاکستان کے بعد پاکستان آئے اور یہاں رہائش اختیار کرنے کے لئے جیل روڑ لاہور پر ایک کوٹھی بھی کرایہ پر لی لیکن کسی نے بھی ان کا خیر مقدم نہ کیا بلکہ خفیہ پولیس ان پر نگاہ رکھتی تھی یا ان کا پیچھا کرتی تھی سو وہ یہاں سے واپس کیمبرج چلے گئے'' [58]

چوہدری رحمت علی اصل میں بڑے سیدھے اور سچے انسان تھے انگلینڈ سے انہوں نے اور کچھ سیکھا یا نہ سیکھا یہ ضرور سیکھ لیا کہ بات صاف اور دوٹوک انداز میں کہی جائے اور دل میں جو کچھ ہو اُسے کسی طرح کی منافقت اور ملمع سازی کے بغیر زبان پر لایا جائے۔ انگلستان میں اظہار کی آزادی تھی اور وہ آزادی اظہار میں خاصے بے باک تھے دو باتوں نے اُن کی طبیعت میں سخت ابال پیدا کیا ایک تو یہ کہ اقبال کے اعتراف کے باوجود لوگ بالتکرار پاکستان سکیم کا کریڈٹ اقبال کو دے رہے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کے نزدیک قائداعظم جیتا ہوا کھیل ہار گئے تھے اور ان کے متصورہ پاکستان کا نقشہ چاک کر ابیٹھے تھے یہی نہیں وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ قائداعظم نے انگریزوں کے مفادات کی پاسبانی کی تھی اور انگریز کا ہندو سے گٹھ جوڑ تھا جب وہ لاہور آئے تو ہر وقت قائداعظم کو لعن طعن کرتے رہتے تھے۔ قائداعظم نے اپنی زندگی میں ان کی باتوں کی طرف شاید کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن ''شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار'' مسلم لیگیوں کی حکومت نے اُن پر پاکستان تنگ کر دیا تھا غالباً حالاتِ اس انتہا کو پہنچا دیئے گئے تھے کہ چوہدری رحمت علی نے محسوس کیا اگر وہ اپنے اہل خاندان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اُن لوگوں پر بھی مصیبت آجائے گی اس لئے انہوں نے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے فیصل آباد آ بسنے والے بھائی چوہدری اصغر علی اور بھتیجے چوہدری عبدالستار کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر کرتے ہوئے واپس انگلینڈ چلے جانا بہتر سمجھا۔ وہ انتہائی مایوس اور شکستہ دل واپس چلے گئے۔ وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے اُن کے جن دوستوں نے اُن کے پمفلٹ Now or Never پر دستخط کئے تھے انہوں نے بھی دستخط واپس لے لئے تھے اور اُن سے دور رہنے میں ہی عافیت سمجھنے لگے تھے۔ آخر وہ مرض الموت میں گرفتار ہو گئے اس

---

[58] ''زندہ رُود'' ص425

کسی مپرسی کے عالم میں انہوں نے عمانویل کالج کیمبرج کے پرنسل کو درخواست لکھی جس میں کہا ''میں ایک غریب الوطن آدمی ہوں آپ کے کالج کا اولڈ سٹوڈنٹ ہوں میں ایسے مرض میں مبتلا ہوں کہ میری موت یقینی ہے آپ سے التجا ہے کہ میری موت کے بعد تجہیز و تکفین کے اخراجات کالج برداشت کرے میں مسلمان ہوں اس لئے میری تکفین و تدفین مسلمانوں کے طریقہ سے کی جائے یعنی باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے دیگر شعائر ادا کئے جائیں'' پرنسپل بڑے نیک دل انسان تھے انہوں نے چوہدری صاحب کو نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا اور نوٹس بورڈ پر اشتہار لگا دیا۔ دو مسلمان مصری طالب علموں نے آمادگی ظاہر کی پرنسپل نے انہیں کالج کی طرف سے دوسو پونڈ دیئے انہوں نے اپنی نگرانی میں بڑا مضبوط تابوت بنوایا۔ چوہدری صاحب نرسنگ ہوم میں فوت ہوئے اور پھر انہیں اسی تابوت میں دفن کر دیا گیا آخری ایام میں جو معمر نرس ان کی خدمت کرتی رہی تھیں انہوں نے بتایا تھا کہ یہ مریض بڑا بردبار، شریف النفس اور اعلیٰ درجہ کا مہذب انسان تھا۔ بہرحال چوہدری رحمت علی کس مپرسی کی حالت میں اپنوں سے دور فوت ہو گئے معلوم نہیں پاکستان میں ہوتے تو ان کا کیا حشر ہوتا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

چوہدری رحمت علی کے انتقال کو ساٹھ سال ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان کا جرم معاف نہیں کیا گیا۔ چوہدری شجاعت حسین جب عارضی طور پر وزیراعظم پاکستان بنے تو بعض رحمت علی کے ہمدردوں کی خواہش پر انہوں نے اعلان کیا ''چوہدری رحمت علی کا جسد خاکی 14 اگست 2005ء کو پاکستان لاکر احترام سے دفنایا جائے گا۔ چوہدری رحمت علی کے بھتیجے چوہدری عبدالستار آف فیصل آباد اب مانچسٹر (انگلینڈ) میں تھے خونی رشتہ کی بنیاد پر انہوں نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی حکومت نے تابوت پاکستان منتقل کرنے کی اجازت دے دی لیکن بقول اقبال الدین احمد پاکستانی قوم کے بعض افراد کی کمینگی آڑے آگئی'' اور یہ کام اس وقت کے وزیراعظم سے بھی نہ ہو سکا۔

آج کے تاریخ نویسوں نے یہ تاریخ عوام تک پہنچانی شروع کر رکھی ہے کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبال نے دیا اس تصور کو عملی جامہ قائداعظم نے پہنایا چوہدری رحمت علی نے صرف یہ کیا کہ علامہ

اقبال کے تجویز کردہ ملک کو "پاکستان" کا نام دیا۔ آج کے سیاست دان بھی یہی کہتے ہیں ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کے چیئر مین خواجہ محمد صفدر نے کہا تھا۔

"لفظ پاکستان چوہدری رحمت علی ہی کا وضع کردہ ہے" (59)

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ پاکستان کا لفظ وضع کرنے کی "ٹوپی" بھی چوہدری رحمت علی کے سر پر پرستاران اقبال کو اچھی نہیں لگی انہوں نے یہ بھی علامہ اقبال کے سر پر جمانے کی کوششیں کی ہیں۔ مغربی محققین نے اس موضوع پر تحقیق کی ہے ان کی کوششوں کا ماحصل یہ ہے

"آر ڈبلیو برج فیلڈ شریک مدیر نوٹس اینڈ کیوریز نے مس ری پرومر (جنہوں نے کیولینڈ ال نیوز پیپر ریفرنس لائبریری برٹش میوزیم اور لندن کے دوسرے کتب خانوں میں متعلقہ مواد کی چھان بین کی تھی) جوڈلین لائبریری کی کارپرداز مس جی ایم برگس، سراولف کیرو، ڈاکٹر پرسویل اور عمانویل کالج کے پروفیسر مسٹرای ویل یوان اور دیگر بہت سے محققین کی مدد سے ان ماٰخذ اور اس مطبوعہ مواد کا اچھی طرح جائزہ لیا جو اس اصطلاح پاکستان کے اصلی ماخذ پر روشنی ڈال سکتا تھا تحقیق و تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اصطلاح چوہدری رحمت علی کی وضع کردہ ہے" (60)

مگر "اقبال کا سیاسی کارنامہ" لکھنے والے محمد احمد خان ان محققین کی بات" نام بڑے درشن چھوٹے" کے طنز میں اڑا کر ایک صاحب عبدالوحید خان کی ایک زبانی روایت کا سہارا لے کر اس کی تردید کر دیتے ہیں اور پہلے عبدالوحید خان صاحب کا تعارف لکھتے ہیں۔

"عبدالوحید خان کل ہند مسلم لیگ کی کونسل کے رکن، تحریک پاکستان کے پرجوش علم بردار، قائداعظم کے پرستار اور ہیرو رہے ہیں وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے ہیں اور کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں پاکستان کے مرکزی وزیر مواصلات بھی رہ چکے ہیں انہوں نے علامہ اقبال سے 1935ء میں بھوپال میں ملاقات کی تھی اپنی اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں"

(59) "ولی خان کی غیر مدلل" مہم از خواجہ صفدر مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 19 مئی 1984

(60) نوٹس اینڈ کیوریز Notes and Queries ج 7 شمارہ مطبوعہ اپریل 1960

اس تمہید کے بعد عبدالوحید خان صاحب کی تحریر کا اقتباس آتا ہے اس کا متعلقہ حصہ یہ ہے

''اس پر میں نے آپ سے (یعنی عبدالوحید خان نے اقبال سے) پاکستان کی وجہ تسمیہ کے متعلق دریافت کیا اس زمانے میں اس کا انتساب چوہدری رحمت علی صاحب سے کیا جارہا تھا جو لندن میں اس سکیم کو اسی نام سے متعارد کرار ہے تھے اس پر علامہ اقبال نے مجھے جو جواب دیا اس سے اس نظریہ کی تردید ہوتی تھی اس لئے میں نے مزید وضاحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے میں 1930ء (کتاب میں یہی سن لکھا ہے 1931ء ہونا چاہیے) میں لندن میں مقیم تھا تو ایک مرتبہ چوہدری رحمت علی صاحب میرے پاس آئے اور کہاں جو سکیم آپ نے مسلم لیگ کے الہٰ آباد سیشن کے خطبہ صدارت میں پیش کی ہے اس کے مطابق اگر کوئی حکومت وجود میں آئے تو اس کا نام کیا ہوگا (شاید مصنف حکومت کی بجائے ملک یا ریاست لکھنا چاہتا تھا) اس پر میں نے کہا شمال مغربی ہندوستان کے ہر صوبے کا پہلا لفظ لے لو اور بلوچستان کا تان لے لو تو اتفاق سے ایک بامعنی اور عمدہ لفظ بن جاتا ہے یعنی پاکستان یہی اس حکومت کا نام ہوگا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے ہر صوبہ کا پہلا لفظ اس طرح شمار کیا پنجاب کا ''پ'' آزار قبائل کا ''ا'' کشمیر کا ''ک'' سندھ کا ''س'' اور بلوچستان کا ''تان'' پھر آپ نے فرمایا یہ نام ہو خواہ کوئی دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں ان کو خود حکومت کرنے کا حق ہونا چاہئے'' [61]

دیکھا آپ نے پرستاران اقبال کو یہ بھی گوارنہیں کہ لفظ پاکستان چوہدری رحمت علی کے کھاتہ میں رہنے دیا جائے۔ تاہم میں جاوید اقبال کو یہاں ضرور داد دوں گا کہ انہوں نے اس طرح کی روایات کو مستند نہ سمجھا اور صاف لکھا۔

''ان ہی ایام میں چوہدری رحمت علی نے اپنا انگریزی پمفلٹ ''اب یا کبھی نہیں'' (Now or Never) کیمبرج سے شائع کیا جس میں انہوں نے شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کیا اور اس مسلم ریاست کا نام ''پاکستان'' رکھا چوہدری رحمت علی نے کیمبرج میں پاکستان کے حصول کے لئے پاکستان نیشنل موومنٹ بھی قائم کی [62]

[61] ''تاثرات وتصورات'' از عبدالوحید خان طبع اوّل دسمبر 1960ء ص 62-61 [62] ''زندہ رُود'' ص 419

اور اب تو پرستاران اقبال کی دراز دستیاں انتہاؤں کو چھونے لگی ہیں۔ میں درج ذیل طویل اقتباس من وعن نقل کر رہا ہوں اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو فتح محمد ملک جیسے آدمی، نوائے وقت جیسے موقر جریدہ اور اقبال اکیڈیمی جیسے ادارہ کے لئے بے حد شرمناک ہے اقتباس پڑھئے۔

''اب تو یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ لفظ پاکستان سب سے پہلے اس گشتی مراسلہ میں سامنے آیا تھا جو علامہ اقبال نے ''اب یا کبھی نہیں'' 'Now or Never' کے عنوان سے لکھا تھا' (پروفیسر فتح محمد ملک ''نوائے وقت انٹرنیٹ ایڈیشن 31 اگست 2005 جب کہ اسی ''اب یا کبھی نہیں'' میں صاف درج ہے کہ یہ مطالبہ (مطالبہ پاکستان) اساسی طور پر اس تجویز سے مختلف ہے جو ڈاکٹر سر محمد اقبال نے 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کی تھی۔'' (لائین 112-113) انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک طرف تو فتح محمد ملک کے مطابق پمفلٹ ناؤ ار نیور خود لکھا پھر اقبال خود اسی میں لکھ رہے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تجویز سے مختلف ہے

اس طرح کی تحریر سے اچھے بھلے انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور نقاش پاکستان چوہدری رحمت علی جو انڈیا نزم پر اپنی تحریروں تقریروں کے ذریعے مختلف زاویوں سے تیرونشتر چلا کر اُسے تہس نہس کرتے رہے ان کا وہ کردار ایک بگولے میں گم ہوتا نظر آنے لگتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب فتح محمد ملک نے ''اب یا کبھی نہیں'' کو کبھی پڑھا ہی نہیں ''بھتیجی دوے چاچے نوں تے چاچا دوے بھتیجی نوں'' کے مصداق یہی بات راشدہ ملک نے اسی اخبار کے فروری 2003ء کے ایڈیشن میں لکھی تھی بلکہ اب تو محترمہ نے ان ہی پنڈ تانہ دیو مالائی قصوں اور کہانیوں کا چالیس صفحات پر مشتمل کتابچہ بھی لکھ مارا ہے جسے اقبال اکیڈیمی نے چھپوایا ہے کاش ہماری یہ اکیڈمیاں جن کو عوامی ٹیکسیوں سے کروڑوں روپے کی گرانٹ ملتی ہے۔ ''صرف متبرک گائیوں'' کی ہی دیکھ بھال نہ کریں بلکہ کوئی اور تخلیقی کام بھی کریں میرے ہمسائے کالڑ کا راشد لندن یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد صرف دوسرے دفعہ اپنے آبائی شہر کوٹلی (آزاد کشمیر) گیا اس نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں بولنے والے کو احساس ہوتا ہے جو کچھ وہ کہہ رہا ہے سننے والے کو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے پھر بھی وہ جھوٹ بولے چلا جاتا ہے ہماری اسی تعلیمی حالت کی وجہ سے پاکستان کی ایم اے کی ڈگری رکھنے

والوں کو بھی انگلینڈ میں جی سی ایس سی (میٹرک) سے شروع کرنا پڑتا ہے''[63]

ہم نے کسی تبصرہ کے بغیر یہ اقتباس نقل کر دیا ہے آپ بہر حال اندازہ کر سکتے ہیں کہ غریب چوہدری رحمت علی کے ساتھ کیا ہوتا رہا اور کیا ہو رہا ہے۔ ہم یہاں اپنا طویل مقالہ ختم کرتے ہیں کیونکہ ہم نے بالوضاحت اپنے موضوع پر بحث کر لی ہے اگر آپ نے غیر جانب دارانہ نظر سے اس بحث کو پڑھا ہے تو یقیناً آپ نے وہی نتائج اخذ کئے ہوں گے جو ہمارے نزدیک صحیح اور مبنی بر حقیقت ہیں۔

[63] پیش لفظ ''پاکستان'' از اقبال الدین احمد ص 24-23

اقبال جناح تعلقات

پاکستان کے تاریخ نگاروں نے نئی نسلوں میں بالعموم یہ تاثر راسخ کر دیا ہے کہ علامہ اقبال اور قائداعظم ایک دوسرے کے پروانے تھے اور ان میں ایک قسم کی دوامی وابستگی و پیوستگی تھی مگر یہ تاثر غلط ہے ان حضرات میں اختلافات کی بھی ایک طویل تاریخ ہے آیئے اس تاریخ کا طائرانہ جائزہ لے لیں۔

ذہنی رویے

قائداعظم اور اقبال کی فکری ساخت اور ذہنی رویوں میں بنیادی طور پر اختلاف تھا۔ قائداعظم کا خاندان اہل تشیع کی اسمٰعیلی شاخ سے وابستہ تھا۔ جناح خود آزاد خیال آدمی تھے اور کسی مذہبی فرقہ بندی سے اُن کا کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ آغاز شباب میں انگلینڈ چلے گئے وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی اس لئے ان کی فکر سیکولرازم کی طرف میلان رکھتی تھی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ پوری طرح سیکولر تھے ان کے مقابلہ میں علامہ اقبال نے ایک سنی مذہبی گھرانے میں جنم لیا تھا ان کے والد اور اساتذہ تصوف کی طرف مائل تھے ایم اے کرنے کے بعد وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے وہ اگرچہ اپنے آپ کو سرسید کے حلقہ فکر سے وابستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے اسی وابستگی کے اظہار کے لئے ایک خوبصورت نظم ''سرسید کی لوح تربت'' بھی لکھی ہے جو''بانگ درا'' میں شامل ہے مگر ہمارے خیال میں اُن پر ایک شاعر اکبرؔ الٰہ آبادی کی فکر غالب ہے اکبر ایک منفی ذہن رکھنے والا طنز نگار مزاحیہ شاعر تھا اس نے مغربی تہذیب سے خود بھی سخت نفرت کی ہے اور دوسروں کو بھی یہی سکھایا ہے کہ مغربی تہذیب کو اندھی اور تعصب بھری آنکھوں سے دیکھا جائے اور اس کے روشن پہلوؤں میں بھی تاریک پہلو تلاش

کر کے اپنی اندھی آنکھوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ جن لوگوں نے اقبال کو غیر جانب دارانہ نظروں سے پڑھا ہے وہ اس کی تائید کریں گے کہ ان کی بیشتر شاعری پر حالی کی بجائے اکبر کے اثرات ہیں۔ اکبر نے جو بات مسخرے پن کے ساتھ کہی اقبال نے وہی کچھ سنجیدہ انداز میں اور خوب صورت لفظوں میں کہا۔ قائداعظم پر مغرب کے اثرات میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اعلیٰ درجہ کے جمہوریت پسند سیاست دان بن گئے تھے جب کہ حضرت علامہ محدود مذہبی سوچ کے تحت یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان میں اگر جمہوریت رائج ہوگئی تو ہندو اکثریت مسلمانوں پر غالب آجائے گی اسی احساس نے انہیں جمہوریت کا دشمن بنا دیا۔ گویا ایک چیز جو ان کے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف تھی وہ بذاتہ بری تھی اور ساری دنیا کے لئے بری تھی۔

یہ کوئی مثبت سوچ نہیں تھی۔ ابتداء میں علامہ اقبال نے بھی کچھ عرصہ متحدہ قومیت کا علم تھاما مگر انہوں نے جلد محسوس کر لیا کہ اس سے ایک تو وہ اپنی منفرد حیثیت حاصل نہیں کر سکتے دوسرے یہ ان کی سوچ کے خلاف ہے جس کے تحت مسلمان خدا کی محبوب ترین قوم ہے اور اسے ہر حال میں تمام دنیا پر حکمرانی کرنی ہے اس لئے وہ متحدہ قومیت کو چھوڑ کر ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' کہنے لگے اور یوں وہ مقبولیت حاصل کر لی جو محدود تھی مگر بے مثال تھی اور یہاں کوئی ان کے مقابلہ کا آدمی نہیں تھا۔ قائداعظم مسلمانوں کو ایک ایسے گروہ کی شکل میں دیکھ رہے تھے جنہیں ہندو اکثریت نے حقوق سے محروم کر رکھا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر انہیں الگ ملک مل گیا تو وہ اپنی محرومیوں کا ازالہ کر لیں گے اور خوش حال مستقبل ان کی تقدیر بن جائے گا لیکن اقبال اس میں احیائے اسلام کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح تاریخ کا پہیہ الٹا گھوم جائے گا اور مردہ ماضی زندہ ہو کر ان کا حال درخشاں کر دے گا۔ گویا وہ اسی سراب کے پیچھے بھاگ رہے تھے جس نے شاہ ولی اللہ اور جمال الدین افغانی جیسے لوگوں کو مسحور کئے رکھا تھا غرضیکہ ان دونوں (جناح اور اقبال) میں فکری ہم آہنگی کبھی نہیں رہی تھی۔ آیئے اب ان حقائق کو تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

اختلافات

تحریک ہجرت تھی یا تحریک خلافت، ہمارے نزدیک یہ دونوں تحریکیں بیکار اور غیر دانشمندانہ

تھیں اور انہوں نے مسلمانان ہند کی توانائیاں بھی ضائع کیں اور انہیں معاشی طور پر بھی بڑا نقصان پہنچایا۔تحریک خلافت میں جناح نے بھی حصہ نہیں لیا اور اقبال بھی اس سے الگ تھلگ رہے مگر دونوں نے اس کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا وہ مختلف تھا جناح نے تو مہاتما گاندھی کو صاف الفاظ میں کہہ دیا ''آپ مذہب اور سیاست کو باہم گڈمڈ کرنے لگے ہیں میں اس طرح کی سیاست کو اپنی تائید فراہم نہیں کرسکتا'' مگر اقبال کے پاس اس تحریک سے الگ رہنے کا کوئی ٹھوس جواز نہ تھا اس کی جو باتیں منظر عام پر آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''ترکوں کی خلافت'' کے ذہنی طور پر حامی تھے حالانکہ ترکی خلیفہ کے محکوم تمام مسلمان ممالک اس خلافت سے نجات پانے کی جدوجہد کررہے تھے اس خلافت کے لئے عشق صرف مسلمانان ہند کے دلوں کو تڑپا رہا تھا مہاتما گاندھی نے بھی مولانا محمد علی جوہر،شوکت علی اور دیگر مسلمان لیڈروں کی حمایت میں کانگریس کو تحریک خلافت میں جھونک دیا تھا۔تحریک خلافت میں شامل مسلمان لیڈر میدان عمل میں رہے اور انہوں نے ہر قسم کی قربانیاں دیں مگر اقبال تحریک سے بے تعلق رہے۔ہم اقبال کو دوسروں کی طرح اس بات پر مطعون نہیں کرتے کہ وہ کیوں بے تعلق رہے کیونکہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ہم پوری دیانت داری سے اس تحریک کو غیر دانش مندانہ سمجھتے ہیں ہمیں خوشی ہوتی اگر حضرت علامہ قائداعظم کی طرح اس بے تعلقی کی کھل کر وجہ بیان کردیتے مگر انہوں نے سکوت اختیار کئے رکھا۔اور اُس ہنگامہ خیز دور میں منقار زیر پر ہے ایک نجی خط میں اپنے برادر بزرگ کو لکھا۔

''خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبران بظاہر جوشیلے مسلمان لیکن درباطن اخوان الشیاطین ہیں''[1]

مگر یہ تحریک خلافت کے مقاصد سے اختلاف نہیں صرف بعض آدمیوں کے طرز عمل سے اختلاف ہے ایسے آدمی ہر تحریک میں شامل ہوجاتے ہیں خود اسلام کے پروانوں میں بھی تو منافق شامل ہوگئے تھے پھر یہ بات بھی انہوں نے ایک نجی خط میں کی۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دلی طور پر تحریک خلافت سے ہمدردی ہے چنانچہ جب مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی کو جمہوری ملک بنادیا اور خلافت کا کھڑاک ختم کردیا تو اقبال نے دکھی ہو کر کہا۔

---

[1] ''مظلوم اقبال'' از شیخ اعجاز احمد ص 314

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

گویا تحریک خلافت سے علامہ کی بے تعلقی کسی واضح اختلاف کے باعث نہیں بلکہ اپنی عافیت کوشی کی بناء پر تھی یقیناً ان کے سکوت کو "سکوت مجرمانہ" کہا جا سکتا ہے اس کے برعکس محمد علی جناح نے اسے مذہب اور سیاست کو گڈ مڈ کر دینے سے تعبیر کیا اور اس فعل پر کھلم کھلا کانگریس کو بھی ٹوک دیا اسی سے دونوں کی سوچوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

تحریک ترک موالات تحریک خلافت ہی کا شاخسانہ تھی اس تحریک کے وقت بعض مسلم لیڈر یہ سوچنے لگے کہ کانگریس نے تحریک خلافت میں مسلمانوں سے اتحاد کر کے مسلم لیگ کی اہمیت ختم کر دی ہے اس لئے اسے از سر نو زندہ کر کے مسلمانوں کو احتجاجی سیاست سے نکال کر آئینی سیاست کی طرف آنے کی ترغیب دینی چاہئے چنانچہ آغا خان ایک طرف تو تحفظ خلافت کے حق میں بیان دینے لگے اور دوسری طرف محمد علی جناح کے ذریعہ مسلم لیگ کے احیاء کی کوششیں تیز تر کریں" [2]

معلوم نہیں اس کا کونسا پہلو اقبال کو برا لگا کہ اس نے بقول جاوید اقبال آغا خان اور محمد علی جناح دونوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں
اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادہ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح

[2] "زندہ رُود" ص 258

بشریٰ لکُم کہ منتظر مارسیدہ است
یعنی حجاب غیبت کبریٰ رسیدہ است

(3)

یہ طنزیہ اشعار روز نامہ ''زمیندار'' لاہور 4 نومبر 1921ء میں شائع ہوئے۔ ان اشعار میں سید محمد علی باب کو استعارہ بنا کر محمد علی جناح پر طنز کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آغا خان اور خاص طور پر محمد علی جناح خود انگریزوں کے پیدا کردہ لوگ ہیں یہ وہ علامہ اقبال کہہ رہے تھے جن کے اس دور میں انگریز حکومت کے ساتھ تعلقات کی کہانی ہم ایک اور باب میں بیان کر چکے ہیں۔ بہرحال یہاں سے جناح کے خلاف اقبال کی بیان بازی کی ابتداء ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے 1926ء میں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یونینسٹ پارٹی صوبہ پنجاب کی حد تک محدود انتخابی اتحاد کی حیثیت رکھتی تھی یہ سر فضل حسین نے تشکیل دی تھی اس میں مذہب کا کوئی خاص عمل دخل نہ تھا۔ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ ملک گیر سیاسی جماعتیں تھیں مسلم لیگ کے مرکزی صدر محمد علی جناح تھے 1927ء میں سری نواس آئنگر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے جناح اور آئنگر دونوں مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ دونوں یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی آئینی صورت نکالی جائے کہ ہندوستان اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کو مکمل تحفظ حاصل ہو سکے۔ ہندوؤں کے خیال میں جداگانہ انتخاب ہی فساد کی جڑ تھے ادھر انگریز نے چونکہ بڑی مشکلات کے بعد سیکولرزم کو اپنایا تھا اس لئے وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس دور میں بھی وہ لوگ موجود ہیں جو مذہب کو سیاست کی ڈور تھما دیتے ہیں جداگانہ انتخابات اسی مذہب کو سیاست کا امام بنا دینے کے نظریہ کا شاخسانہ تھا۔

کانگریس کے اکثر اراکین بھی سیکولر سوچ رکھتے تھے اس لئے برطانوی حکومت ان کی تائید کرتی تھی مسلمانوں میں سے اقبال جیسے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی

(3) ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک د''زندہ رُود'' ص 258

ہے چنگیزی'' جناح کے ساتھ وہ کسی طرح متفق مشکل ہی سے ہو سکتے جناح اُس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے مسلم لیگ پنجاب کے صوبائی صدر سر شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال تھے محمد علی جناح نے سری نواس آئنگر کے خیالات سے متفق ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے کچھ قائدین کا ایک اجلاس 20 مارچ 1927ء کو دہلی میں طلب کیا اس میں سر محمد شفیع کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری اور سر محمد یعقوب وغیرہ بھی شامل ہوئے ان قائدین نے سوچ بچار کے بعد وہ تجاویز منظور کیں جنہیں ''تجاویز دہلی کہا جاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کی انتظامی صورت حال یہ تھی کہ صوبہ سرحد 1901ء میں پنجاب سے الگ کیا گیا تھا مگر صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان دونوں دستوری اصلاحات سے محروم تھے۔ سندھ صوبہ بمبئی سے منسلک تھا اور یہ الحاق 1842ء سے چلا آتا تھا حالانکہ بمبئی اور سندھ ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے اور ان کے درمیان ریل کا تعلق بھی نہ تھا۔ ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ''تجاویز دہلی'' پیش کی گئیں اور یہ مطالبات کیے گئے۔

1۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

2۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔

3۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندوں کی تعداد جملہ نمائندوں کے تناسب سے ایک تہائی ہو۔

4۔ اگر مندرجہ بالا تجاویز تمام کی تمام قبول کر لی جائیں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط طریقہ انتخابات قبول کر لیں گے اور جداگانہ حق نیابت سے دستبردار ہو جائیں گے۔

5۔ جو رعایت ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کو دی جائے گی وہی رعایت سندھ، سرحد اور بلوچستان کے مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندو اقلیت کو دی جائے گی۔

ان تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے محمد علی جناح نے اپنے ایک اخباری بیان مورخہ 29 مارچ 1927ء میں کہا۔

''جہاں تک طریق انتخاب کا تعلق ہے وہ خود مقصود بالذات نہیں ہے انتخابات جداگانہ رہے تو کیا مخلوط ہوئے تو کیا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی ہستی کے تحفظ اور بقاء کا پورا یقین ہو جانا چاہئے اور انہیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر

ان کے حقوق پامال نہ کر سکے'' 4

سر شفیع واپس لاہور پہنچے تو علامہ اقبال اور ان کے ہم نواؤں نے تجاویز دہلی کو رد کر دیا اور کہا مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ وجداگانہ انتخاب ہے وہ اس سے کسی طرح دستبردار نہیں ہو سکتے اور اسی بات کو پنجاب مسلم لیگ کا نصب العین بنا دیا گیا چنانچہ یکم مئی 1927ء کو پنجاب مسلم لیگ کا ایک اجلاس برکت علی ہال میں ہوا سر شفیع نے تجاویز دہلی کے خلاف زوردار تقریر کی اور علامہ اقبال نے ان کی تائید میں تقریر کی اور جداگانہ انتخابات کے حق میں قرارداد پیش کی۔ اس طرح مسلم لیگ میں اختلاف کا آغاز ہو گیا جو بڑھتا ہی گیا۔

پنجاب مسلم لیگ کی سیاست اور احمدی خلیفہ بشیر الدین محمود

فرزند اقبال جناب جاوید اقبال لکھتے ہیں ''یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کے دور میں بھی تحریک احمدیہ انگریز حکومت کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ احمدیوں کے نزدیک انگریز کے ساتھ وفاداری کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اس کے خلاف سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا بھی حرام قرار دیا گیا تھا'' 5

مگر ہم یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ پنجاب مسلم لیگ کی سیاست اور خود اقبال کی سیاسی سوچ پر قادیانی خلیفہ بشیر الدین محمود کی رہنمائی غالب نظر آتی ہے 15 فروری 1927ء کو بشیر الدین محمود کا انگریزی میں لکھا ہوا چالیس صفحات کا کتابچہ ''ہندو مسلم پرابلم'' منظر عام پر آیا جس میں اور باتوں کے ساتھ ''جداگانہ انتخاب'' پر زور دیا گیا تھا۔ تجاویز دہلی 20 مارچ 1927ء کو سامنے آئیں جن کی تفاصیل بیان کی جا چکی ہیں ان میں ''جداگانہ انتخاب'' کی بجائے چند شرائط پر مخلوط انتخاب قبول کر لیا گیا تھا۔ پنجاب لیگ کے صدر سر شفیع نے اجلاس میں اس کی مخالفت نہیں کی تھی مگر واپس آئے تو پنجاب کے لیڈروں نے اس سے اختلاف کیا اس اختلاف میں علامہ اقبال پیش پیش تھے سیاست پر مذہب کو غالب رکھنے کا درس بھی خلیفہ بشیر الدین محمود دیتے رہے۔ اس سلسلہ میں اقبال بھی ان کے ہم نوا رہے۔ اب ایک اور تاریخی واقعہ کی طرف آیئے جس نے پنجاب مسلم لیگ اور انڈیا مسلم لیگ میں مزید

4 ''زندہ رُود'' ص 309 5 ''زندہ رُود'' ص 590

فاصلے پیدا کئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جس سے جناح اور اقبال کے فکری فاصلے اور کھل کر سامنے آئے۔

سائمن کمیشن

8 نومبر 1927ء کو حکومت برطانیہ نے ''سائمن کمشن'' کے تقرر کا اعلان کیا یہ کمشن تمام انگریز ارکان پر مشتمل تھا اس کا کام یہ بتایا گیا کہ یہ شہادتیں لے کر مختلف تجاویز اکٹھی کرے گا اور پھر ہندوستان کے لئے دستوری اصلاحات کے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے گا۔ کانگریس کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی لیڈروں کو بھی اس پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں ہندوستان کا کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا چنانچہ کانگریس نے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر بھی بائیکاٹ کے حق میں تھے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے کمشن سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس پر بشیر الدین محمود نے 16 دسمبر 1927ء کو ''مسلمانان ہند کے امتحان کا وقت'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا اس میں کمشن سے تعاون کرنے کا مشورہ دیا گیا اور کہا گیا ''کمشن سے مقاطعہ کا اثر زیادہ تر مسلمانوں پر پڑے گا۔ ہندوؤں کے لیڈر برابر آٹھ سال سے گرمیوں میں انگلستان جاتے ہیں اور بڑے بڑے انگریزوں سے ہندوؤں کے فائدہ کی باتیں کر کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں اس طرح وہ کوشش کر کے پارلیمنٹ کے ممبروں کو ہندوستان میں لاتے ہیں اور ہندوؤں کے گھر مہمان ٹھہراتے ہیں مگر مسلمانوں کے پاس نہ دولت ہے نہ ان کے اندر قربانی کا مادہ چنانچہ وہ آٹھ سال کے عرصہ میں بالکل سوتے رہے ہیں اور صرف اس سال عزیزم چوہدری ظفر اللہ خان احمدی اور ڈاکٹر شفاعت احمد صاحب بیرسٹر ممبر یو پی کونسل اس غرض سے ولایت گئے تھے اور انہیں بڑے بڑے آدمیوں نے کہا کہ ہمیں تو آج معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی جداگانہ حفاظت کی ضرورت ہے ورنہ ہم تو یہ خیال کرتے تھے کہ ہندو لیڈر جو باتیں کہتے رہے ہیں۔ مسلمان ان سے متفق ہیں۔ ورنہ مسلمان کیوں نہ آ کر ہم سے اپنے حقوق کے متعلق بحث کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریز ہندوستان کے مطالبات وہی سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کی طرف سے بتائے جاتے ہیں اور مسلمان اس امر کو یاد رکھیں کہ اگر (سائمن کمشن کا بائیکاٹ ہوا تو کمشن جو رپورٹ کرے گا وہ اپنے علم کی بناء پر کرے گا اور وہ الف سے لے کر ی تک ہندو لیڈروں کا دیا ہوا ہو گا'' [6]

اس کے بعد نمبر وار وہ مطالبات درج کئے گئے ہیں جنہیں ''سائمن کمشن'' کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے۔ پنجاب مسلم لیگ نے مرکزی لیڈروں کے خلاف سائمن کمشن کے سامنے پیش ہونے کا فیصلہ کیا اور من وعن وہی مطالبات پیش کئے جو احمدی امام نے الفضل میں لکھے تھے۔ علامہ اقبال نے بحیثیت سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ اخبارات کو ایک بیان جاری کیا جس میں واضح کیا گیا۔

''پنجاب مسلم لیگ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کامل غور خوض کے بعد ایک قرار داد منظور کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ کمشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطہ نگاہ سے علی الخصوص نقصان رساں ہوگا میرے خیال میں یہ قرار داد پنجابی مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ ہے۔۔ اس ملک کی قلیل التعداد جماعتوں کو رائل کمشن سے بڑھ کر اپنے اندیشے، اپنی امیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اور کوئی موقع نہیں مل سکتا میری رائے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی تہذیبوں کے مطابق نشوو ارتقاء حاصل کریں۔ یہ مقصد حاصل ہونا چاہئے خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعہ سے جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے'' [7]

ہزار محبت کے باوجود انڈین نیشنل کانگریس اور مرکزی مسلم لیگ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری علامہ اقبال کی یہ بات مولانا محمد علی جوہر کو بالخصوص پسند نہ آئی اور انہوں نے کہا۔

''سرمحمد شفیع سے بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں انہوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے یہ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سرمحمد اقبال جیسے لیڈر سرمحمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزاد خیالی کی سطح تک ابھار کر نہ لا سکے برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سرمحمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر آ گئے ہیں چنانچہ کمشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری (علامہ اقبال) کا بیان اس کے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چاپلوسی کا ہے پنجاب حقیقتاً اچھے لوگوں کا خطہ ہے مگر ان کی رہنمائی صحیح طور پر نہیں کی جاتی'' [8]

محمد علی جناح نے بعض دیگر لیڈروں کے ساتھ مل کر کمشن کی تشکیل پر اعتراض کیا تھا اور

[6] ''الفضل'' 16 دسمبر 1927ء بحوالہ تبصرہ ص 196 [7] ''گفتار اقبال'' از محمد رفیق افضل ص 53-52

مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ اس کا بائیکاٹ کیا جائے اقبال نے 8 دسمبر 1927ء کو جناح کے بیان کو براہ راست ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا۔

''چندروز ہوئے مسٹر جناح اور چند ایک دیگر سر برآوردہ اشخاص نے ایک اعلان شائع کیا تھا جو ملک کے موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے پریشان کردینے والی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے اس اعلان میں اس حقیقت عظمیٰ کو نظرانداز کردیا گیا کہ رائل کمشن موجودہ تاسف زار حالات ہی کی پیداوار ہے۔ ہم نہایت عاجزی سے اپنے اہل وطن کو بالعموم اور مسلمان بھائیوں کو بالخصوص متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاطعہ کی لاحاصل روش اختیار کرنے سے جیسا کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں نے تجویز کی ہے افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے اُن حقوق کا تحفظ کرلیں جو ہندو ہمیں دینے سے انکار کررہے ہیں جن مسلمانوں نے مسٹر جناح کے اعلان پر دستخط کئے ہیں ان میں سے بعض تو ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ان کی روش پنجاب اور بنگال ایسے صوبے کے مسلمانوں کی حکمت عملی کو تبدیل یا وضع نہیں کرسکتی ہمارا صاف اور غیر مبہم رویہ اس خیال پر قائم ہے کہ ملک کی اکثریت سے اپنے منصفانہ حقوق کے حصول میں ناکام رہ کر ہم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایسا قیمتی وقت ضائع کرنا ہمارے اہم مفاد کے منافی ہوگا۔ ہندوؤں کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ باہمی اختلافات کے تصفیہ کے معاملات کو مزید التواء میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ ہم نہایت جرات اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کرایہ کے ٹٹو بننے کے لئے تیار نہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑالیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وار جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جاسکتیں تدبر کا اقتضاء یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں'' 9

غرضیکہ علامہ اقبال جداگانہ انتخابات کی مانگ پر ڈٹے ہوئے تھے کیونکہ وہ سیاست کی باگیں مذہب کو تھما دینے کے قائل تھے اور اسی سوچ نے انہیں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی شاعر بنا رکھا تھا۔

---

8 ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان ص 170 ''زندہ رُود'' ص 317 9 ''گفتار اقبال'' از رفیق افضل ص 53-56

آل انڈیا مسلم لیگ کے کسی باقاعدہ اجلاس میں اب تک ''تجاویز دہلی'' کی توثیق نہیں کی گئی تھی اس مقصد کے لئے لیگ کا سالانہ اجلاس سر محمد یعقوب کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا جس پر اقبال نے سر فیروز خان کے معیت میں ایک بیان جاری کیا۔

''کلکتہ میں اجلاس منعقد کرنے کی وجوہ کچھ اور ہی ہیں وہ نہیں جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جا رہے ہیں اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتہ میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق تجاویز دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی نسبت بہت زیادہ ہے کیونکہ مسلمانان پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں'' ⑩

اس طرح 19 دسمبر 1927ء کو اقبال نے نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہمراہ محمد علی جناح کے اس بیان پر جو انہوں نے تجاویز دہلی کی وضاحت میں دیا تھا تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر جناح اور ان کے رفقاء نے بدقسمتی سے قومی زندگی کی ایسی حالت کا تصور کر رکھا ہے جو حقیقت میں مفقود ہے۔ مسٹر جناح کو بخوبی معلوم ہے کہ تقرر کمشن کا اعلان ہونے سے پہلے مسلمانوں نے متعدد مرتبہ اکثریت سے درخواست کی کہ باہمی اختلافات کا تصفیہ کرائیں۔ اس تماشا میں مسٹر جناح چیف ایکٹر رہے ہیں کیا وہ ہم کو بتلا سکتے ہیں کہ ان کو کبھی ہندوؤں کی جانب سے سوائے سخت ہٹ دھرمی کے اور کوئی جواب ملا ہے۔ ہمیں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے مسٹر جناح اور ان کے دوست ہم کو اپنے مفاد کے لئے مورد طعن و تشنیع نہ بنائیں'' ⑪

سر شفیع گروپ کے سوا سائمن کمشن کو کسی نے اہمیت نہ دی۔ ''تجاویز دہلی'' پر سر شفیع گروپ جناح لیگ سے الگ ہوا تھا پھر یہ مخالفت بڑھتی گئی ''تجاویز دہلی'' میں جناح نے مشروط طور پر مخلوط انتخاب قبول کر کے مسلم لیگ کے ایک حصہ کو اپنا مخالف بنا لیا تھا یہ جناح کی اُسی کوشش کے تسلسل کی کوشش تھی جس میں مسلم لیگ اور کانگرس کو متحد ہو کر آزادی حاصل کرنے کی پالیسی کو استحکام ملتا تھا مگر کانگریس نے تجاویز دہلی کی طرف سے بے اعتنائی برت کر سیاسی حماقت کی اور جناح کی کوششوں پر پانی پھیر دیا ان ہی حالات میں موتی لال نہرو کی سربراہی میں کام کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ سامنے آئی جسے نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے۔ جس وقت یہ رپورٹ سامنے آئی اس وقت جناح یورپ گئے ہوئے تھے

⑩ ایضاً ص 57 ⑪ ایضاً ص 63

اس رپورٹ میں ''تجاویز دہلی'' کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا تھا نتیجتاً مسلمان کانگریس کے اور زیادہ مخالف ہو گئے تھے۔ جناح نے یوروپ سے واپسی پر کھلے ذہن سے کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ حریف کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ ہوں۔ انہوں نے کانگریس سے کہا کہ وہ اپنی رپورٹ میں بعض تبدیلیاں کرے اور ''تجاویز دہلی'' قبول کر لے مسلمانوں سے بھی انہوں نے اپیل کی کہ وہ تجاویز دہلی میں متفق ہو جائیں انہوں نے کانگریس سے کہا۔

''اکثریت من مانی کرنے کا اور جبر کا رجحان رکھتی ہے اقلیت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ ان کے حقوق اور مفادات کو پس پشت ڈال دیا جائے گا تا آنکہ واضح قانونی تحفظ نہ دیا جائے اگر کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتہ نہ ہوا تو اس کا نتیجہ باہمی خانہ جنگی کی صورت میں رونما ہوگا (12)

جناح نے کلکتہ پہنچ کر کانگریس کو یہ کہا تھا سپر ولبرل انداز فکر رہتے تھے انہوں نے کانگریس کو مشورہ دیا ''جناح جو کچھ اس وقت مانگ رہا ہے اُسے قبول کر لیں اور اس قضیے کو ختم کریں'' (13)

مہاتما گاندھی نے جناح سے کہا ''میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے پر تیار ہوں مگر سکھوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ اگر نہرو رپورٹ میں مزید نکات شامل کئے گئے تو وہ معاہدہ کے پابند نہیں ہوں گے'' (14)

کانگریس کو سکھوں کی ناراضگی کا اندیشہ تھا مگر مسلمانوں کا خیال اس لئے نہ تھا کہ مسلمان متحد نہیں تھے ادھر ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد گروپ نہرو رپورٹ کو تسلیم کر چکا تھا اور کانگریس کے رہنما سمجھتے تھے مسٹر جناح کی آواز ہندوستانی مسلمانوں کی متفقہ آواز نہیں کانگریس کی بے نیازی سے مسٹر جناح ناراض ہو گئے۔ ان کے ایک پارسی دوست جمشید نوشیرواں جو بعد میں کراچی کے میئر بنے اس اقدام کے متعلق لکھتے ہیں۔

''مسٹر جناح کھڑے ہو گئے انہوں نے فیشن ایبل سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو وہ انگلستان سے لے کر آئے تھے انہوں نے جو درخواست کی تھی وہ مسترد کر دی گئی تھی ایک شخص نے یہاں تک کہا تھا مسٹر جناح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق حاصل نہیں وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں

---

(12) ''مڈل فیس آف دی مسلم پولیٹکل موومنٹ'' از جمیل الدین احمد ص 94 (13) ایضاً ص 95 (14) ''قائداعظم جناح'' از جی اے الانا ص 213

کرتے مسٹر جناح غم زدہ ہوکر اپنے ہوٹل چلے آ ۓ۔اگلے روز وہ کلکتہ سے ٹرین کے ذریعے روانہ ہو گئے میں ان کو خدا حافظ کہنے کے لئے گیا وہ فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازہ پر کھڑے تھے انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا ان کی آنکھوں میں آنسو لہرا گئے انہوں نے دکھی آواز میں کہا ''جمشید ہمارے رستے جدا ہو گئے ہیں'' (15)

''تجاویز دہلی'' کی ہندوؤں اور سکھوں نے بھی مخالفت کی تھی اور مسلم لیگ کے سر شفیع گروپ نے بھی مخالفت کی تھی اگر چہ ان دونوں قسم کی مخالفتوں کی وجوہ مختلف اور باہم متضاد تھیں غرضیکہ کانگریس کے زعماء کے نزدیک یہ کسی طرح قابل قبول نہیں تھیں جناح عجیب صورت حال سے دوچار تھے ان کا ''سفیر اتحاد'' کا امیج تباہ ہو گیا تھا۔ وہ نہ ادھر کے رہے تھے نہ ادھر کے، مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی لکھتے ہیں۔

''1929ء میں گاندھی جی نے دوبارہ جناح سے گفتگو کی لیکن سمجھوتہ کی راہ نہ نکل سکی مسلمانوں کے مختلف گروہ دہلی میں جمع ہوئے اور مسلمان قوم کی پوزیشن واضح کی اس کنونشن کے محرک سر شفیع اور چیئر مین سر آغا خان تھے۔ جناح نے اس میں شرکت نہ کی انہوں نے شفیع کے مسلم لیگ کو تقسیم کرنے کے جرم کو معاف نہیں کیا تھا لیکن سیاست سے اس بے تعلقی کی مدت مختصر ثابت ہوئی۔ جناح مسلمانوں کے قومی سیاسی دھارے میں واپس آ گئے دہلی کنونشن کے فیصلوں کو چودہ واضح مطالبات کی شکل دی یہ جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہو گئے'' (16)

سر شفیع گروپ کے سیکرٹری جنرل علامہ اقبال تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے ہی جداگانہ انتخابات پر اصرار کیا تھا اس طرح جناح گروپ اور شفیع گروپ کی بنائے اختلاف اقبال ہی کا نظریہ تھا۔ اس طرح جناح اور علامہ اقبال میں اس وقت تک نظریاتی اختلاف تھا۔ مگر فرزند اقبال جاوید اقبال صاحب نے یہاں ایک خط کا اقتباس درج کیا ہے وہ اقتباس آپ بھی دیکھ لیجئے جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں۔

---

(15) ''جناح کری ایٹر آف پاکستان'' از ہیکٹر بولیتھو ص 95 (16) ''انڈرسٹینڈنگ مسلم مائینڈ'' از راج موہن گاندھی باب ''جناح'' ص 201

''(جناح اور اقبال میں جو ہم آہنگی پیدا ہوئی) اس کا اعتراف محمد علی جناح نے اپنے خط بنام انعام اللہ خان محررہ 16 مئی 1944ء میں کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں'' 1929ء سے میرے اور سر محمد اقبال کے نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہ ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے جنہوں نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی کی اور آخر دم تک مضبوطی سے میرے ساتھ کھڑے رہے'' [17]

ہم نے یہ اقتباس پڑھا تو چونک گئے کیونکہ یہ انوکھی بات مسٹر جناح سے منسوب کی گئی تھی اور تاریخ کی پوری طرح تکذیب کر رہی تھی مگر خدا بھلا کرے جاوید اقبال صاحب کا کہ انہوں نے بلوگرافی میں اس کا ماخذ بھی درج کر دیا تھا وہاں لکھا گیا ہے۔

''یہ خط اخبار میں چھپ چکا ہے اور راقم کے پاس اس کا تراشہ موجود ہے لیکن اخبار کے نام اور تاریخ اشاعت کا اندراج سہواً رہ گیا'' [18]

یعنی تراشہ موجود ہے مگر اخبار کا نام اور تاریخ اشاعت لکھنا جاوید اقبال صاحب بھول گئے تھے یہ دیکھ کر ہماری پریشانی دور ہو گئی آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بات تاریخ نہیں بن سکتی۔ ایسے لاکھوں ''تراشے'' موجود کئے جا سکتے ہیں۔

آگے چل کر جاوید اقبال صاحب بتاتے ہیں کہ مسلم لیگ کے دونوں گروپوں میں اتحاد اس وقت عمل میں آیا جب مسٹر جناح نے چودہ نکات پیش کئے اب برطانوی حکومت گول میز کانفرنس کا انعقاد کرنے لگی 13 جولائی 1930ء کو لیگ کونسل اجلاس طلب کیا گیا تا کہ مسلم نمائندگان متحد ہو کر گول میز کانفرنس میں اپنے مطالبات پیش کر سکیں۔ لیگ کونسل کے اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ لیگ کا اجلاس عام 17 اگست 1930ء کو لکھنؤ میں منعقد کیا جائے محمد علی جناح نے اجلاس کی صدارت کے لئے اقبال کا نام پیش کیا جسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا بعد میں محمد علی جناح نے اقبال سے رابطہ کیا اور وہ بھی اجلاس کی صدارت کے لئے رضامند ہو گئے مگر بقول سید شمس الحسن یہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا کیونکہ سر فضل حسین پنجاب سے اپنی مرضی کے نمائندے بھجوانا چاہتے تھے اور اگر اقبال لیگ کے اجلاس کی صدارت کر لیتے تو انہیں گول میز کانفرنس میں بلانا حکومت کے لئے ضروری ہو جاتا۔ سر فضل حسین کے حمایتی

---

[17] ''زندہ رُود'' ص 328 [18] ''زندہ رُود'' ص 680

لیگ کا اجلاس ملتوی کرانے کے درپے تھے لیکن کونسل کے اراکین اجلاس ملتوی نہیں کرنا چاہتے تھے یہ باتیں درج کر کے جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں'' بہر حال اقبال نے خود ہی اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست کی جو لیگ کونسل نے منظور کر لی''[19]

جاوید اقبال صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ خود اقبال نے کیوں التواء کی خواہش کی تاہم ہمارا خیال ہے کہ چونکہ ان دنوں ان کے والد شیخ نور محمد مرض الموت میں گرفتار تھے اور اقبال کو بار بار سیالکوٹ جانا پڑتا تھا اس لئے انہوں نے التواء کے لئے درخواست کی ہوگی۔ جاوید اقبال صاحب نے اس بیان سے یہ تاثر پختہ کیا ہے کہ اب سر شفیع گروپ اور جناح گروپ یک جان دو قالب ہو گئے تھے مگر واقعات سے پوری طرح اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ اگر ایسا ہو چکا ہوتا تو گول میز کانفرنس میں جناح اس طرح تنہا نہ ہوتے جس طرح درج ذیل بیانات سے واضح ہوتا ہے گول میز کانفرنس میں جناح کی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے'' مانچسٹر گارجین'' نے لکھا۔

'' گول میز کانفرنس میں مسٹر جناح انوکھی پوزیشن کے مالک تھے۔ ہندوؤں کا خیال تھا وہ فرقہ واریت کا شکار ہو گئے ہیں مسلمان انہیں ہندوؤں کا حامی سمجھتے تھے رجواڑوں کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور انگریز انہیں انتہا پسند سمجھتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھے''[20]

قائداعظم کے خاص سوانح نگار جی الانا یہ اقتباس نقل کر کے آگے لکھتے ہیں۔

'' سر شوستر سے ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ 1930 کی گول میز کانفرنس میں جناح بری طرح ناکام رہے حتیٰ کہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک وہ ہندوستان واپس آنے پر آمادہ نہ تھے''[21]

اگر جاوید اقبال صاحب کی بات مان لی جائے تو مسٹر جناح اور سر شفیع ایک ہو گئے تھے جناح اس گروپ کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکے تھے اور یہ ہم آہنگی اس حد تک ہو گئی تھی کہ انہوں نے خود لیگ کے اجلاس کے لئے اقبال کا نام برائے صدارت پیش کیا تھا تو پھر وہ کس لئے سیاست سے اتنے کنارہ کش

---

[19] ایضاً ص 333 [20] '' قائداعظم جناح'' از جی الانا ص 286 [21] ایضاً ص 297

ہو گئے کہ ہندوستان چھوڑ کر انگلینڈ میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ان سوالات کا جاوید اقبال صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے ممتاز راہنماؤں کی قیادت سر آغا خان کے ہاتھ میں تھی جناح جو کافی عرصہ ہندوستان میں سیاست کر چکے تھے اور سیکولر ذہن رکھتے تھے اب وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئے تھے انہوں نے ہندوستان سے اور یہاں کی سیاست سے ہاتھ اٹھا لیا اور انگلستان میں رہ کر پریوی کونسل میں ہندوستانیوں کے مقدمات کی وکالت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکرام لکھتے ہیں۔

''آکسفورڈ میں انہوں نے ایک مسلمان طالب علم سے کہا

''ہندو بہت کم نظر ہیں اور میرا خیال ہے وہ نا قابل اصلاح ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان ابن الوقت قسم کے لوگوں کی بھرمار ہے جن کا کوئی اصول نہیں وہ ڈپٹی کمشنر کے اشارہ ابرو پر رقص کناں رہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں میرے جیسے انسان کے لئے جگہ کہاں ہے'' [22]

مسٹر جناح نے ہندوستان کی سیاست کے خارزاروں سے دور ''ہیم سٹیڈ (Hampstead) میں ایک آرام دہ مکان لے لیا کامیاب وکالت کرنے لگے اور پر سکون زندگی گزارنے لگے ان کی بہن فاطمہ ان کے پاس آ گئی اور اس نے گھر کا کام سنبھال لیا جناح کی اکلوتی بیٹی دینا نے ایک انگریزی بورڈنگ سکول میں داخلہ لے لیا تھا اور اپنی چھٹیاں ان کے ساتھ گزارنے آ گئی تھی۔ ان کی وکالت عروج پر تھی چھٹی کے روز وہ اپنی بہن اور بیٹی کو ساتھ لے کر خوب صورت مناظر دیکھنے چلے جاتے ان کی زندگی ہندوستان سے زیادہ راحت بخش اور پر سکون ہو گئی تھی اس دوران ہندوستانی مسلمان زعماء انہیں دعوت دیتے کہ وہ واپس آ کر سیاست میں مسلمانوں کی قیادت کریں مگر وہ آمادہ نہ ہوتے ان زعماء میں بعد عبدالمتین چوہدری بھی تھی جی الانا لکھتے ہیں۔

''عبدالمتین چوہدری نے قائداعظم سے ہندوستان واپس آ کر مسلمانوں کی قیادت کا بار سنبھالنے اور انہین متحد کرنے کے لئے کوشش کرنے کی درخواست کی چوہدری صاحب نے یہ بھی لکھا مسلمانوں کی اکثریت آپ کی واپسی کی خواہاں ہے اس کے جواب میں قائداعظم نے 27 اپریل

---

[22] ''ماڈرن مسلم انڈیا'' از اکرم ص 172

1933ء کولکھا ''مجھے ہندوستان بلایا جارہا ہے مگر کس لئے؟ وہاں کوئی ٹھوس چیز موجود نہیں'' [23]

انہیں واپس لانے کے لئے بہت سی کوششیں ہوئیں۔ اس سلسلہ میں مختلف نام لئے جاتے ہیں ان میں سے کچھ نام بھی دیکھ لیجئے۔ سید مطلوب الحسن لکھتے ہیں سر حاجی ہارون نے قائداعظم کو لکھا تھا۔

''ہم سب آپ کی کمی شدت سے محسوس کررہے ہیں'' [24]

انہیں واپس آنے کی دعوت دینے والوں میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ مدراس کی جسٹس پارٹی کے سربراہ اے بی پترہ نے انہیں لکھا۔

''مسلمانوں کے درمیان کوئی بھی مثالی قائد موجود نہیں لیفٹیننٹ تو بہت ہیں لیکن جرنیل کوئی بھی نہیں اس حقیقت کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ آپ ہندوستانیوں کو متحد کرنے کے لئے انتہائی مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ سازشوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ہم آپ کی غیر موجودگی شدت سے محسوس کررہے ہیں'' [25]

بالآخر کس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اس سلسلہ میں بھی مختلف نام آتے ہیں ایک دو آپ بھی دیکھ لیجئے۔ احمدیوں کے ایک عالم عبدالرحیم درد کہتے ہیں ''یہ بھی حضور ایدہ اللہ تعالیٰ (یعنی احمدیوں کے خلیفہ بشیرالدین محمود) کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ قائداعظم نے انگلستان سے ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی سیاسی قیادت سنبھالی اس طرح بالآخر 1947ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا جب میں 1933ء میں امام مسجد لندن کے طور پر انگلستان پہنچا تو اس وقت قائداعظم انگلستان میں ہی سکونت رکھتے تھے وہاں میں نے ان سے تفصیلی ملاقات کی اور انہیں ہندوستان واپس آکر سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کیا مسٹر جناح سے میری یہ ملاقات تین چار گھنٹے تک جاری رہی میں نے انہین آمادہ کرلیا کہ اگر اس آڑے وقت میں جب کہ مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والا اور کوئی نہیں ہے انہوں نے ان کی پھنسی ہوئی کشتی کو پار لگانے کی کوشش نہ کی تو اس قسم کی علیحدگی قوم کے

---

[23] ''قائداعظم جناح'' از جی الانا مترجمہ رئیس امروہوی ص 299 [24] ''محمد علی جناح۔ اے پولیٹیکل سٹڈی'' از مطلوب الحسن سید بحوالہ مقالہ ''اقبال مستقبل شناس'' مشمولہ ماہ نو اقبال نمبر نومبر 2002ء ص 205 [25] ''مسلم سپریشن ان انڈیا'' از ڈاکٹر عبدالمجید بحوالہ ایضاً ص 306

ساتھ بے وفائی کے مترادف ہوگی چنانچہ اس تفصیلی گفتگو کے بعد آپ مسجد احمدیہ لندن میں تشریف لائے اور وہاں باقاعدہ ایک تقریر کی جس میں ہندوستان کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔اس کے بعد قائداعظم انگلستان کو خیر باد کہہ کر ہندوستان واپس آئے اور اس طرح چند سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان معرض وجود میں آیا'' (26)

مشہور صحافی اور علامہ اقبال کے عقیدت مند خاص ''م ش'' نے بھی عبدالرحیم درد کے بیان کی تصدیق کی انہوں نے لکھا۔

" It was Mr. Liaquat Ali Khan and Maulana Abdul-Rahim Dard, an Imam of London Mosque who Per suaded Mr. M.A.Jinnah to change his mind and return (27)home to play his role in national politics "

ترجمہ: یہ لیاقت علی خان اور لندن مسجد کے امام مولانا عبدالرحیم درد تھے جنہوں نے مسٹر ایم اے جناح کو وطن واپس آکر قومی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے پر اور لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کیا۔

راج موہن گاندھی اسے اکیلے لیاقت علی خان کا کارنامہ قرار دیتے ہیں انہوں نے یہ تفصیل لکھی ہے۔

''جولائی 1934ء میں 37 سالہ لیاقت علی خان یوروپ میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہنی مون منا رہے تھے وہ اپنی دلہن کے ساتھ ''ہیمپ سٹیڈ ہاؤس'' پہنچے بیگم لیاقت علی خان کا کہنا ہے کہ اُن کے شوہر کا خیال تھا کہ جناح ہی ایسے شخص ہیں جو مسلم لیگ اور مسلمانوں کو بچا سکتے ہیں لیاقت اور ان کی بیگم نے جناح پر زور دیا کہ وہ ہندوستان واپس آجائیں جناح نے کہا ''میں ہیمپ سٹیڈ میں سکون واطمینان کی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں'' لیاقت علی خان نے اپنے دلائل دہرائے پھر ایک

(26) ''تبصرہ برزندہ رُود'' از شیخ عبدالماجد ص 67-566 (27) پاکستان ٹائمز سپلیمنٹ 11 مورخہ گیارہ ستمبر 1981 کالم نمبر 1

عشائیہ کے طویل دورانیہ کے اختتام پر جب بیگم لیاقت سوچ رہی تھی کہ جناح کو کوئی قائل نہیں کرسکتا۔ اچانک جناح نے کہا'' آپ واپس جاکر حالات کا جائزہ لیں تمام ملک کے احساسات معلوم کریں اس کے بعد اگر تم نے واپس آنے کا کہا تو میں واپس آجاؤں گا۔ [28]

لیاقت علی خان نے ہندوستان آکر بڑی باریک بینی سے حالات کا جائزہ لیا سیاسی فضاء کو پرکھا مسلمان رہنماؤں سے بات چیت کی اور پھر جناح کو لکھا کہ ارباب سیاست کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کو جناح کی ضرورت ہے سیاسی فضا بڑی سازگار ہے مسٹر جناح نے اپنا مکان فروخت کردیا فرنیچر وغیرہ بیچ دیا اور بہن کو ساتھ لے کر ہندوستان آگئے۔

محبان اقبال کے نزدیک ضروری تھا کہ جناح کو واپس ہندوستان لانے کو بڑا کارنامہ سمجھا جائے اور یہ کارنامہ سرانجام دینے کا سہرا بھی اقبال کے سر پر سجا دیا جائے۔ یہ کام علامہ غلام احمد پرویز نے اپنی پرزور تحریروں اور دل کش الفاظ کے برمحل اور خوب صورت استعمال سے سرانجام دیا۔ علامہ پرویز اقبال اور جناح دونوں کے قریب رہے تھے میں یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب کا مقام اقبال فہمی میں بہت بلند ہے انہوں نے ماہنامہ ''طلوع اسلام'' اور اپنی تصانیف کے ذریعہ اقبال شناسی کے لئے بڑا وقیع کام کیا ان کا انداز نگارش بھی بڑا دل ربا اور پراثر تھا وہ ڈپٹی سیکرٹری ریٹائر ہوئے سیکرٹریٹ میں عمر گزاری اور انہیں کسی حد تک قائداعظم کا قرب بھی حاصل رہا انہوں نے اپنی معجز نما تحریروں سے اقبال اور جناح کو ایک دوسرے کا پروانہ ثابت کرنے میں بڑا زور صرف کیا مجھے ان سے محبت ہے اور اسی محبت کے باعث مجھے زیادہ افسوس ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انہوں نے انصاف نہیں کیا بلکہ تاریخ بگاڑتے بھی رہے۔ ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے بیشتر صفحات اس امر کے گواہ ہیں۔ ''طلوع اسلام'' کا ایڈیٹوریل ''لمعات'' کے عنوان سے اکثر اوقات وہ خود تحریر فرماتے تھے۔ یا یہ اُن کی سابقہ تحریروں سے ماخوذ ہوتا تھا اب ذرا ''طلوع اسلام'' کی متعلقہ موضوع پر ''رہنمائی'' ملاحظہ کیجئے۔ لکھا ہے۔

''اقبال بایں ہمہ بالغ نظری، اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ اپنی حدود استطاعت

[28] ''انڈرسٹینڈنگ مسلم مائینڈ'' ص 207

سے بخوبی واقف تھا وہ جانتا تھا کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جس قسم کی قائدانہ سیاسی اور تنظیمی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی ضرورت ہے یا تو وہ ان کا حامل نہیں اور یا اس کی گرتی ہوئی صحت اور مضمحل توانائی اس کش مکش کی حریف نہیں ہو سکتی جو اس کے لئے ناگزیر تھی۔ اس کی نگہ بصیرت ایک ایسی شخصیت کی تلاش میں نکلی جو اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی سکت رکھتا ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کی نگہ تجسس جا کر ٹکی تو ایسی شخصیت پر ٹکی جس کی ساری زندگی اقبال کے نظریات اور تصورات کے یکسر خلاف تھی یہ شخصیت تھی مسٹر محمد علی جناح کی جس کا نظریہ نیشنلزم، عقیدہ نیشنلزم اور عمل نیشنلزم تھا۔ وہ (ہندوؤں، مسلمانوں پر مشتمل) متحدہ قومیت کا علم بردار اور وطنی جمہوریت کا داعی تھا۔ جس کی ساری زندگی ان ہی وادیوں کی دشت پیمائی اور صحرا نوردی میں گزری تھی اور جب وہ اپنی تگ و تاز میں ناکام رہ گیا تو بجائے اس کے کہ اپنے نظریات میں تبدیلی کر لے وہ دل برداشتہ ہو کر وطن سے دور انگلستان میں جا بیٹھا اور مستقل طور پر وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اقبال کی نگاہ دوررس نے اس مقصد کے لئے جو جناح کے مقصد کے خلاف تھا جناح کا انتخاب کیا اور انتخاب کیا تو اس حزم و یقین کے ساتھ کہ انہیں لکھا کہ

''میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کشتی کو صحیح وسالم، برامن و عافیت ساحل مراد تک لے جائیں گے'' [29]

اقبال کے خط کا اقتباس اس ''ہنر مندی'' اور ''کاری گری'' سے عبارت میں فٹ کیا گیا ہے کہ قاری یقین کر بیٹھتا ہے کہ یہ خط علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو اس وقت لکھا تھا جب جناح ہندوستان کی سیاست سے بیزار ہو کر انگلستان میں مستقل قیام کی نیت سے اپنا مکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ اس طرح یہ تاثر پختہ کیا گیا ہے کہ مسٹر جناح علامہ اقبال کے ایسے ہی خطوط سے متاثر ہوئے اور اپنے نظریات تبدیل کر کے واپس ہندوستان آ گئے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خط مسٹر جناح کے قیام انگلستان

[29] ''طلوع اسلام'' ماہ نومبر 1984 ص 3

یعنی 32 تا 34 کے دوران نہیں لکھا گیا یہ خط تو اس وقت لکھا گیا تھا جب مختصر عرصہ کے لئے جناح اور اقبال میں روابط تھے اور مسٹر جناح واپس ہندوستان آ چکے تھے یہ خط چھوٹے سے اُس مجموعہ میں شامل ہے جو''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اور اس خط پر تاریخ تحریر 21 جون 1937ء لکھی ہوئی ہے''طلوع اسلام'' میں اسی خط کا اقتباس دے کر یہ تاثر مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس اقتباس کے بعد زور بیان کی انتہا کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جناح کے نظریات تبدیل کرنے اور اُسے واپس ہندوستان لانے کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو علمی اور فکری لحاظ سے جناح سے بلند ہو اس طرح کی موثر تحریر لکھ کر تان یہاں ٹوٹتی ہے۔

''ایسا انقلاب کوئی ایسی شخصیت ہی پیدا کر سکتی تھی جو علمی اور فکری سطح پر بھی جناح سے زیادہ قد آور ہوتی اور جس کے خلوص اور دیانت پر جناح کو کامل اعتماد بھی ہوتا اقبال کے سوا کوئی شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی اقبال ہی تھا جو جناح کے قلب ونگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکا''

خیال رہے کہ اس تبدیلی کو ان سطروں سے دو چار سطر اوپر لکھا گیا ہے کہ''یہ انقلاب مذہب کی زبان میں کفر چھوڑ کر اسلام لانے کے مترادف تھا''[30]

یوں طلوع اسلام نے علامہ اقبال کے سر پر یہ تاج سجا دیا کہ اُن ہی کی پیہم کوششوں سے مسٹر جناح نے''مذہب کی زبان میں کفر چھوڑ کر اسلام کی طرف توجہ کی۔''طلوع اسلام'' نے اپنی بات کو مدلل بنانے کے لئے ایک انگریز مصنف ہیکٹر بولیتھو کی شہادت بھی پیش کی ہے مسٹر بولیتھو نے قائداعظم کی زندگی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے طلوع اسلام نے اس کتاب سے یہ اقتباس پیش کیا ہے۔

''مسٹر جناح نے لندن میں سر محمد اقبال سے بہت سی ملاقاتیں کیں وہ بڑے اچھے دوست تھے مسٹر جناح اگر چہ اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق اکسی غلط فہمی میں نہیں تھے بایں ہمہ وہ اقبال کے دلائل سے اتنی جلدی متفق نہیں ہوئے اس میں تقریباً دس سال کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناح نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبال کا

---

[30] ایضاً ص 4

نقطہ نظر صحیح ہے'' (31)

لیجئے مسٹر بولیتھو صاحب نے یہ کام کیا تو کہ جناح اور اقبال کو ''اچھے دوست بنا دیا'' اس دوستی کی ابتداء کب ہوئی؟ یہ بات نہیں بتائی پھر یہ کہہ دیا کہ 1932ء میں مسٹر جناح نے اقبال سے بہت سی ملاقاتیں کیں دونوں دوست تھے مگر ان میں نظریاتی اختلاف تھا اور اختلاف کی یہ وسیع خلیج پاٹنے میں یا بقول طلوع اسلام ''کفر چھوڑ کر اسلام لانے'' میں دس سال کا عرصہ لگ گیا طلوع اسلام کو بولیتھو والی دس سال کی بات پسند نہیں آئی اس نے فٹ نوٹ میں لکھا ''ہم سمجھتے ہیں کہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔'' (طلوع اسلام نومبر 1984ص4) ہیکٹر بولیتھو نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس کی معلومات کا ماخذ کیا ہے ماخذ کوئی ہوتا تو وہ بتاتا یہ سب اس کے مفروضات تھے۔ اس نے آگے چل کر ان مفروضات کو مزید پھول پھل لگائے ہیں وہ لکھتا ہے۔

''مسٹر جناح اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا حتیٰ کہ کوئی سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کرتا جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جس سے وہ تسکین خاطر حاصل کیا کرتے تھے یہ وہ خطوط تھے جو علامہ اقبال نے انہیں انگلستان میں 1932ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے'' (32)

بولیتھو صاحب نے خطوط کے بنڈل کا ذکر کیا ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ 1932ء کے بعد کے خطوط اس بنڈل میں تھے گویا بولیتھو اقبال جناح تعلقات کی کہانی کھینچ تان کر 1932ء تک لے گئے ہیں مگر انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہاں مجھے ایک خوب صورت علمی و ادبی لطیفہ یاد آ گیا ہے پہلے وہ سن لیجئے پھر موضوع کی طرف آئیں گے۔

علمی وادبی لطیفہ

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں ''مدت ہوئی جب میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا ایک بار پرنسپل نے مجھ سے کہا ''گلبدن بیگم'' کا ''ہمایوں نامہ'' کہاں سے ملے گا لندن سے ایک خاتون نے اس کا پتہ

(31) جناح، کری ایٹر آف پاکستان'' ص90 (32) ایضاً ص114

پوچھا ہے مجھ کو اپنی تاریخ دانی پر بڑا ناز تھا میرا غرور توڑنے کے لئے یہ کچھ کم بات نہ تھی کہ میں ''ہمایوں نامہ'' ایک طرف سرے سے گلبدن بیگم کو نہیں جانتا تھا میں نے ہندوستان کے مشہور کتب خانوں کو خطوط لکھے کہیں سے جواب نہ آیا'' گلبدن بیگم، شہنشاہ بابر کی بیٹی شہنشاہ ہمایوں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھی اپنے بھائی ہمایوں کے حالات اس نے ہمایوں نامہ میں قلم بند کئے۔ یہ کتاب نایاب تھی بلکہ ہندوستان کے تاریخ دانوں کو اس کا علم بھی نہ تھا۔ ایک یوروپین مصنفہ لیڈی اینٹ ایسن بیورج کو اس کتاب کا سراغ ہاتھ آیا انہوں نے اس پر ایک تعارفی مضمون ایک میگزین میں طبع کرایا اور اصل کتاب کی تلاش شروع کردی۔ ہمارے معروف ادیب، شاعر اور تاریخ نگار مولانا محمد حسین آزاد نے کہیں اینٹ ایس بیورج والا مضمون دیکھا انہوں نے اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور ''ہمایوں نامہ'' پر اس طرح مضمون لکھ دیا جیسے یہ کتاب ان کے سامنے پڑی ہے ان کا یہ مضمون ان کی ضخیم کتاب ''دربار اکبری'' میں آ گیا۔ خاتون مذکور نے دربار اکبری دیکھی انہوں نے سمجھا ان کی تلاش سرخ رو ہوئی۔ ہمایوں نامہ محمد حسین آزاد کے پاس ہے تبھی تو اس نے اس پر مضمون لکھ دیا ہے اس نے ہندوستان کے انگریز افسروں کے ذریعے پتہ کرایا تو بقول علامہ شبلی ''معلوم ہوا کہ آزاد نے جو کچھ لکھا تھا وہ خود لیڈی صاحبہ کی خوشہ چینی تھی'' (33)

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ لیڈی موصوف نے اپنی کوششوں میں بہت عرصہ بعد کامیابی حاصل کی انہیں ہمایوں نامہ مل گیا اور اس نے اسے شائع کرا دیا۔

علامہ شبلی نے اپنے مضمون کے ابتدائیہ میں یوروپین محققین کی ستائش کی ہے اور مشرق بالخصوص ہندوستانی مصنفین کی روش پر طنز کیا ہے کہ یہ لوگ تحقیق سے کام نہیں لیتے مفروضات کو تاریخ بنا کر پیش کرتے ہیں بلاشبہ علامہ صاحب کی بات درست ہے لیکن بولیتھو نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہی کام بعض یوروپین مصنف بھی کرتے ہیں اور بے پر کی اڑانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ معروف دینی سکالر اور طلوع اسلام کے خصوصی مقالہ نگار رفیع اللہ شہاب مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان آنے پر علامہ پرویز صاحب ہیکٹر بولیتھو سے ملے تھے اور قائداعظم اقبال تعلقات کے سلسلہ میں بات چھیڑی

(33) ''مقالات شبلی'' (تنقیدی) جلد چہارم ص 53

تھی اور ماخذ پوچھا تھا بولیتھو نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا ''مسٹر پرویز آپ جناح اور اقبال دونوں کے قریب رہے ہیں میں نے تو آپ ہی کی تحریروں کو آگے پیچھے سے ملا کر یہ واقعات ترتیب دے لئے تھے'' لیجئے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اپنی فرضی اور خیالی کہانیوں کو تاریخ کے طور پر پیش کر دینے والے صرف ہمارے ہاں ہی نہیں مغرب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بولیتھو نے جو کچھ لکھا ہے ایک تو اس نے اس کی سند پیش نہیں دوسرے اس کی عبارت میں اشتباہ انگیز اضطراب ہے جسے ہر قاری محسوس کر سکتا ہے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ خطوط کا جو بنڈل اُس نے دیکھا تھا اس میں شامل خطوط 1932ء کی ملاقاتوں کے بعد لکھے گئے تھے اس دعویٰ کی دلیل میں اُسے 1932ء میں لکھا ہوا کوئی خط یا اس کا اقتباس پیش کرنا چاہئے تھا مگر وہ آگے اس خط کا اقتباس پیش کرتا ہے جس کے متعلق خود لکھتا ہے ''اقبال نے 28 مئی 1937ء کے ایک خط میں لکھا تھا'' (ص 114)۔ مسٹر جناح کے پاس اقبال کے خطوط کا جو بنڈل تھا وہ انہوں نے اشاعت کے لئے دے دیئے یہ چند خطوط مئی 1936ء سے نومبر 1937ء تک کے ہیں مسٹر بولیتھو کا بیان کردہ بنڈل کدھر گیا؟ اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں اس لئے کہ وہ بنڈل کہیں تھا ہی نہیں وہ صرف ہیکٹر بولیتھو کا مفروضہ تھا اور اس کے تخیلات میں ہی رہا۔ اب اصل بحث کی طرف آیئے۔

اصل بات یہ ہے کہ محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے خیالات میں بہت بڑا تضاد تھا جناح اوّل آخر سیاست دان تھے سیاست دان معروضی حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے اور ان کے تقاضوں کے تحت حکمت عملی میں تبدیلی لاتا رہتا ہے مسٹر جناح جب ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے اور ان کے اندر کے قائداعظم بننے کی خواہش رکھنے والے لیڈر نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ کانگریس کے پاس گاندھی کے بعد بھی بڑے لیڈر موجود ہیں جو قدم قدم پر ان کی مزاحمت کریں گے اور ان کے اندر پرورش پانے والی قیادت عظمیٰ حاصل کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو سکے گی تو وہ مسلم لیگ کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور خود کو مسلمانوں کا عظیم لیڈر ثابت کرنا چاہتے تھے وہ انگلستان کی سیکولر سیاست میں اور آزاد فضاؤں میں پروان چڑھے تھے وہ سیاست اور مذہب کو قطعی الگ سمجھتے تھے انہیں مسلم لیگ کی لیڈر شپ تو مل گئی مگر جب دیکھا کہ یہاں مذہب سیاست کے گریبان میں ہاتھ ڈال رہا ہے اور جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کرنے والے سر شفیع کو اہمیت مل گئی ہے تو وہ سخت مایوس ہوئے اور آخر کار ہندوستان کی سیاست سے

بیزار ہو کر انگلستان میں قیام اختیار کر لیا پھر ہندوستانیوں کی طرف سے اصرار ہوا اور خاص طور پر لیاقت علی خان نے انہیں واپسی پر قائل کرنے کی کوشش کی تو لیاقت کی صورت میں انہیں اپنا ایک روشن خیال رفیق نظر آنے لگا لیاقت علی خان نے ہندوستان کے حالات کو بغور مطالعہ کیا اور انہیں سازگار حالات کا سگنل دے دیا۔ اور وہ واپس آ گئے۔ اُن کے حق میں حالات کس طرح سازگار تھے؟ اس کے متعلق راج موہن گاندھی نے کہا ہے۔

''مسلمان ان کی عدم موجودگی میں قیادت کا خلا محسوس کرنے لگے تھے سر آغا خان فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں بیٹھ کر ہندوستان کے عوام کی رہنمائی کرنے کا ناممکن کام کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر فوت ہو چکے تھے اور مسلم لیگ میں جناح کا ایک ہی حریف سر شفیع بھی وفات پا چکا تھا۔ لیگ نظم وضبط اور مقبولیت کے اعتبار سے سکڑ چکی تھی اس کے فنڈ غلط کاموں میں استعمال ہو رہے تھے عہدہ داروں کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہو چکی تھی لیکن وہ پھر بھی اپنے عہدوں سے چمٹے ہوئے تھے اور مستعفی ہونے سے انکار کر رہے تھے''

یہ تھے وہ حالات جو ہندوستان میں جناح کی واپسی کے لئے سازگار تھے۔ بہر حال جناح واپس آ گئے اب اقبال کو اور ان کے نظریات کو دیکھئے۔ اقبال اگرچہ سیاست میں دخیل تھے مگر وہ محدود سوچ رکھنے والے شاعر تھے اور عملی زندگی سے تقریباً کنارہ گیر تھے۔ وہ مسلمانوں کے مردہ ماضی کو زندہ کرنے کی کوششوں میں لفظ و خیال کا جادو جگا رہے تھے ہمارے خیال میں انہوں نے ایڈورڈ ٹامسن کو لکھے ہوئے خط میں اپنے متعلق جو جملہ لکھا تھا (چاہے جس تناظر اور جس انداز میں لکھا تھا) وہ ان کی اپنی ذات کی صحیح تصویر کشی تھی انہوں نے لکھا تھا۔

''یہ خیالات تو محض ایک شاعر کے ہیں اور شاعر جیسے کہ آپ کو علم ہے بے عمل خوابیں دیکھنے والے سمجھے جاتے ہیں'' [34]

انہیں ''پدرم سلطان بود'' کے نشہ میں غرق گزرے زمانہ کے لوٹ آنے اور اپنی درخشانیاں بکھیر دینے کی بے عمل آرزوؤں میں ڈوبی ہوئی قوم میں بڑی پذیرائی حاصل تھی اور وہ اسی پر مطمئن ڈرائنگ

[34] ''زندہ رُود'' ص 422

روم میں بیٹھے شعر سوچتے رہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے جلد وہ زمانہ لوٹ آئے گا جب ان کا سوچا ہوا اسلام نافذ العمل ہو کر بہاریں دکھائے گا سیاست میں پہلے سر شفیع ان کے مدار المہام تھے مگر اب وہ فوت ہو چکے تھے اور انہیں ایسے لیڈر کی تلاش تھی جو ان کی سوچوں کے مطابق سیاست کرے وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ

''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

ادھر محمد علی جناح اس انگلستان کی تاریخ بیدار دماغ سے پڑھ چکے تھے جس انگلستان نے مذہب کی چنگیزیوں سے زخم خوردہ ہو کر اُسے معبد میں بند کیا تھا اور سیکولر سیاست میں ہی ہر مکتب فکر کے آدمیوں کے لئے فلاح دیکھی تھی ان حالات میں جناح اور اقبال میں محبت اور دوستی کا رابطہ تلاش کرنا برف کے تودہ میں انگارہ ڈھونڈھنے کے مترادف ہے سابقہ تفاصیل سے آپ یہ بھی جان چکے ہوں گے کہ سر شفیع اور جناح کے درمیان اختلاف وافتراق ڈالنے کا کردار بھی علامہ اقبال کے جداگانہ انتخابات پر اصرار نے سرانجام دیا تھا جب جناح ہندوستان کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر انگلستان بیٹھ گئے تو خاص طور پر وہ مسلم لیگ کی اسی طرح کی سیاست سے بیزار ہوئے تھے ان کا یہ فیصلہ سٹینلے والپرٹ کے الفاظ میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ

''وہ لیگ کو اقبال اور ان کے پنجابی دوستوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کو تیار تھے'' [35]

اب آیئے اقبال جناح تعلقات وروابط کی طرف۔

قائداعظم محمد علی جناح نے 1940ء میں یوم اقبال پر فرمایا

''جب ہم نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے تو اس سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے جب میں پنجاب آیا تو جس شخص سے سب سے پہلے ملا وہ اقبال تھا'' [36]

قائداعظم کے تمام احترامات کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے غلط کہا وہ اپنے دورہ کے سلسلہ میں جب پنجاب وارد ہوئے تو جس شخص سے سب سے پہلے ملے وہ اقبال نہیں سر فضل حسین تھے اور ہمارے خیال میں انہیں کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ اس وقت ووٹ عوام کے نہیں خواص کے ہوتے تھے جو شخص ایک خاص مقدار میں مالیہ یا انکم ٹیکس ادا کرتا تھا ووٹرز کی فہرست میں حکومت کی

---

[35] ''جناح آف پاکستان'' از سٹینلے والپرٹ بحوالہ ''ماہ نو'' اقبال نمبر 2002ء ص 220

طرف سے اسی کا نام درج ہوتا تھا اور اسی کو ووٹ دینے کا اختیار ہوتا تھا ظاہر ہے اس صف میں بڑے زمیندار اور مال دار لوگ ہی آتے تھے عوام نہیں۔ سر فضل حسین سیکولر سوچ کے نمایاں سیاست دان تھے پنجاب میں ان کا ہی اثر ورسوخ تھا وہ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ تھے اس پارٹی میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے مسلمان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا سیاسی دھڑا بھی ان کے ساتھ تھا کوئی قومی سیاسی پارٹی انہیں نظر انداز نہیں کرسکتی تھی۔ قائداعظم کی بھی خواہش تھی کہ سر فضل حسین مسلم لیگ میں آجائیں انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی کی صدارت کرنے کے لئے بھی ان کا نام پیش کیا تھا مگر سر فضل حسین نے اس سے انکار کردیا تھا اس کے باوجود قائداعظم جب متذکرہ دورہ کے سلسلہ میں آئے تو سب سے پہلے ان ہی سر فضل حسین سے ملے قائداعظم لاہور میں سر فضل حسین کے دست راست نواب احمد یار خان دولتانہ ہی کے پاس ٹھہرے تھے یہ علامہ اقبال کے قریبی ساتھی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں۔

''قائداعظم لاہور آکر سر فضل حسین سے ملے مگر انہوں نے قائداعظم کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا وقت کا تقاضا مسلم لیگ کی نہیں یونینسٹ پارٹی کی حمایت ہے یہاں سے مایوس ہوکر وہ علامہ اقبال کے پاس گئے علامہ اقبال اس وقت سخت بیمار تھے چلنے پھرنے سے بھی عاجز تھے مگر انہوں نے بڑی فراخ دلی سے بغیر کسی بحث کے کہا ''میں آپ کے ساتھ ہوں مگر صرف عوام کی مدد کا وعدہ کررہا ہوں مال داروں اور زمینداروں کی طرف سے مدد کا نہیں'' (37)

بالکل یہی بات محمد احمد خان نے بھی لکھی ہے وہ کہتے ہیں

''قائداعظم 29 اپریل 1936ء کو لاہور پہنچے تاکہ یہاں کے اکابرین سے مل کر پنجاب صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کریں یکم مئی کو انہوں نے سر فضل حسین کے مکان پر جاکر ملاقات کی اور انہیں مسلم لیگ میں شرکت اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کے قیام کی ترغیب دی لیکن فضل حسین ماننے والے کب تھے انہوں نے تو مسلم لیگ کے سالانہ جلاس بمبئی کی صدارت سے انکار کردیا تھا پھر اس ملاقات سے صرف گیارہ دن قبل یعنی 19 اپریل کو انہوں نے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کا بیڑہ اٹھایا تھا اس طرح

(37) ''اقبال کے آخری دوسال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص 307 (36) ''روزنامہ انقلاب'' 26 مارچ 1940ء

وہ تو اپنے نظریات کو جامہ عمل پہنانے کے لئے تلے بیٹھے تھے چنانچہ یہ ملاقات ناکام رہی فضل حسین نے مسٹر جناح کو ٹکا سا جواب دے دیا ادھر سے مایوس ہو کر قائداعظم علامہ اقبال کے گھر گئے'' (38)

قائداعظم نے شاید سامعین کا موڈ دیکھ کر بات کر دی تھی کہ وہ لاہور جا کر سب سے پہلے اقبال سے ملے۔ بات غلط تھی لیکن اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اقبال جناح تعلقات کا آغاز 1936ء سے ہوا۔ یہی بات ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے بھی لکھی ہے وہ کہتے ہیں۔

''جہاں تک میری ناچیز معلومات کا تعلق ہے ڈاکٹر اقبال اور مسٹر جناح کے درمیان اس 1936ء سے قبل گہرا ربط وضبط قائم نہیں ہوا تھا'' (39)

مگر یہ ''ربط وضبط'' اور تعلق بھی اس ماحول میں ہوا کہ علامہ اقبال ''سخت بیمار تھے اور چلنے پھرنے سے عاجز تھے'' یہ بیماری ان کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی اور وہ اس ملاقات کے دو سال بعد 21 اپریل 1938ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ تاہم ان دو سالوں میں وہ مسلم لیگ سے اور قائداعظم سے منسلک رہے جن سر فضل حسین کو قائداعظم مسلم لیگ میں لانا چاہتے تھے وہ انہیں اور ان کی مسلم لیگ کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھے چنانچہ قائداعظم کو انکار کرنے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھی سر سکندر حیات کو جو خط لکھا اس میں ان کے احساسات کھل کر سامنے آ گئے وہ لکھتے ہیں،۔

''جناح نے مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے جناح نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں اخبارات میں ان کی تائید میں کئے ہوئے پروپیگنڈے کے باعث ان کی تشہیر نہ ہو گی۔ ہم نے انہیں ٹھکرا دیا۔ ''اتحاد ملت'' پارٹی نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ احرار ان کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں وہ ان کا ساتھ دیں یا نہ دیں ہمارے ساتھ ان کا رویہ وہی رہے گا جو پہلے تھا۔ البتہ اقبال، شجاع، تاج الدین، برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے جناح کی اس تحریک سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں'' (40)

(38) ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان ص 527 شائع کردہ اقبال اکیڈیمی پاکستان لاہور (39) ''اقبال کے آخری دو سال'' ص 293 (40) ''فضل حسین اے پولیٹکل بائیوگرافی'' از عظیم حسین ص 309

سرسکندر نے اسی دن اس کا جواب لکھا

''جناح نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان متحد ہوکر ایک جسد واحد بن جائیں اور اسی حیثیت سے یک آواز ہوکر کانگریس اور حکومت سے معاملات طے کریں میں نے احمد یار دولتانہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ جناح کو یہ پیغام پہنچادیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعلان کردہ خیالات تک محدود رکھیں لیکن گزشتہ چند ہفتوں کی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی مصروفیات کچھ اور رنگ اختیار کررہی ہیں میں نے احمد یار سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ جناح سے صاف کہہ دیں کہ وہ پنجاب کے پھٹے میں اپنی ٹانگ نہ اڑائیں ورنہ انہیں نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا کسی صورت میں ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ صوبائی خودمختاری میں دخل اندازی کی جائے ہم کسی کو ایسا نہیں کرنے دیں گے چاہے ایسا کرنے والا اس حکومت کا نمائندہ ہو جس نے ہمیں یہ خودمختاری دی ہے یا مسلم لیگ کا صدر ہو یا کوئی انجمن یا ادارہ ہو'' [41]

قائداعظم نے یہ پارلیمانی بورڈ 1936ء کے انتخابات کے لئے بنایا تھا تاکہ مسلم لیگ کے ارکان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ہی انتخابات لڑیں مگر حالت یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے بورڈ بنانے کی حمایت کی تھی وہ بھی اس کے خلاف ہوگئے حتیٰ کہ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل لیاقت علی خان انہوں نے بھی پارلیمانی بورڈ کی رکنیت سے مستعفی ہوکر ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ایگری کلچرل پارٹی بنالی۔ خیر یہ کہانی الگ ہے قائداعظم کو پنجاب سے علامہ اقبال کی حمایت ملی علامہ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے پارلیمانی بورڈ پنجاب کا صدر بھی ان کو منتخب کیا گیا انتخابی مہم شروع ہوگئی 9 جولائی 1936ء کو سرفضل حسین فوت ہوگئے تھے اور اب یونینسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا سرسکندر تھے قائداعظم انتخابی مہم کے سلسلہ میں 9 اکتوبر 36 کو لاہور آئے علامہ اقبال علالت کے باعث پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے مستعفی ہوچکے تھے تاہم مسلم لیگ کے صوبائی صدر وہی تھے 11 اکتوبر 1936ء کو دہلی دروازہ کے باغ میں مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہوا صدارت اقبال ہی کو کرنا تھی مگر وہ علالت کے باعث نہ جاسکے قائداعظم نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف دھواں دھار تقریر کی مگر بقول ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا بمشکل ہزار ڈیڑھ ہزار حاضرین تھے [42]

---

[41] ایضاً ص 310 [42] اقبال کے آخری دوسال ص 352، ''زندہ رُود'' ص 568

مسلم لیگ مسلم حلقوں سے صرف سات امیدوار کھڑے کر سکی ان میں سے صرف دو کامیاب ہوئے ایک ملک برکت علی اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان۔ راجہ صاحب کامیاب ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے اور سکندر حیات نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا راجہ صاحب ہمارے ہی ساتھی تھے اور الیکشن سے پہلے فیصلہ کر چکے تھے کہ ہمارے ساتھ آ جائیں گے۔ قائداعظم نے پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کے مایوس کن انتخابی نتائج دیکھے تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا یہاں مسلم لیگ کے صدر علامہ اقبال جیسے نامور آدمی تھے مگر یہاں ان کی شاعرانہ شہرت کوئی جادوگری نہ دکھا سکی اور نتیجہ شرم ناک حد تک مایوس کن رہا۔ قائداعظم کے متعلق پرستار اقبال جناب محمد احمد خان صاحب کو جو حقیقت پسندانہ جملے لکھنے پڑے ہیں وہ بھی پڑھ لیجئے موصوف لکھتے ہیں۔

''یونینسٹ پارٹی کے مسلمان لیڈر سب لال بجھکڑ تھے اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے تھے جناح وہ زیرک سیاست دان تھا جس کی نگاہیں حال کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کو بے نقاب دیکھ لیا کرتی تھیں''[43]

اسی ''حال کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کو بے نقاب دیکھنے والے جناح'' نے سمجھ لیا تھا کہ بنگال کی طرح پنجاب میں بھی مسلم لیگ کی موجودہ قیادت ان کے لئے مفید مطلب نہیں لطف یہ ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کے کرتا دھرتا اور مسلمانوں کے قومی شاعر علامہ اقبال خود ایک خط میں یہ بتا رہے تھے کہ

''پنجاب کے مسلمانوں میں کانگریس کی موافقت کے جذبات سرعت کے ساتھ بڑھنے لگے ہیں''[44]

عملی طور پر صورت حال یہ تھی کہ علامہ اقبال کے دور صدارت میں مسلم لیگ کی حالت اتنی مخدوش ہوگئی کہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کو ایڈورڈ روڈ پر واقع اپنا دفتر چھوڑنا پڑا اور دفتر کے کلرک اللہ بخش سلیم کو جس کی تنخواہ تیس روپے ماہوار تھی فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے جواب دے دیا گیا[45] سو ''مستقبل بین'' جناح کچھ اور طرح سے سوچنے لگا۔

---

[43] ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' ص545 [44] ''لیٹرز آف اقبال ٹو جناح'' مکتوب محررہ 22 اپریل 1937ء

[45] ''اقبال کے آخری دو سال'' ص515,473

یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سرسکندر حیات جنہیں پرستار اقبال محمد احمد خان صاحب نے لال بجھکڑوں میں شمار کیا ہے وہ بڑی ہوشیاری سے حالات کا مطالعہ کرر ہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ مستقبل مسلم لیگ کا ہے انہوں نے بڑی چالاکی سے یہ کوشش شروع کردی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ مسلم لیگ بھی ان کی جیب میں آجائے۔ اسی سیاسی فضاء میں مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس اکتوبر 15 تا 18 1937ء لکھنوٴ میں ہوا اس میں سرسکندر اپنے ساتھیوں کی رفاقت میں شامل ہوا۔ سر اقبال بیماری کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے لیکن ان کے رفقاء پہنچ گئے اسی اجلاس میں ''سکندر جناح میثاق'' طے ہوا۔ اس کا اصل متن شائع نہ کیا گیا علامہ اقبال کے رفقاء نے علامہ اقبال کو کچھ اور طرح کی تفاصیل بتائیں سرسکندر کچھ اور طرح بیان کرر ہا تھا۔ علامہ نے کوشش کی کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں انہیں بتایا یہی گیا تھا مگر یونینسٹ پارٹی نے ایسا نہ کیا آخر تھک کر علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا۔

''سرسکندر اور ان کے رفقاء سے کئی مرتبہ کی گفت وشنید کرنے کے بعد میری اب یہ قطعی رائے ہے کہ سکندر لیگ اور اس کے پارلیمانی بورڈ پر قبضہ کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتے۔ میرے خیال میں ان کی تمام تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ لیگ پر قابض ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ لیگ کو سرسکندر اور ان کے دوستوں کے حوالے کردوں'' [46]

قائداعظم نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا آخر اپریل 1938ء کو علامہ اقبال نے ایک اخباری بیان تیار کرایا جس میں کہا کہ جناح سکندر معاہدہ کو کالعدم سمجھا جائے یہ بیان منظوری کے لئے جناح کو بھیجا گیا انہوں نے تار کے ذریعہ یہ بیان رکوا دینے کو کہا محب اقبال مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں

''یہ چیز علامہ کے لئے بہت مایوس کن تھی'' [47]

مگر اس سے بڑا مایوس کن اقدام ابھی باقی تھا قائداعظم کے دستخط سے مرکزی دفتر کی طرف سے ایک سرکلر جاری ہوا تھا کہ 15 مارچ 1938ء سے پیشتر تمام صوبائی لیگوں کی طرف سے مرکز میں الحاق کی درخواستیں پہنچا دی جائیں درخواستیں پہنچ گئیں 5 اپریل کو علامہ کو یہ خط پہنچا دیا گیا کہ پنجاب

---

[46] ''لیٹرز آف اقبال ٹو جناح'' ص 31-30 [47] ذکر اقبال ص 209

لیگ کے متعلق بعداز غور فیصلہ ہوا کہ مرکز اس کا الحاق کرنے سے معذور ہے علامہ اب علالت کی بناء پر صدارت سے الگ ہو چکے تھے اور یہ منصب نواب ممدوٹ کے پاس تھا لیکن صوبائی لیگ کا کوئی کام علامہ کے مشورہ کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ یہ خط علامہ کے لئے اور بڑا صدمہ تھا کیونکہ قائداعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ نے وہی کیا جو یونینسٹ پارٹی چاہتی تھی۔اس پر علامہ کے قریبی ساتھی ملک برکت علی نے قائداعظم کو ایک نا ملائم خط لکھا جس میں تحریر تھا۔

''ہم یہ تو برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری اس لیگ کا الحاق نامنظور کیا جائے جو گذشتہ ربع صدی سے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک ملحقہ شاخ چلی آرہی ہے اور جس کے ممبران کی فہرست میں ڈاکٹر سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور ہندوستان گیر شہرت کے آدمی کا نام نامی بھی موجود ہے'' [48]

مگر قائداعظم سیاست دان تھے وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلم لیگ کی وہ شاخ جس میں ''ڈاکٹر سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور ہندوستان گیر شہرت کا آدمی ہے وہ سیاسی جنگ میں ان کے کسی کام نہیں آسکتی۔ پرستار اقبال محمد احمد خان علامہ اقبال اور ان کی پنجاب مسلم لیگ پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اسی صوبائی مسلم لیگ کے صدر ابھی کچھ دن پہلے تک خود حضرت علامہ تھے اور اس کے عہدہ دار اور کارکن ان کے وہ معتمد رفقائے کار تھے جنہوں نے نہایت کٹھن اور صبر آزما حالات میں اس ننھے اور کمزور پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کو ایک تناور درخت بنا دیا تھا اور اب بھی وہ ان ہی کی سرپرستی، ہدایات اور رہنمائی میں اس کو بارآور بنانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے لیکن اسی صوبائی لیگ کو کالعدم قرار دے دیا گیا تھا علامہ مرحوم کو اس اطلاع سے بے حد رنج ہوا پھر بھی وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے وہ مرض الموت میں مبتلا تھے لیکن بستر مرگ پر لیٹے لیٹے انہوں نے 14 اپریل 1938ء کو اپنے رفقاء کو حکم دیا کہ ''کلکتہ جا کر اپنی جنگ خود لڑو یہاں گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا''۔ ان کے حکم کی تعمیل میں ایک وفد کلکتہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جہاں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 18، 19، 20 اپریل کو ہو رہا تھا روانگی سے قبل یہ وفد ایک دفعہ پھر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا

[48] ''اقبال کے آخری دو سال'' ص609

علامہ نے فرمایا ''ضرور جاؤ اور اپنے حق کے لئے آخر تک لڑو'' [49]

اس وفد میں ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول خان، پیر تاج الدین، ملک زمان مہدی اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی شامل تھے بقول ڈاکٹر بٹالوی وفد رخصت ہونے لگا تو پھر فرمایا ''کسی کی پروانہ کرنا۔'' اس وفد کے پاس الحاق کی نئی درخواست بھی تھی مگر وہ بے کار گئی کیونکہ وفد کلکتہ پہنچا تو قائداعظم نے فرمایا پنجاب میں نئی پراونشل مسلم لیگ برسرعمل لانے کے لئے ایک آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے جس میں 25 آدمی یونینسٹ پارٹی کے اور دس آدمی پہلے والی مسلم لیگ ہیں علامہ اقبال کا تیار کردہ یہ وفد 21 اپریل 1938ء کو واپس لاہور پہنچا تو سٹیشن پر اخبار فروش چلا چلا کر کہہ رہے تھا'' تازہ اخبار۔۔علامہ اقبال فوت ہو گئے'' شاید وفد والے کسی حد تک مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ علامہ اقبال شکست کا آخری داغ اپنے دل پر لے جانے سے تو بچ گئے [50]

اقبال جناح کی وابستگی و پیوستگی یا ''گہرے ربط وضبط'' کی بات یہاں ختم ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ایسے تعلقات کبھی بھی قائم نہیں رہے کہ دونوں کی سوچ ایک ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے پروانے بن گئے قائداعظم کانگریس کے طرز عمل سے اور ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے صرف مسلمانوں کا لیڈر بن کر مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑنا قبول کیا وہ مسلمانوں کو سیاسی حقوق دلانا چاہتے تھے اور بس، وہ کوئی تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے تھے وہ اول سے آخر تک سیکولر ذہن کے انسان تھے اس لئے اسلام کے سکہ بند علماء کی اکثریت ان کے خلاف تھی ان کے مقابلہ میں اقبال احیائے اسلام کے رومان پرور نظریہ کے حامل تھے وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دے رہے تھے اور سے معرکہ دین و وطنیت سمجھتے تھے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تو وہ سر شفیع کے دور سے پنجاب مسلم لیگ کے صدر چلے آرہے تھے اس لئے جناح نے اس مقامی تنظیم سے چھیڑ چھاڑ نہ کی اور جیسا کہ بیان کردہ تفاصیل سے واضح ہے وہ لاہور آئے تو پہلے سر فضل حسین گروپ سے رابطہ کیا اس طرف سے مایوس ہو کر اقبال کی طرف آئے سر فضل حسین کی وفات کے بعد سر سکندر کو مفید مطلب پایا تو اقبال اور ان کی مسلم لیگ کی پروانہ کرتے ہوئے پنجاب میں نئی آرگنائزنگ کمیٹی تشکیل دی جس میں

[49] ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' ص 562 [50] ''اقبال کے آخری دو سال'' ص 609 (ملخصا)

پچیس (25) ارکان یونینسٹ پارٹی کے لے لئے اور اقبال سمیت دس ارکان اقبال والی مسلم لیگ کے لئے ۔جس دور کو اقبال جناح میں گہرے ربط وضبط کا دور قرار دیا گیا ہے اس میں اقبال نے وہ خطوط لکھے جن کی تعداد تقریباً سترہ ہے اور جو شائع ہو چکے ہیں ان خطوط میں سے صرف ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظم نے اس کا جواب دیا تھا کیونکہ اس سے اگلے خط میں اقبال نے اس جواب کا حوالہ دیا ہے اقبال نے اپنے خط میں قائداعظم سے درخواست کی تھی کہ لیگ کا نمائندہ اجلاس لاہور میں بلایا جائے جواب میں قائداعظم نے لکھا تھا ایسی درخواست باضابطہ طور پر مقامی تنظیم کی طرف سے بھیجی جاتی ہے اس ایک خط کے سوا علامہ اقبال کے کسی خط کو قائداعظم نے قابل اعتناء نہیں سمجھا تھا اس لئے کا جواب نہ دیا۔ علامہ صاحب نے جو خطوط لکھے انہیں پڑھ لیجئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ قائداعظم کو گائیڈ لائین دے رہے ہوں اور پھر قائداعظم کے سیاسی اقدامات کو دیکھ لیجئے آپ دیکھ لیں گے کہ خطوط میں دی ہوئی کسی گائیڈ لائین پر قائداعظم نے کبھی عمل نہیں کیا محبان اقبال نے ایک اور کہانی بھی گھڑی ہے یہ کہانی اس ملاقات سے جنم لیتی ہے جو علامہ اقبال کی وفات سے چندہ ماہ پہلے اقبال اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ہوئی تھی پنڈت نہرو نے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے

''رحلت سے چند ماہ قبل جب کہ وہ صاحب فراش تھے انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور میں نہایت خوشی سے ارشاد کی تعمیل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے محسوس کیا اختلافات کے با جود ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ان جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرنا کتنا آسان ہے وہ اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی جس میں میں نے بہت کم حصہ لیا زیادہ تر ان ہی کی باتیں سنتا رہا۔ میں ان کی شاعری کا مداح ہوں اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں'' [51]

اب اس بنیاد پر عمارت اٹھتے دیکھئے عاشق حسین بٹالوی راجہ حسن اختر اور میاں فیروز الدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں ''ان دونوں عظیم المرتبت انسانوں کی گفتگو جاری تھی کہ یکا یک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے ڈاکٹر صاحب آپ خود مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے مسلمان مسٹر جناح

[51] ''ڈسکوری آف انڈیا'' از جواہر لال نہرو ایڈیشن 1956 ص 355

سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے یہ سنتے ہی غصہ میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں ان کا معمولی سپاہی ہوں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے'' [52]

عاشق حسین بٹالوی خود وہاں موجود نہ تھے انہوں نے راجہ حسن اختر اور میاں فیروز الدین کی روایت قلم بند کی ہے علامہ پرویز اور دوسرے محبان اقبال نے اقبال جناح پیوستگی ووابستگی کی کہانی کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے بڑے جوش وخروش سے یہ روایت نقل کی ہے لیکن علامہ اقبال کے ایک اور قریبی محب سید نذیر نیازی اقبال نہرو ملاقات واقعہ کچھ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے اقبال سے موقع پا کر عرض کیا پنڈت جی سے ملاقات کیسی رہی فرمایا ایک روز ڈاکٹر چکرورتی آئے تھے کہنے لگے پنڈت جی سے جب کبھی ذکر آیا انہوں نے آپ سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا وہ آج لاہور آ رہے ہیں ان سے آپ کی ملاقات ہو جائے آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے آپ کو جب موقع ملے انہیں یہاں لے آئیے۔۔ ڈاکٹر صاحب اس روز شام کو پھر آئے کہنے لگے پنڈت جی کو آج فرصت ہے، ہم لوگ آٹھ بجے حاضر ہو جائیں گے میں نے کہا بسر و چشم تشریف لائیے'' [53]

پنڈت نہرو کے اپنے بیان کے مطابق وہ ''لاہور آئے ہوئے تھے اور اقبال نے انہیں یاد کیا تو وہ اس کے پاس آئے'' سید نذیر نیازی کو اقبال نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق ''چکرورتی نے اقبال سے اس ملاقات کی اجازت لی تھی''۔ جاوید اقبال نے اس تضاد کو رفع کر دیا اور دونوں باتوں کے تطابق میں لکھا۔

---

[52] ''اقبال کے آخری دو سال''، ص 547 [53] ''اقبال کے حضور میں'' از سید نذیر نیازی ص 95

''یہ بحث بے کار ہے کہ ملاقات میں پہل کس کی طرف سے ہوئی راقم کے خیال میں تو ان کو آپس میں ملانے کی تحریک شاید ڈاکٹر چکرورتی نے کی تھی عین ممکن ہے جس طرح انہوں نے اقبال کو پنڈت نہرو سے ملاقات کرنے پر رضامند کیا اسی طرح انہوں نے پنڈت نہرو سے کہا ہو اقبال ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں'' (54)

ہمیں بھی یہ تاویل قبول ہے''ملاقات میں میاں افتخار الدین نے کیا کہا اور کیا اقبال نے واقعتاً ''جواب میں کہا'' میں جناح کا ادنیٰ سپاہی ہوں''ہمیں اس سے بحث ہے سید نذیر نیازی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

''میاں افتخار الدین کہنے لگے بات ہے بھی یہی جو آپ کہتے ہیں مسلمان بھی آزادی وطن کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے ہندو آپ حق بات کیوں نہیں کہ دیتے مسلمانوں پر آپ ہی کا اثر ہے جناح کی کون سنتا ہے؟ اقبال نے جواب میں کہا میاں صاحب اس امر سے تو شاید آپ کو بھی انکار نہ ہو کہ مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ پھر جب اتحاد ضروری امر ہے اور جناح کی قیادت سے تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہو گیا ہے تو اسے کیا اس لئے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے مسلمان بحثیت ایک قوم کے متحد ہو جائیں معاف کیجئے میں اس کے لئے تیار نہیں'' (55)

بقول سید نذیر نیازی میاں افتخار الدین نے بات آگے نہ بڑھائی اور چند لمحوں کی مزید نشست کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ اصل صورت حال کیا تھی اسے خود جاوید اقبال صاحب واضح کرتے ہیں جاوید اقبال اس وقت کم سن لڑکے تھے میاں محمد شفیع یعنی بعد کے مشہور کالم نگار م ش اُن دنوں جاوید منزل میں ہی مقیم تھے اس وقت اقبال کے ملاقاتیوں میں سے کوئی وہاں نہ تھا اقبال نے جاوید اقبال اور محمد شفیع کو حکم دیا تھا کہ وہ برآمدے میں مہمانوں کا انتظار کریں جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

''پنڈت جواہر لال نہرو تقریباً آٹھ بجے شام تشریف لائے ان کے ساتھ ایک اور صاحب اور شاید ایک دو خواتین اور ان کے میزبان میاں افتخار الدین اور بیگم میاں افتخار الدین تھے پنڈت نہرو راقم سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کمر میں ہاتھ ڈالے اُسے اپنے ساتھ اندر لے گئے اقبال

(54) ''زندہ رود''ص 642 (55) ''اقبال کے حضور''ص 102

اپنی خواب گاہ میں بستر پر نیم دراز تھے کمرے میں مہانوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں رکھ دی گئی تھیں لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے ساتھی کرسیوں پر نہ بیٹھے بلکہ تعظیماً فرش پر بچھے ہوئے غالیچہ پر بیٹھ گئے (56)

ذرا آگے چل کر جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ملاقات کے وقت اقبال کے احباب میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا یہاں تک کہ میاں محمد شفیع جن کا قیام ہی جاوید منزل میں تھا اس وقت کمرے میں موجود نہ تھے اسی طرح سید نذیر نیازی ان ایام میں سیالکوٹ گئے ہوئے تھے پس ان میں سے کوئی بھی شریک گفتگو نہ ہوا اور میاں فیروز الدین کے وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ پنڈت جواہر لال نہرو کے چلے جانے کے بعد چوہدری محمد حسین، راجہ حسن اختر اور حکیم محمد حسن قرشی بمطابق معمول تشریف لائے اور محمد شفیع کے ساتھ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے ملاقات کی تفصیل سنتے رہے'' (57)

تمام تفاصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں فرزند اقبال حقیقت حال کی وضاحت بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔

''پنڈت جواہر لال نہرو کی اقبال سے ملاقات کا مقصد ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلہ میں کوئی بات چیت کرنا قطعی نہ تھا اقبال نے سیاسی اختلافات کے باوجود پنڈت نہرو کو ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ بہر حال ملاقات کے دوران جو باتیں ہوئیں وہ بھی مختلف موضوعات پر سرسری نوعیت کی تھیں اور انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی البتہ عاشق حسین بٹالوی اور سید نذیر نیازی جیسے مؤرخین نے راجہ حسن اختر یا اقبال کے حوالہ سے اس ملاقات میں محمد علی جناح کے متعلق جو باتیں میاں افتخار الدین سے منسوب کیں بیگم میاں افتخار الدین ان کی سختی سے تردید کر چکی ہیں بیگم افتخار الدین اس موقع پر خود موجود تھیں وہ فرماتی ہیں کہ اقبال کی علالت کے پیش نظر پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے ساتھ ساتھی خاموشی سے ان کی گفتگو سنتے رہے اور میاں افتخار الدین نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا نہ وہ باتیں کہیں جو ان سے منسوب کی گئی ہیں'' (58)

ویسے تو یہ بحث یہاں ختم ہو چکی ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جناح اور اقبال کو ایک دوسرے

(56) ''زندہ رُود'' ص 640-639 (57) ایضاً ص 641 (58) ایضاً ص 642

کا ''پروانہ'' کہنے کے سارے فسانے باطل ہیں لیکن ہم ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرائیں گے ہم نے ابتداء میں کہا تھا کہ اقبال ایک بڑے شاعر ضرور تھے مگر سیاست دان نہیں تھے جناح سیاست دان تھے اور سیاست دان وقتی مصلحتوں کو دیکھ کر حکمت عملی بدلتے رہتے ہیں اقبال نے یونینسٹ پارٹی کے متعلق کہا تھا کہ وہ ''لیگ پر قابض ہو کر اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتی ہے'' یہ حالات کا صحیح سیاسی تجزیہ نہ تھا۔ جناح جس قسم کی سیاست کر رہے تھے اس میں یونینسٹ پارٹی کو اہمیت دینا ضروری تھا۔ فرزند اقبال فرماتے ہیں۔

''بہر حال یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ کی باگ ڈور ایسی پیشہ ور شخصیات کے ہاتھوں میں تھی جو زیادہ تر شہری مسلمان تھے اور جن کے پاس وسائل یا وقت کی کمی تھی انہوں نے اس ابتدائی دور میں بلاشبہ اپنی بساط کے مطابق صوبائی لیگ کی خدمت بڑی جاں فشانی سے کی لیکن ان کا دائرہ اثر محدود تھا اسی بناء پر آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان کو صوبائی لیگ سے وابستہ کر دیا جائے کیونکہ ان میں بیشتر زمیندار تھے دیہات میں خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے دولت مند تھے اور ان کے وسائل کو استعمال میں لا کر کارکنان لیگ پنجاب کے شہریوں اور دیہاتیوں میں یکساں طور پر مسلم لیگ کو مقبول بنا سکتے تھے سو اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو 1938ء میں مسلم لیگ پنجاب کے مسلمانوں میں صحیح معنوں میں عوامی جماعت نہ بنی تھی لہٰذا اس مرحلہ پر سیاسی مصلحت کے تحت یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کے ہاتھوں میں صوبائی لیگ کی باگ ڈور دینا ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا'' (59)

دیکھا آپ نے فرزند اقبال کی وسعت نظر اور حقیقت پسندانہ سوچ انہیں وہاں تک لے گئی جہاں تک ان کے والد گرامی کی نظر نہیں جا سکی تھی جس فیصلہ کو والد گرامی نے مسلم لیگ کا گلا گھونٹ دینے کے مترادف قرار دیا تھا فرزند اقبال اسی فیصلہ کو دانش مندانہ قرار دے رہے ہیں۔ عاشق حسین بٹالوی کہتے ہیں ''اگر اقبال زندہ رہتے تو عین ممکن ممکن ہے کہ ان کے محمد علی جناح کے ساتھ اختلافات نمایاں صورت اختیار کر جاتے'' (60)

ہم کہتے ہیں بٹالوی صاحب نے تو غالب امکان ظاہر کیا ہے لیکن ہم یقین سے کہتے ہیں کہ ایسا

(59) ایضاً ص 647 (60) ایضاً ص 645

ضرور ہوتا کیونکہ جس طرح ہم کہہ چکے ہیں جناح سیکولر سوچ رکھتے تھے اور اقبال ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' کے علم بردار تھے۔اس کے ساتھ ہی وہ ہر مذہب پرست کی طرح دوسروں کا ایمان بھی تولتے رہتے تھے۔قائداعظم نے متذکرہ پارلیمانی بورڈ میں اقبال کے کہنے پر ''احرار'' سے بھی رابطہ کیا تھا انہوں نے اشتراک عمل پر آمادگی بھی ظاہر کردی تھی بلکہ باقاعدہ اعلان کر دیا تھا پھر انہوں نے یہ عجیب وغریب تجویز پیش کردی کی کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کے حلف نامہ میں یہ شق بڑھائی جائے کہ کامیاب ممبر اسمبلی میں جاکر قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیئے جانے کے لئے انتہائی کوشش کرے گا۔ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں'' سچی بات یہ ہے کہ احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن نے یہ نئی شق بڑھا کر ہمیں حیران ہی نہیں پریشان بھی کردیا تھا ہم میں سے کوئی شخص میرزائیت یا غیر میرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے یہ توقع رکھنا کہ میرزائیت کے بارہ میں اپنے عقیدہ کا اعلان کرے لایعنی بات تھی''[61]

ڈاکٹر بٹالوی صاحب ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں'' جب یہ حلف نامہ علامہ اقبال کو دکھایا گیا تو علامہ نے میرزائیت کے متعلق نئی شق بڑھائے جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا نہ کوئی اعتراض کیا''[62]

مگر وہ اعتراض کرتے بھی کیوں یہ کچھ تو ان کے اس بیان کی تائید تھی جو انہوں نے 1935ء میں میرزائیوں کی تکفیر پر ایک طویل مضمون کی شکل میں لکھا تھا اور جس کی خوب تشہیر کرائی گئی تھی۔ قائداعظم اس قسم کی بحثوں میں نہیں پڑسکتے تھے وہ سیکولر ذہن کے آدمی تھے اور ان کے مطابق مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ تھا چنانچہ یہ یقینی امر تھا کہ اگر علامہ چندے اور زندہ رہتے تو اقبال جناح اختلافات کھلے تصادم کی شکل اختیار کر لیتے کیونکہ آگے چل کر تو قائداعظم نے مشہور احمدی سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا نفس ناطقہ بنا دیا تھا اور انہیں اتنی اہمیت دے دی تھی کہ علامہ اقبال کی وفات کے ایک سال بعد 1939 میں سنٹرل اسمبلی دہلی کے اجلاس میں ایک پوائنٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے صاف کہہ دیا۔

---

[61] اقبال کے آخری دو سال''ص 325 [62] ایضاً ص 326

''میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے سر ظفر اللہ خان کو ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں وہ مسلمان ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ میں اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں'' (63)

مولانا عبدالحامد بدایونی بریلوی علماء کے سرخیل تھے اور ابتداء سے ہی مسلم لیگ سے وابستہ تھے انہوں نے 1944ء میں احمدیوں کے خلاف ایک قرارداد پیش کرنے کی کوشش کی مگر قائداعظم نے انہیں روک دیا اس پر روزنامہ ''انقلاب'' نے اداریہ لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''مسٹر جناح نے بے انتہا دانش اور تدبر سے کام لیا ہے کہ مولوی عبدالحامد بدایونی کی اس قرارداد کو پیش کرنے کی اجازت نہ دی جس کا منشاء یہ تھا کہ احمدیوں کو مسلم لیگ کا ممبر نہ بنایا جائے۔ ہمیں اس کے متعلق مسٹر جناح کے مسلک کی نسبت کچھ شبہ نہیں انہوں نے کشمیر کی پریس کانفرنس میں صاف صاف فرما دیا تھا کہ فرقوں کی بحث نہ اٹھاؤ ہر مسلمان مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ اس کے بعد جب ناظر صاحب امور خارجہ قادیان نے استفسار کیا تو مسٹر جناح نے ان کو بھی لکھ بھیجا کہ لیگ کے آئین کے مطابق ہر بالغ مسلمان جو دو آنے چندہ دے اور لیگ کے نصب العین کی تائید کرے مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے'' (64)

یاد رہے کہ روزنامہ انقلاب مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کی ادارت میں نکلتا تھا اور یہ دونوں حضرات علامہ اقبال کے حلقہ ارادتمنداں میں سے تھے اس کا مطلب ہے اگر اقبال زندہ رہتے تو انہیں نہ صرف قائداعظم بلکہ اپنے بہت سے ارادتمندوں سے بھی مخالفت مول لینا پڑتی۔ احمدیوں یا قادیانیوں کے متعلق وہ اس انتہاء پر تھے کہ جب انہوں نے انہیں کافر قرار دیا اس وقت اُن کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد بھی بقید حیات تھے۔ یہ وہ بھائی تھے جنہوں نے اقبال کی اعلیٰ تعلیم کے تمام اخراجات برداشت انہیں یوروپ بھجوایا وہاں کے اخراجات برداشت کئے۔ واپسی پر انہیں دفتر وغیرہ سیٹ کر کے دیا غرضیکہ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو حقیقی والد کر کو کرنا چاہئے وہ اور ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد دونوں احمدی تھے۔ یہ اعجاز احمد وہ تھے جنہیں حضرت علامہ نے اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کیا تھا ان ہی شیخ اعجاز احمد نے ''مظلوم اقبال'' نام کی کتاب لکھی ہے۔

(63) ''ہماری قومی جدوجہد'' از عاشق حسین بٹالوی ص 76 (64) روزنامہ انقلاب لاہور 3 اگست 1944ء

یہ بھی ہے کہ علامہ صاحب اپنے برادر بزرگ کے احسانات کا عمر بھر خلوص سے اعتراف کرتے رہے اس کے باوجود وہ احمدیوں کو کافر قرار دینے میں مطلق نہیں جھجکے یعنی وہ اس حد تک آگے جا سکتے تھے پھر وہ اس مسٹر جناح سے کیسے اتفاق کر سکتے تھے جو انہیں مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار کرتا تھا اور جس کو سر ظفر اللہ پر اتنا اعتماد تھا کہ قیام پاکستان کے بعد انہیں وزارت خارجہ جیسا اہم شعبہ سپرد کیا اس لئے اقبال جناح تعلقات محض ہنگامی واقعہ تھا ان میں اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور اختلافات بہت جلد تصادم کی شکل اختیار کر لیتے اگر قدرت نے اقبال کی مہلت حیات مختصر نہ کر دی ہوتی۔